المیہ تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز

بک سٹریٹ 39-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : المیہ تاریخ
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : تاریخ پبلی کیشنز لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2012ء
قیمت : -/450روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

عطیہ، شہلا اور نین تارا کے نام

ترتیب مضامین

حصہ اول

		صفحہ نمبر
	پیش لفظ	7
1	مذہبی تعصب اور رواداری کا تجزیہ	9
2	ہندوستان کی تاریخ میں صوفیاء کا کردار	33
3	صوفی روایات کی تشکیل	37
4	تصوف اور معاشرہ	41
5	صوفیاء کی روحانی سلطنت	47
6	ہندوستان میں اسلام کیسے پھیلا؟	59
7	معاشرہ' عورت اور بہشتی زیور	67
8	علماء اور سائنس	77
9	علماء' معاشرہ اور جہاد تحریک	82
10	علماء اور مسائل	93
11	جہاد تحریک	107
12	معاشرہ' ذات پات اور مرزا نامہ	122
13	چند تاریخی غلط فہمیاں	129
14	ہندوستانی معاشرہ اور انگریزی اقتدار	137
15	سرسید اور اقبال	145
16	سرسید اور مفاہمت کی پالیسی	149
17	فکر اقبال کی بنیادیں	165

حصہ دوم

1	اخلاقی و ثقافتی اقدار	175
2	نسل' خاندان و ذات پات	181

صفحہ نمبر

3	فیاضی و سخاوت	189
4	نمک حلالی	193
5	مجلسی آداب	196
6	فن تعمیر	199
7	الناس علی دین ملوکہم	202
8	ہندوستان میں فارسی	206
9	غیر ملکی اقتدار	209
10	کیا نظریئے کا احیاء ممکن ہے	212
11	تاریخ نویسی	216
12	تاریخ کیسے پڑھانا چاہئے	232
13	اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ	235
14	مسلمان حکمراں خاندان اور ان کا زوال	237
15	پاکستان میں تاریخ کا المیہ	241
16	پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل	247
17	پاکستان میں تاریخ کی تعلیم	251
18	تاریخ اور سچائی	256
19	المیہ تعلیم	260
20	تاریخ اور مطالعہ پاکستان	267
21	مسلم شناخت	271
22	بنیاد پرستی	283
23	جاگیردارانہ جمہوریت	308

پیش لفظ

اس کتاب میں میرے وہ مضامین شامل ہیں جو میں نے "تاریخ اور آگہی" اور "تاریخ اور روشنی" میں شائل کئے تھے۔ "ان کی ترتیب بدل دی ہے۔ اور نئے مضامین اس میں شامل کردیئے ہیں۔ اب یہ نئی کتاب برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے کردار اور اس دور میں جو اخلاقی و سماجی اقدار بنی تھیں ان پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے کہ جو پاکستان میں تاریخ کے تعلیم کے سلسلے میں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ قاری نہ صرف تاریخ کے بنیادی مفہوم سے آگاہ ہو۔ بلکہ وہ مسلمان خاندانوں کی حکومت کے کردار کو بھی سمجھے اور ان سے جو نتائج نکلے ہیں ان سے بھی آگہی ہو۔

تصوف کے موضوع پر اس نئے ایڈیشن میں دو نئے مضامین اور شامل کردیئے ہیں۔ جو اس موضوع کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

ان مضامین میں کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کو ایک نئے نقطہ نظر سے بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کو تاریخی واقعات و حقائق کا نئے انداز میں تجزیہ کرنے کا موقع مل سکے۔ میں اپنے طالب علموں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے ان مضامین کو پڑھ کر اپنی رائے دی۔

ڈاکٹر مبارک علی
لاہور ۱۹۹۴ء

مذہبی تعصب و رواداری کا تاریخی تجزیہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں بحیثیت تاجر' سندھ اور شمالی ہندوستان میں بحیثیت فاتح اور حکمران۔ جب مسلمان جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں تاجر کی حیثیت سے آئے تو ان کا رویہ پر امن تھا وہ اس بات کے خواہش مند تھے کہ پر امن سرگرمیوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تجارتی فوائد حاصل کریں۔ ہندوستان کے ہندو حکمرانوں نے ان نووارد مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ رواداری اور حسن سلوک کا رویہ اختیار کیا بلکہ انہیں ہر قسم کی سہولتیں دیں۔

سندھ میں عرب محمد بن قاسم کی سرکردگی میں آئے۔ سندھ کی فتح کے بعد جب یہ سوال آیا کہ یہاں غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو حجاج بن یوسف نے علماء و فقہاء سے مشورے کے بعد عملی سیاست کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کیا جائے یہ وہ اہم فیصلہ تھا جس پر آگے چل کر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی مذہبی پالیسی کی بنیاد رکھی۔

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد خونریز جنگوں کا نتیجہ تھی انہوں نے تلوار کے زور سے یہاں کے حکمرانوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کیا تھا یہ ابتدائی مسلمان فاتحین ترک نسل سے تھے اور ان کی تربیت جنگ و جدل میں ہوئی تھی یہ جس علاقے سے آئے تھے وہاں قبائلی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ فن سپہ گری میں مہارت ان کی زندگی کی بقاء کے لیے ضروری تھی انہیں ہم دم پابہ رکاب اور جنگ کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے جنگ ان کے لیے ایک مشغلہ اور پیشہ تھا۔ انہیں اپنی بہادری اور تہوری پر ناز تھا۔ سپاہ گری کے علاوہ انہیں دوسرے پیشوں سے کم ہی لگاؤ تھا۔ ہندوستان میں انہیں راجپوت بہادری اور شجاعت میں ہم پلہ نظر آئے لیکن دوسری قومیں اور ذاتیں جو صلح پسندی اور امن پسندی کی قائل تھی انہیں بزدل اور حقیر نظر آئیں۔

یہ ترک فاتحین وسط ایشیاء ایران اور افغانستان میں باہم برسرپیکار رہتے تھے۔ حکمران

خاندانوں کی تبدیلی ' جانشینی کے مسائل اور حکمرانوں کے توسیع پسند عزائم ہمیشہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ ان جنگوں میں مذہب کو کم استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہندوستان پر حملے شروع ہوئے تو ان توسیع پسند عزائم کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی' ہندوؤں اور کافروں سے یہ جنگیں جہاد کہلائیں ان میں مرنے والے شہید اور فاتح غازی کہلائے۔ محمود غزنوی جب وسط ایشیا میں جنگیں لڑتا تو ان کی حیثیت سیاسی ہوتی۔ جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تو اس کی جنگیں مذہبی ہوجاتی تھیں۔ بابر پانی پت میں ابراہیم لودھی سے لڑتا ہوا خاموش رہتا ہے۔ لیکن جب کنواہ کے میدان میں رانا سانگا سے مقابلہ ہوتا ہے تو سپاہیوں میں مذہبی جذبات ابھارنے کے لیے نہ صرف شراب کے پیالے توڑ دیتا ہے بلکہ ایک پرزور تقریر میں سپاہیوں کو جوش دلاتے ہوئے مرنے والوں کو شہید اور زندہ بچنے والوں کو غازی ہونے کی خوش خبری دیتا ہے۔ اور اس فتح کے بعد "غازی" کا خطاب اپنے نام کے ساتھ شامل کرلیتا ہے۔

ترکوں اور مغلوں کی حکومت کا دارومدار فوج پر تھا اور فوج کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور یہ وہ مسلمان تھے جو وسط ایشیاء ایران اور افغانستان سے مسلسل آتے رہتے تھے۔ ہندوستان ان غیر ملکی فوجیوں کے لیے ایک خوشحال زندگی کی ضمانت دیتا تھا ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ان کی ہمیشہ ہمت افزائی کی۔ کیونکہ یہ نہ صرف بہترین سپاہی تھے بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی ایک تھے۔ یہ حکومت کے تمام عہدوں پر فائز تھے اور رعیت سے جو بھی ٹیکس وصول ہوتا تھا اس میں برابر کے شریک تھے۔ ان میں یہ احساس بڑا شدید تھا کہ وہ اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے آئے ہیں' وہ بہادر اور شجاع ہیں اور مذہبی و نسلی اعتبار سے افضل و برتر ہیں۔ ہندو ایک مفتوح قوم ہے لہذا اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی اطاعت و فرماں برداری کرے۔ اس لیے ابتدائی دور میں مسلمان حکمران طبقے کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ بڑا معاندانہ اور وہ ان پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ سیاسی مصلحتوں نے ان کے رویئے کو تبدیل کیا' کیونکہ ان کی اکثریت فوجی تھی اور ملک کے انتظام کو چلانے کے لیے فوج ہی نہیں منتظم بھی چاہئیں تھے۔ دفتروں کے لیے کلرک' ٹیکس جمع کرنے کے لیے عامل اور سکہ ڈھالنے کے لیے سنار وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے انتظامی ڈھانچے میں ہندوؤں کو شریک کیا گیا لیکن وہ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہوسکتے۔

ہندوؤں کے ساتھ پالیسی مرتب کرتے ہوئے دو نقطہ ہائے نظر سے سوچا گیا ایک سیاسی

اور دوسرا مذہبی۔ حکمران طبقے نے بہت جلد اس بات کو محسوس کرلیا کہ وہ اس ملک میں اقلیت میں ہیں اور ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اکثریت کو قوت و طاقت سے دبائے رکھیں اس لیے حکومت کو چلانے اور ٹیکس کی وصولیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ اس لیے اس موقع پر حکومت اور شریعت کا تضاد پوری طرح ابھر کر سامنے آیا اور اس حقیقت کو خاموشی سے تسلیم کرلیا گیا کہ آئین جہانداری و جہاں بانی اور شریعت کے راستے جدا جدا ہیں اس لیے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے سیاست کو مذہب سے جدا رکھا اور عملی قوانین کے تحت حکومت کی۔

یہ حکمران طبقہ جو عملی طور پر حکومت چلا رہا تھا اس نے حکومت کی بنیاد طاقتور فوج پر رکھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ نئے علاقوں کو فتح کرے۔ بغاوتوں کو کچلے اور رعیت سے ٹیکس وصول کرے یہ طبقہ عملی طور پر مذہبی نہیں تھا۔ فتوحات کے بعد مال غنیمت اور دولت نے ان میں زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ پیدا کردیا تھا اس لیے وہ مذہب کو کبھی کبھی اپنے آسائشوں کے لیے ایک رکاوٹ سمجھتے تھے' لیکن عام مسلمانوں کے مذہبی جذبے کی تسکین کی خاطر یہ ظاہری طور پر شرعی قوانین و احکام کی پیروی ضرور کرتے تھے۔

حکمران طبقے کے نقطہ نظر سے بالکل مخالف نظریہ علماء و فقہاء کا تھا ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت شریعت کے اصولوں پر قائم ہو اور تمام غیر شرعی قوانین ختم کردیئے جائیں اس ضمن میں ہندوؤں کے ساتھ ان کا رویہ شدید تعصب پر مبنی تھا یہ انہیں کافر و مشرک سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ کسی قسم کا میل جول اور رابطہ پسند نہیں کرتے تھے ان کی خواہش تھی کہ وہ حکومت کے اقتدار میں شریک ہوں اور طاقت کے ذریعے مسلم عوام میں صحیح اسلامی روح اور جذبہ پیدا کریں۔ ان سے بھی مختلف نظریہ صوفیاء کا تھا جو مذہب کی ظاہری روایات سے بالاتر ہوکر انسانیت کی بنیاد پر سوچتے تھے۔ ہندوستان میں بھگتی تحریک انہیں نظریات کی عملی شکل تھی جس نے ہندوستان کے عوام کو محبت و الفت میں باندھنے کی کوشش کی۔

عوامی سطح پر ہندو اور مسلمان ثقافتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے باہر سے آنے والے شعوری اور غیر شعوری طور پر مجبور ہوئے کہ یہاں کی رسومات اور طور طریق اختیار کریں' اس ثقافتی ہم آہنگی کو ترقی دینے والے وہ ہندو بھی تھے جو مسلمان ہوئے تھے۔ اسلام نے ان کے عقائد تو بدل دیئے لیکن ان کے ثقافتی اور سماجی ڈھانچے کو تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہمارے علماء اکثر ان مشرکانہ رسومات کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی

کوششوں کے باوجود یہ رسومات جو ہندوستان کے عوام میں سرایت کر چکی تھیں ختم نہیں ہو سکیں۔ اس ثقافتی ہم آہنگی نے بہرحال مذہبی تفریق کو بہت کم کردیا تھا۔

مغلوں کی آمد پر ہم ہندوستان کے ہندو اور مسلمان عوام میں حکمران طبقے میں رواداری کی فضا دیکھتے ہیں۔ اس لیے مغل حملہ آوروں کو ہندو اور مسلمان دونوں نے غیر ملکی حملہ آور تصور کیا۔ پانی پت اور کنواہبہ کی جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر شریک تھے اس لیے مغلوں کی فتح نے اس بار ہندو اور مسلمان دونوں کو مفتوح قومیں بنا دیا اور مغلوں نے اپنی سلطنت کے استحکام کے فوراً بعد اقتدار کلیتاً اپنے پاس رکھا اور انہوں نے نہ تو ہندوؤں پر اعتماد کیا اور نہ ہی ہندوستانی مسلمانوں پر۔

بدقسمتی سے بابر نے ہندوستان کو بڑی سطحی نظر سے دیکھا اور اسے ایک غیر متمدن و غیر مہذب ملک سمجھا۔ اسے ہندوستان میں نہ تو وسط ایشیاء کی مانند باغات نظر آئے نہ ہی نہریں اور پھل پھول۔ مرنے کے بعد اس کی خواہش کے مطابق اسے کابل میں دفنایا گیا۔ بابر کے جانشینوں میں اکبر پہلا ہندوستانی تھا جس کا نقطہ نظر ملکی و قومی تھا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال تک دو رجحان باہم متصادم رہے ایک رجحان یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان باہم اعتماد اور اشتراک سے رہیں دوسرا رجحان یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھا جائے اور اس لیے ہندوؤں سے کسی قسم کا اشتراک نہ کیا جائے۔

مذہبی بنیاد پر دونوں قوموں میں بعد برقرار رکھنے کی ہر دور میں کوشش کی گئی جس کا نتیجہ پیچیدہ صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمان جو ہندوستان میں اقلیت تھے خود کو فوجی طاقت اور حکومت کے باوجود غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ خود اعتمادی کی کمی نے ان میں ہندو اکثریت کا خوف غیر شعوری طور پر پیدا کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے خود کو ذہنی طور پر مکمل ہندوستانی نہیں سمجھا اور خود کو وسط ایشیاء کی تہذیب و ثقافت سے منسلک رکھا۔ فارسی زبان پورے اسلامی دور میں حکمران طبقے کی زبان رہی۔ ہماری شاعری اور ادب غیر ملکی اثرات کا حامل رہا۔ ہم اپنی تخلیقات کی داد و تحسین ایران سے حاصل کرنے کے خواہش مند رہے۔ مذہبی حیثیت سے بھی ہم خود کو اسلامی دنیا سے منسلک کئے رہے اور اپنی اقلیتی اساس یا اپنے اقلیتی احساس کو عالم اسلام کی اکثریت میں ضم کرکے خود کو ہندوستان میں محفوظ سمجھتے رہے۔ ہر مصیبت کے وقت ہماری نگاہیں وسط ایشیاء ایران و افغانستان کی طرف اٹھتی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے خود کو کبھی مکمل ہندوستانی نہیں بنایا ہم نے اپنی جڑیں ہندوستان سے

باہر رکھیں اپنے پڑوسی پر اعتماد نہیں کیا اور دور کے لوگوں پر بھروسہ کیا جو قریب تھے ان سے نفرت کی اور جو دور تھے ان سے تعلقات استوار کرنے کی ناکام کوشش کی :۔ (۱)

عربوں نے سندھ فتح کرنے کے بعد یہاں غیر مسلموں کے ساتھ وہی پالیسی اختیار کی جو اسلام میں اہل کتاب کے لیے ہے یعنی ان سے جزیہ لیا جائے اور انہیں مکمل مذہبی آزادی دی جائے۔ اہل عرب یہی پالیسی ایران فتح کرنے کے بعد اختیار کر چکے تھے اور علماء و فقہاء نے اس مسئلے پر کوئی زیادہ اختلاف نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ حقیقت یہ تھی کہ نہ تو ایران کے تمام مجوسیوں اور نہ سندھ کے تمام ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاسکتا تھا اور نہ انکار کی صورت میں کل آبادی کو قتل کیا جاسکتا تھا اور نہ قتل عام کی صورت میں خالی مقبوضات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس لیے سیاست کے عملی تقاضوں اور اقتصادی ضروریات کے تحت حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو ایک خط کے ذریعے سندھ میں غیر مسلموں کے ساتھ حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی :

> چونکہ یہ لوگ پورے طور پر مطیع اور فرماں بردار ہو چکے ہیں اور انہوں نے پایہ تخت کا جزیہ وغیرہ لینا اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے اور چونکہ جزیہ اور مالیہ کے علاوہ ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوسکتی اس لیے انہیں اس امر کی اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مورتیوں کی پوجا کریں۔ علاوہ ازیں کسی کو بھی اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے سے روکا نہ جائے تاکہ یہ لوگ اپنے گھروں میں امن کی زندگی بسر کریں۔ (۱)

شمالی ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ سوالات پیدا ہوئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو؟ اور یہ کہ حکومت اپنی ہندو رعیت کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ ان سوالات کا جواب دو مختلف طبقوں نے دیا ایک علماء کے طبقے نے اور دوسرے حکمران طبقے نے۔ دونوں طبقوں کا انداز فکر مختلف تھا علماء ان مسائل کا حل خالص شریعت کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ جبکہ حکمران عملی سیاست کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سوالوں کا حل ڈھونڈنا چاہتے تھے۔

التمش کے زمانے میں یہ مسئلہ اس وقت شدت سے ابھرا جبکہ وسط ایشیاء سے منگولوں کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں وہاں سے علماء و فقہاء کی کثیر تعداد ہندوستان میں پناہ گزیں ہو کر آئی۔ انہوں نے اپنی آمد کے بعد حکومت پر زور دیا کہ وہ اس پالیسی کو تبدیل کرے جس کی ابتداء سندھ میں محمد بن قاسم نے کی تھی۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہندوؤں کے

پاس چونکہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے اس لیے یہ ذمیوں کے زمرے میں نہیں آتے ضیاء الدین برنی جو اس عہد کا مورخ ہے نے اپنی کتاب "صحیفہ نعت محمدی ﷺ" میں اس بحث کی پوری تفصیل دی ہے۔

چنانچہ بڑے بڑے علماء نے آپس میں اس مسئلہ پر بہت زیادہ بحث کی کہ آیا ہندوؤں کے ساتھ ام القتل و ام الاسلام ("یا" کے معنوں میں عربی میں ام مستعمل ہے یا لفظ "او") (یا قتل' اسلام) کا طریقہ اختیار کیا جائے یا اس بات پر راضی ہوا جائے کہ وہ خراج اسی طرح دیتے رہیں اور پہلے کی طرح امیرانہ اور ٹھاٹھ کی زندگی گزارتے بت پرستی کرتے اور کفرو شرک کے تمام احکام کو بغیر کسی خوف و ہراس کے باقاعدگی کے ساتھ بجالاتے رہیں۔ اور ان کی عزت و حرمت کو برقرار رہنے دیا جائے؟ ان علماء نے بڑی بحث کی اور ایک دوسرے سے کہا "سرکار دو عالم ﷺ کے سب سے بڑے دشمن ہندو ہیں۔اس لیے ان کے بارے میں سرور کونین صلعم کا کا کیا حکم ہے؟ آیا انہیں قتل کیا جائے' غلام بنایا جائے اور ذلیل و خوار و رسوا کرکے ان سے مال چھینا جائے؟...... ہندو خواہ مطیع ہو یا باغی ہر حالت میں سردار دوجہاں صلعم کے بڑے دشمن ہیں صلاح یہ ٹھہری کہ پہلے بادشاہ سے ان دشمنوں کے بارے میں بحث کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنے وقت کے چند معتبر ترین علماء سلطان شمس الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اس کے سامنے انہوں نے اس مسئلہ مذکور بڑی شرط و بسط کے ساتھ بیان کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل و اما الاسلام" کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیونکہ دین کی مصلحت اسی میں ہے کہ ان لوگوں سے نہ تو خراج لیا جائے اور نہ جزیئے پر راضی ہوا جائے بادشاہ نے ان کی بات آرام سے سنی اور وزیر سے کہا کہ وہ علماء کو جواب دے اور جو کچھ بھی عقل کے مطابق بات بنتی ہو انہیں بتائے۔ نظام الملک جنیدی نے علماء کی تجویز کو بخوبی سمجھ کر بادشاہ سے کہا کہ "اس میں شک نہیں کہ ہندو کے ساتھ لما لقتل ولمالاسلام' والا طریقہ استعمال کرنا چاہئے کیونکہ یہ لوگ آنحضرت صلعم کے سب سے بڑے دشمن ہیں نہ تو ان کا کوئی ذمہ ہے نہ کوئی عہد اور نہ آسمان سے اتری ہوئی کتاب اور نہ کوئی پیغمبری ہندوستان

میں مبعوث ہوا ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ ہندوستان پر ہمارا تازہ قبضہ ہوا ہے اور پھر ہندوؤں کی تعداد بھی اتنی ہے کہ ان کے مقابلے میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ یہ بات مناسب نہیں۔ اس لیے اگر ہم نے ان کے بارے میں مذکورہ رویہ اختیار کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ متحد ہو کر سرکشی پر اتر آئیں اور ہم تھوڑی طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور یہ بات ہر طرف فتنہ و فساد پھیلنے کا سبب بنے۔ ہاں چند برس بیت جائیں دارالخلافے اور تمام خطوں میں مسلمان آباد ہو جائیں اور بہت زیادہ لشکر بھی مہیا ہو جائے تو پھر البتہ ہم ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل و اماالاسلام" والا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ علماء نے جب وزیر کا یہ مصلحت آمیز جواب سنا تو بادشاہ سے کہا کہ "اگر آپ ہندوؤں کے قتل کا حکم صادر نہیں کرتے تو آپ کسی بھی صورت میں انہیں اپنے دربار میں عزت نہ بخشیں اور نہ انہیں اس امر کی اجازت ہی دیں کہ وہ مسلمان محلوں میں سکونت پذیر ہوں اور اس بات کو ہرگز روا نہ رکھیں کہ دارالخلافہ اور مسلمانوں کے علاقوں اور قصبوں میں کفر و بت پرستی کے احکام جاری ہوں۔" بادشاہ اور وزیر نے اس وقت علماء کی تین باتیں مان لیں۔ چونکہ اس نے شروع شروع میں قتل ہنود کا حکم نہ دیا تھا۔ اس لیے نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور دین داروں میں کفر و شرک اور بت پرستی جڑ پکڑ گئی۔(۲)

علماء اور فقہاء کے اس رجحان کو ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب "فتاوائے جہانداری" میں مزید واضح کیا ہے۔

اگر بادشاہان اسلام اتنی قوت و طاقت اور شوکت ہوتے ہوئے جو دنیا میں مسلمانوں کو حاصل ہے اس بات کو روا رکھیں کہ ان کے دارالسلطنت میں اور مسلمانوں کے شہر میں کفر کی رسمیں پھیلیں اور کھلم کھلا بت پرستی کی جائے...... اور چند ٹکے جزیہ دے کر کفر کی تمام رسومات رائج رکھیں اور دین باطل کی کتابوں کا سبق دیں اور ان کے احکام کو پھیلائیں تو پھر دین حق دوسرے مذہبوں پر غالب کس طرح آئے گا۔ (۳)

التمش کے زمانے میں سید نورالدین مبارک غزنوی ایک بزرگ تھے انہوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت پر کڑی تنقید کی اور مسلمان بادشاہوں کے فرائض بیان کرتے

ہوئے کہا کہ:

اگر کفر و شرک کی مضبوطی اور کفار و مشرکین کی کثرت کی وجہ سے ان کا کلیتہ استیصال نہ کر سکیں تو کم از کم (اتنا ضرور کریں کہ) اسلام اور حفاظت دین کی خاطر ہندوؤں ' مشرکوں اور بت پرستوں کی جو خدا اور رسول کے شدید ترین دشمن ہیں۔ توہین و تذلیل اور فضیحت و رسوائی میں کوشش کریں۔ بادشاہوں کی حمایت دین کی ایک علامت یہ ہے کہ جب ان کی نظر ہندو پر پڑے تو ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوجائے اور ان کی خواہش یہ ہو کہ ان لوگوں کو زندہ رکھا جائے اور برہمنوں کو جو کفر کے امام ہیں اور جن کی وجہ سے کفر و شرک کی اشاعت ہوتی ہے اور کفر کے احکام نافذ ہوتے ہیں ختم کردیں اسلام سے سچے دین کی خاطر ایک کافر اور مشرک کے لیے یہ بھی روا نہ رکھیں کہ وہ عزت کی زندگی بسر کرے........ یا کوئی مشرک اور بت پرست کسی فرقے (قوم) یا گروہ یا کسی ولایت و اقطاع پر حکومت کرے یا خدا اور رسول کے دشمنوں میں سے ایک بھی مسلمان بادشاہوں کے قہر وجلال کے اثر سے عیش و آرام میں رہے۔ یا بے فکری کے بستر پر پاؤں پھیلا کر سو سکے۔ (۴)

نور الدین مبارک غزنوی نے اس کے علاوہ بادشاہ کو یہ بھی نصیحت کی کہ وہ ملک سے فلسفیوں کا اخراج کردے بد دین و بد عقیدہ اشخاص کو حکومت میں داخل نہ ہونے دے اور ملک کے عہدے صرف دیندار اور خدا ترس لوگوں کو دے۔ (۵)

یہ رجحان نہ صرف مذہبی تعصب کی غمازی کرتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں سیاسی و اقتصادی مفادات بھی نظر آتے ہیں یعنی اقتدار میں ایک جماعت کے علاوہ کسی اور کو قطعی شریک نہ کیا جائے دنیاوی لوازمات و آسائشوں کو صرف ایک طبقے کے لیے مخصوص کیا جائے اور دوسروں کو اس سے قطعی محروم رکھا جائے خصوصیت سے علماء و فقہاء کے طبقے کی خواہش تھی کہ انہیں نہ صرف یہ کہ حکومت میں شامل کیا جائے بلکہ عملاً" حکومت چلانے کی ذمہ داری بھی انہیں دی جائے۔

اقتدار کی اس کشمکش میں بادشاہ اور امراء نے خاموشی سے علماء کے اثر کو مصلحت آمیز پالیسی کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کی مثلاً" دربار اور دوسرے موقعوں پر ان کے ساتھ احترام سے پیش آنا ان کے وظائف مقرر کرنا مذہبی معاملات میں ان کی رائے پر عمل کرنا ان

کے ساتھ کھانا کھانا درباری رسومات سے انہیں بری کرنا وغیرہ وغیرہ لیکن عملاً" انہیں سیاست و اقتدار میں شریک نہیں کیا گیا۔

علاؤالدین خلجی نے پہلی مرتبہ اس کا برملا اعلان کیا کہ حکومت کے انتظام و انصرام میں وہ صرف ایک چیز کو مد نظر رکھتا ہے کہ رعیت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا ضروری ہے۔ اس نے قاضی مغیث کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ " میں یہ نہیں جانتا کہ میرے احکامات شرعی ہوتے ہیں یا غیر شرعی۔ جس چیز میں اصلاح ملک دیکھتا ہوں اور جو کچھ بھی مصلحت وقت کے مطابق نظر آتا ہے اس کا میں حکم دے دیتا ہوں۔ "(٦)

(٣)

ان دو رجحانات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا رجحان بھی ہندوستانی معاشرے میں پیدا ہو رہا تھا کہ ہندو اور مسلمان اشتراک اور میل جول کے ساتھ رہیں۔ اس کی ابتداء عوامی سطح پر شروع ہوئی کیونکہ عوام کے کوئی سیاسی مفادات نہیں تھے جو اس اشتراک میں آڑے آتے لہذا علماء اور حکمران طبقے کے برعکس عوام کے سوچنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ ان کے مفادات بھی ان سے علیحدہ تھے کیونکہ معاشرے کا ایک عام آدمی اپنی روز مرہ کی زندگی میں ایک دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ اس میں مذہبی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت کم ہوتی ہے۔ اس لیے جب ہندوستان میں ایک عام آدمی کا واسطہ کاروباری اور دوسرے سلسلوں میں ہندوؤں سے پڑا تو اس نے مذہب اور سیاست کے مفادات سے بلند ہو کر ان سے اشتراک کیا۔ یہ اشتراک اس وقت اور بھی بڑھا جب ملک میں سیاسی انقلابات آئے' حکمران خاندان بدلے' صوبائی گورنروں نے بغاوتیں کیں' خانہ جنگیوں نے سیاسی انتشار پیدا کیا۔ قحط پڑے' حکومت نے ٹیکس کی وصولیابی کے لیے سختیاں کیں تو ان ہی اثرات سے ہندو اور مسلمان عوام یکساں طور پر متاثر ہوئے' اس سیاسی انتشار اور معاشی نا آسودگی نے عوام کی توہمات میں برابر کا شریک کیا۔ پیر پرستی' نذر و نیاز' قبروں اور مزاروں پر جانا اور چڑھاوے چڑھانا ان باتوں نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں رواج پایا۔ یہ بات ایک طرف تو معاشرے کی معاشی نا آسودگی کو ظاہر کرتی ہے کہ جس کے نتیجے میں عوام کے سادہ ذہن اپنی مشکلات کا حل ان ذرائع سے ڈھونڈتے ہیں تو دوسری طرف اس سے دونوں قوموں کی ذہنی سطح پر ہم آہنگی ظاہر ہوتی ہے۔

اشتراک کی اس تحریک کو بڑھانے میں صوفیاء نے بڑا حصہ لیا انہوں نے خود کو حکومت سے وابستہ نہیں کیا اپنی روحانی سلطنت قائم کر کے اپنا رابطہ رشتہ عوام سے قائم کیا' صوفیاء

اور علماء کے طریقہ کار میں بڑا فرق تھا' علماء حکومت کی مدد سے شریعت کا نفاذ چاہتے تھے تو صوفیاء حکومت سے علیحدہ رہ کر لوگوں میں اپنے اثرو رسوخ کو بڑھاتے تھے۔

لہٰذا خلجی دور میں ' یہ تینوں رجحانات ہندوستان میں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں۔ حکومت اگرچہ علماء کے اثرو اقتدار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی' لیکن اس کے باوجود ان کے اثرو اقتدار کو جو انہیں مسلمان معاشرے میں حاصل تھا' وہ اسے مکمل طور پر ختم نہیں کر سکی۔ محمد تغلق نے اگرچہ کوشش کی کہ علماء و صوفیاء کے اثر کو ختم کر کے بادشاہ کی سیاسی برتری کو قائم کرے لیکن اس کا نتیجہ سیاسی انتشار اور بغاوتوں کی شکل میں نکلا۔ جس میں علماء کا ہاتھ تھا۔ اسی وجہ سے انہیں وقتی طور پر سیاسی اقتدار بھی مل گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام ہندوؤں کے ساتھ ساتھ' برہمنوں پر بھی جزیہ لگا دیا گیا۔ اور معاشرے میں ایسی تمام تحریکوں کو تشدد کے ساتھ ختم کر دیا گیا جو شریعت کے خلاف تھیں اسی وجہ سے اس دور میں مذہبی تعصب کے ایسے واقعات پیش آئے جنہیں کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور ان کے بھائی راجو قتال اسلام کی تبلیغ میں تشدد کے قائل تھے۔ مخدوم صاحب کے مرض الموت میں ایک ہندو تحصیل دار نواہون ان کی عیادت کو آیا اور کہنے لگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے رسول عربی ﷺ کو خاتم الانبیاء بنایا تھا مخدوم صاحب کو خاتم الاولیاء بنایا ہے۔ اس پر مخدوم صاحب نے اپنے بھائی کو مخاطب ہو کر کہا کہ یہ نبی کو آخری رسول ماننے سے مسلمان ہوگیا ہے۔ اب اگر اسلام سے انکار کیا تو مرتد ہوجائے گا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ تحصیل دار نے وہاں سے بھاگ کر دہلی میں فیروز تغلق کے پاس پناہ لی' مخدوم کے بھائی راجو قتال اپنے بھائی کی وفات کے بعد فیروز تغلق کے پاس دہلی آئے اور نواہون سے مطالبہ کیا کہ یا تو مسلمان ہونے کا اقرار کرے ورنہ قتل کردیا جائے گا۔ اس کے انکار پر انہوں نے فیروز شاہ کو مجبور کیا کہ اسے قتل کردیا جائے۔ چنانچہ نواہون اس مذہبی تعصب کے نتیجے میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ (۷)

اسی قسم کا ایک واقعہ سکندر لودھی کے زمانے میں پیش آیا جبکہ ایک برہمن نے جس کا نام لودھن تھا یہ اعلان کیا کہ ہندومت اور اسلام دونوں سچے مذاہب ہیں۔ اس پر علماء نے فتوٰی دیا کہ چونکہ لودھن نے اسلام کی سچائی قبول کرلی ہے لہٰذا وہ مسلمان ہوگیا ہے اب اگر اس نے دوسرے مذاہب کی سچائی مانی تو وہ مرتد ہوجائے گا اور شریعت میں اس کی سزا موت ہے لہٰذا اسی جرم میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ (۸)

ان واقعات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اشتراک کے جذبات بہت آگے

بڑھ چکے تھے۔ اور معاشرے میں ایک طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ دونوں مذاہب میں برابر کی سچائی موجود ہے یہ لوگ اس بنیاد پر دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا ردعمل بھی اسی قدر شدید تھا۔ علماء ایک طرف تو دونوں مذاہب اور قوموں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے تو دوسری جانب تشدد کے ذریعے تبدیلی مذہب کی پالیسی پر عمل پیرا تھے ان کی کوششوں میں حکومت بھی اکثر ان کے اثر و رسوخ سے مجبور ہوکر ان کا ساتھ دیتی تھی۔

ان پابندیوں کے باوجود اشتراک کا رجحان بڑھتا ہی گیا۔ اسلام اور ہندومت کے مشترک پہلوؤں کو سامنے لایا گیا۔ دونوں مذاہب کی سچائی اور حقانیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے میں وحدت الوجود کے ماننے والے صوفیاء کا بڑا ہاتھ تھا۔ صوفیاء کی خانقاہیں اکثر شہر کے باہر ہوا کرتی تھیں۔ جہاں ان کے معتقدین جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہوا کرتے تھے قیام کرتے، محفلوں میں شریک ہوتے اور مذہبی مسائل پر بحث کرتے اس نتیجے پر پہنچے کہ:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کہا کرتے تھے کہ یہ کیسا شور و غوغا پھیلا ہوا ہے۔ کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی مطیع ہے کوئی گنگاہگار .... کوئی مسلمان اور کوئی پارسا، کوئی محمد اور کوئی ترسا، یہ سب ایک ہی لڑی کے پروئے ہوئے ہیں۔ (۹)

اس اشتراک کا نتیجہ پندرھویں صدی میں پیدا ہونے والی بھگتی تحریک تھی۔ جس میں راماننَد بیراگی، کبیرداس، گورونانک، سوامی اور چتینیا تھے۔ جنہوں نے ہندو اور مسلم اشتراک کی کوشش کی اس تحریک کا تعلق عوام سے تھا۔ حکومت و سیاست علیحدہ، عوامی سطح پر یہ ذہنی اور ثقافتی طور پر دونوں قوموں کو ایک جگہ جمع کر رہے تھے ملک کی سیاسی صورت حال میں ان اشتراک کی تحریکوں کو کام کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ تیمور کی آمد نے تغلق خاندان کی حکومت کا خاتمہ کردیا اس کے بعد ملک خانہ جنگیوں میں ایسا مبتلا ہوا کہ کوئی مضبوط اور طاقت ور خاندان اس سیاسی انتشار میں نہیں ابھر سکا اس وجہ سے حکومت کمزور ہوئی حکومت کے ادارے کمزور ہوئے اور اس کے ساتھ ہی علماء کا اقتدار بھی کم ہوا لہٰذا سیاسی کمزور اور ابتری کے دور میں اشتراک کی تحریکوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا اور یہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری

رہیں۔

(۳)

جب بابر نے ہندوستان فتح کیا تو اس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اگر ہندوستان میں حکومت کرنی ہے تو مذہبی رواداری کی پالیسی پر عمل کرنا ہوگا لہذا اس نے ہمایوں کو جو وصیت کی اس سے اس کی دور رسی کا اندازہ ہوتا ہے:

فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرو۔

(۲) گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرنا تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکر کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔

(۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے۔ تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔

(۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی۔

(۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔

(۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔ (۱۰)

ہمایوں کی جلاوطنی اور سوری خاندان کے قیام نے علماء کو سیاسی اقتدار میں شریک کرلیا تھا ان میں مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی شریعت کے علمبرداروں میں سے تھے' یہ ہر نئے خیال اور جدید تحریک کے مخالف تھے ہندوستان میں مہدوی تحریک کو ختم کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ شیخ علائی خضر خاں شروانی اور میرجش کو مذہبی اختلافات کی بناء پر یہ قتل کراچکے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک کے قتل کے یہ درپے تھے۔ یہ ان تمام صوفی سلسلوں کے خلاف تھے جو آزادانہ خیالات کا پرچار کرتے تھے۔ خصوصیت سے شطاریہ سلسلہ کے

جس کے پیروکار ہندوؤں سے میل جول رکھتے تھے اور ان کے افکار کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے اکبر جب تخت نشین ہوا تو یہ دو رجحانات آپس میں متصادم تھے۔

اکبر اگرچہ ابتدائی دور میں سخت مذہبی تھا لیکن اس وقت بھی وہ صلح کل اور رواداری کا حامی تھا اور اس کی مذہبیت اس کی وسیع القلبی میں رکاوٹ نہیں تھی اس کی راجپوت شہزادی سے شادی ۱۵۶۲ء کی بات ہے جب وہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر زیارت کی غرض سے جارہا تھا یہ مذہبی رواداری اس میں ابتداء ہی سے تھی اور یہ آخر وقت تک قائم رہی۔ تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد ہی اسے علماء کی تشدد پسندی' دنیا داری اور ظاہرداری سے نفرت ہوگئی اور اس نے یہ کوشش کی کہ علماء کے اقتدار اور اثر کو ختم کرکے اپنی طاقت کو مستحکم کرے۔ اکبر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اشتراک کی تحریک اور رجحان کو سیاسی تحفظ دیا اور سیاسی اقتدار کے ذریعے انہیں مضبوط کیا۔

اکبر نے ہندوؤں میں اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے اور مذہبی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے جزیے کو ختم کیا ہندوؤں سے یاترا ٹیکس اٹھایا اور حکومت کے اقتدار میں غیر مسلموں کو برابر کی شرکت دے کر مغلیہ سلطنت کے ڈھانچے کو بدل دیا اقتدار اب صرف ایک ہی طبقے میں محدود نہیں تھا بلکہ اس میں اہل ہندوستان مذہبی بنیادوں سے بالاتر شریک تھے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے عوام میں یہ احساس ہوا کہ مغلیہ سلطنت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ سلطنت ہے۔ اس ہم آہنگی کے نتیجے میں دربار میں جو فضا پیدا ہوئی اس میں ہندو اور مسلم ثقافت اور رسم و رواج میں یک جہتی پیدا ہوئی دیوالی ہولی اور بسنت کے تہوار مسلم تہواروں کے ساتھ ساتھ اہتمام اور شان و شوکت کے ساتھ منائے جانے لگے لباس' رہن سہن' غذا اور آداب میں ملاپ کی فضا پیدا ہوئی علمی و ادبی میدان میں فارسی و سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہوئے جنہوں نے ایک دوسرے کے خیالات و افکار کو سمجھنے میں مدد دی۔ عوامی سطح پر حکومت کے دفتروں میں اور کاروبار میں اشتراک کا یہ عمل جاری رہا۔ جس نے معاشرے میں رواداری کی فضا قائم کی۔

اکبر کی اس پالیسی کی مخالفت دو طبقوں کی جانب سے کی گئی ایک علماء اور دوسرے مسلمان امراء۔ مرزا عزیز جو کہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا اور اکبر سے ناراض

ہو کر حج کے لیے چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں سے اکبر کو خط لکھا کہ چونکہ اس نے ہندوؤں کو اعلیٰ منصب دے رکھے ہیں اس لیے تاریخ میں یہ بات اس کے لیے بدنامی کا باعث ہوگی۔ (۱۱) مسلمان مغل امراء کا یہ طبقہ ہندوؤں کا دربار میں موجود ہونا ان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونا اور ان کے ساتھ مساوی برتاؤ برداشت نہیں کر سکتا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طبقے کی مخالفت مذہبی سے زیادہ سیاسی و اقتصادی تھی کیونکہ یہی لوگ دربار اور حکومت میں شیعہ امراء کے اقتدار کے بھی مخالف تھے اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ہمایوں کی ایران جلاوطنی اور ہندوستان واپسی پر ایرانی امراء کا اثر و رسوخ دربار میں بڑھ گیا اور بہت جلد حکومت کے کلیدی عہدوں پر یہ ایرانی نظر آنے لگے چنانچہ دربار میں مسلمان امراء ایرانی اور تورانی پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے جن کی بنیاد مذہبی عقیدے پر تھی مگر دراصل یہ ایک دوسرے کے سیاسی حریف تھے چنانچہ مغل دربار میں سنی، شیعہ اور ہندو امراء کے تین گروہ تشکیل پا چکے تھے اکبر جب تک زندہ رہا اس نے ان تینوں جماعتوں کو قابو میں رکھا لیکن اس کے بعد ان تینوں طبقوں کی ایک دوسرے نے مخالف زور و شور سے ابھری۔

علماء کا طبقہ بڑے دکھ کے ساتھ اشتراک کی اس تحریک کو دیکھ رہا تھا جو اس مرحلے پر حکومت کی پناہ میں پروان چڑھ رہی تھی انہیں اس پر قلق تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمان اپنی انفرادیت کھو رہے ہیں اگر ان مشترکہ ثقافتی اقدار اور روایات کو ختم نہ کیا گیا اور ان میں مذہبی جذبہ و جوش پیدا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ اسلام اور مسلمان ہندوستان سے مٹ جائیں گے علماء کو یہ حالات فتنہ قیامت سے کم نظر نہیں آتے تھے اسی ماحول میں احمد سرہندی کی تحریک شروع ہوئی انہوں نے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> ”قیامت قریب ہے اور ظلمتوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں کہاں خیریت اور کہاں نورانیت۔ شائد حضرت مہدی علیہ الرضوان خلافت ظاہری پا کر اس کو رواج دے سکیں۔ (۱۲)

احمد سرہندی نے جو تحریک شروع کی اس میں انہیں مغل دربار کے سنی امراء کی حمایت حاصل ہوئی جو ہندوؤں اور شیعوں دونوں کے خلاف تھے احمد سرہندی کی کوشش تھی کہ ان امراء کی مدد سے جہانگیر پر اثر ڈالا جائے اور حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد معاشرے کا ڈھانچہ بدلا جائے۔ عوامی سطح پر اس تحریک کا زیادہ اثر ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے پس منظر

میں سیاسی عوامل کام کر رہے تھے۔

احمد سرہندی نے جو خطوط جہانگیر کے دربار کے اہم امیر شیخ فرید کو لکھے ہیں' ان سے اس رجحان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"لیکن اس دور میں اسلام کس مپرسی کا شکار ہے اور آپ ایسے جواں مرد اور بلند ہمت سے ایسا فعل (یعنی دین کی حمایت) اور بھی احسن و زیبا ہے۔" (۱۳)

سکھ گرو ارجن دیو کے قتل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :

"کافر لعین رائے گوبند وال کو اس موقع پر ہلاک کر دینا بہت ہی مناسب ٹھہرا اور یہ بات مردود ہندوؤں کے لیے شکست عظمیٰ کا سبب بنی ہے۔ جس نیت سے بھی اور جس بھی مقصد کے تحت اسے مارا گیا ہے بہرصورت احسن ہے اس لیے کہ کفار کی رسوائی اہل اسلام کے لیے گویا سکہ جاری ہے...... جو امر اسلام اور اہل اسلام کے لیے باعث عزت ہوگا۔ یہ جو کفار پر جزیہ وغیرہ لگایا جاتا ہے تو اس سے ان کی محض رسوائی و تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ جس قدر کفار صاحب عزت ہوتے جائیں گے اسی قدر اسلام کی ذلت ہوگی..... لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس دور میں جب کہ بادشاہ اسلام کو (جہاں گیر) اہل کفر سے پہلی سی رغبت نہیں رہی ہے اسے (بادشاہ) ان بدکیش کافروں کی بقیہ رسوم جو گزشتہ صدیوں میں وجود میں آئیں اور جو مسلمانوں کے دلوں پر گراں گزرتی ہیں برائیوں سے آگاہ اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرے.... شرعی مسائل کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا ازبس لازمی ہے۔ اگر اس آگاہی کا بیڑا نہ اٹھایا گیا تو اس کی ذمہ داری بادشاہ کے مقربین اور علماء پر عائد ہوگی۔" (۱۳)

مرزا عزیز کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"اس دور میں آپ کا مبارک وجود غنیمت ہے اور اس وقت میں اس معرکہ کفر و اسلام میں جس میں اسلام کا پلہ ہلکا ہے۔ ہمیں آپ کے سوا کوئی دلیر سپاہی نظر نہیں آرہا..... آپ اس امر کی کوشش فرمائیں کہ کم از کم کافروں کی وہ بڑی بڑی بدعتیں اور رسوم کبیرہ جو مسلمانوں میں رواج پکڑتی جارہی

ہیں پوری طرح مٹاڈالی اور ختم کردی جائیں۔" (۱۵)
لالہ بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک اسلامی فریضہ ہے۔ لیکن ہندو لوگ جزیہ دینا قبول کریں گے مگر گائے کی قربانی پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔"(۱۶)

ایک ہندو ہروے رام نے انہیں لکھا کہ رام اور رحمان ایک ہی ہیں تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :

"رام اور کرشن اور اسی قسم کی دوسری شخصیتیں جن کی ہندو پرستش کرتے ہیں اس ہست کی ادنیٰ مخلوقات ہیں...... کس قدر بری بات ہے کہ کوئی شخص تمام جہانوں کی مخلوقات کے پروردگار کو رام اور کرشن کے نام سے یاد کرے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایک عظیم الشان بادشاہ کو رذیل خاکروب کے نام سے یاد کیا جائے' رام اور رحمان کو ایک سمجھنا بہت بڑی جہالت ہے۔"
(۱۷)

احمد سرہندی کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اشتراک کی تمام علامتوں کو ایک ایک کر کے ختم کردیا جائے اس لیے مذہب یا اختلافات کو شدت کے ساتھ ابھارا گیا تاکہ ہندو اور مسلمان کا فرق واضح ہوسکے اور ہندوستان کی وہ تمام ثقافتی رسوم و رواج جو مسلمان معاشرے میں رواج پاچکی تھیں' ان کی بیخ کنی کی جائے وہ مسلمانوں کے لیے عربی ثقافت کو ضروری سمجھتے تھے' گائے کی قربانی' جزیہ کا برقرار رکھنا' اعلیٰ عہدوں سے ہندوؤں کا اخراج اور میل ملاپ سے اجتناب ان کے خاص مقاصد تھے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ اشتراک کے دھارے کو روک دیا جائے اور دونوں قوموں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کردی جائے۔ جہاں گیر کی تخت نشینی کے بعد اس تحریک کے پیروکاروں کو بڑی امیدیں تھیں کہ وہ دربار سے ہندو اور شیعہ امراء کا اخراج کرکے بلاشرکت غیرے اقتدار پر قابض ہوجائیں گے اور بادشاہ کو اپنے خیالات میں تبدیل کرکے حکومت کو احیائے دین کی تحریک کے لیے استعمال کریں گے۔ لیکن جہانگیر نے سیاسی و مذہبی معاملات میں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے باپ کے مذہبی خیالات کو شائد پسند نہیں کرتا تھا مگر وہ اس کی صلح کل اور رواداری کا قائل تھا اور اپنے باپ کے مداحین میں سے تھا۔ اس نے توزک میں جہاں بھی اکبر کا ذکر کیا ہے وہاں اس سے محبت و عقیدت جھلکتی ہے اس نے اعلانیہ کبھی بھی اپنے باپ کے مذہبی خیالات پر تنقید نہیں کی'

اس لیے اکبر کے زمانے کی پالیسیوں میں اس نے کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ ہندو اور شیعہ امراء جو مغلیہ سلطنت کے اہم ستون تھے اور جنہوں نے حکومت سے وفاداری کی مثالیں قائم کی تھیں انہیں اقتدار سے محروم کرنا سلطنت کی جڑ اور بنیاد کو ختم کرنا تھا۔ اسی لیے جہانگیر نے ان امراء کا اقتدار آہستہ آہستہ گھٹا دیا جو اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ جیسے شیخ فرید اور مرزا عزیز۔ لیکن اکبر کے مذہبی خیالات سے مسلمان عوام میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ انہیں زائل کرنے کے لیے اس نے ظاہری طور پر علماء کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب اس نے کانگڑہ فتح کیا' تو مندر میں گائے کی قربانی کی' شہر میں اذان دلوائی اور خطبہ پڑھوایا' ہو سکتا ہے کہ اس کے اس عمل سے علماء اور سادہ ذہن مسلمان عوام خوش ہوئے ہوں لیکن اس کے علاوہ اس نے اکبر کی پالیسی کو جاری رکھا' احمد سرہندی اور ان کے پیروکار امراء جہاں گیر کو اپنے خیالات میں تبدیل کرنے میں ناکام رہے۔ جہاں گیر کے بعد شاہ جہاں نے علماء کو خوش کرنے کے لیے درباری رسومات میں تبدیلیاں ضرور کیں لیکن اس نے بھی رواداری کی پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی لیکن اس کے دور میں ان دو متصادم رجحانات کو دربار کے دو شہزادوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ داراشکوہ جس نے اشتراک کی تحریک کو مزید آگے بڑھایا اور اورنگ زیب جس نے اس کے خلاف محاذ آرائی کی۔

(۴)

داراشکوہ صوفی منش اور آزاد خیال انسان تھا۔ وہ شہزادے سے زیادہ عالم تھا۔ صوفی خیالات اور مسلک کے لحاظ سے وہ قادری سلسلے سے بیعت تھا۔ قادری سلسلے نے ہندوستان میں ہندو مسلم اشتراک پر زور دیا تھا۔ ملا شاہ قادر جس نے داراشکوہ بیعت تھا کے آزادانہ خیالات کی بناء پر علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا۔ لیکن داراشکوہ کی وجہ سے وہ بچ گئے داراشکوہ کو سرمد سے بھی بڑا لگاؤ تھا وہ بھی مذہبی تفرقات سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔

در کعبہ و بت خانہ سنگ اوشد و چوب اوشد
یکجا حجر الاسود' یکجا بت ہندو شد

دارا نے ایک مرتبہ شیخ محب اللہ (متوفی ۱۶۴۸) سے یہ سوال پوچھا کہ کیا ہندوستان میں حکومت کافر و مومن کی تمیز کرے؟ یا ان کے ساتھ برابر کا سلوک کرے انہوں نے اس کے جواب میں لکھا کہ حکام کا کام رعایا کی فلاح و بہبود ہے کافر و مومن کی تفریق بے کار ہے کہ دونوں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔

اس دور میں وحدت الوجود اور وحدت ادیان کے خیالات تقویت پا چکے تھے دونوں طرف

سے لوگ مشترکہ مذہبی بنیادوں کی تلاش میں تھے۔ مسلمان صوفیا کا طبقہ ہندو فلسفہ اور مذہب سے واقف ہو رہا تھا اور تعصب کی دیواریں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ ہندو یوگیوں کی ایک جماعت بھی تصوف اور ویدانت میں دونوں قوموں کی روحانی بنیادیں رکھ رہی تھیں۔ دارا شکوہ' ملا شاہ سرمد اور محسن فانی (دبستان مذاہب کا مصنف) وہ آزاد خیال علماء تھے جنہوں نے برصغیر میں مذہبی آزاد خیالی اور رواداری کی تحریک کو بلندی تک پہنچایا۔ یہ مذہب کی اختلافی فروعات کو چھوڑ کر اس کے اعلیٰ مقصد میں ہم آہنگی تلاش کر رہے تھے۔ اشتراک کی یہ تحریک مذہب میں نہیں بلکہ ادب میں بھی زور شور سے جاری تھی۔ ہندو فارسی زبان میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے تو دوسری طرف سنسکرت زبان میں فارسی ادب منتقل ہو رہا تھا۔

لیکن معاشرے کا ایک طبقہ اشتراک کے اس عمل کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ مغل دربار میں امراء کا ایک طبقہ اور علماء کی جماعت اشتراک کو روکنے کے خواہش مند تھے اور ان کی حمایت میں شہزادہ اورنگ زیب تھا۔ اس طرح یہ دو رجحانات سیاسی تصادم کا شکار ہوئے' دارا اورنگ زیب کی جنگ صرف تخت و تاج ہی کی جنگ نہ تھی بلکہ خیالات اور افکار کی بھی جنگ تھی۔ دارا آزاد خیال اور صوفیاء کا پیرو تھا اورنگ زیب متشرع اور متشدد علماء کا دارا ہندو اور مسلمان موحدین کی مجلسوں میں جاتا اورنگ زیب ان سے دور رہتا دارا شیعہ سنی اختلافات سے بالاتر ہو کر سوچتا تھا۔ اورنگ زیب شیعوں کو کافر اور زندیق مانتا تھا اس لیے اورنگ زیب کی فتح مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی فتح تھی جس نے ایک بار پھر اشتراک کی تحریک کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور معاشرے میں ہندو اور مسلمان کی تفریق کو شدت کے ساتھ ابھارا۔

اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں شرعی نظام کو قائم کیا اور وہ تمام احکامات قوانین و رسومات جو شرع کے خلاف تھیں انہیں منسوخ کردیا دربار سے ہندو تہواروں کو ختم کیا دوبارہ جزیہ لگایا' موسیقی ' ادب' شاعری اور مصوری کی قطعی ہمت افزائی نہیں کی۔ اس طرح اشتراک کی تمام علامتوں کو خلاف شرع قرار دے کر ختم کردیا۔ لیکن شریعت کے اس نظام اور علماء کے اقتدار کے باوجود سلطنت میں جو زوال کی علامتیں شروع ہو چکی تھیں وہ نہیں رکیں' دربار کے علماء نے مذہبی تعصب لالچ اور ریاکاری کی بدترین مثالیں پیش کیں۔ یہ علماء نہ تو مذہب کے ذریعے مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونک سکے اور نہ ہی مغل سلطنت کو کوئی استحکام بخش سکے۔ اورنگ زیب اور علماء شریعت کے نفاذ کے بعد یہ سمجھتے تھے

کہ ہندوستان میں صحیح اسلامی حکومت قائم کر رہے ہیں اور اس کے نفاذ کے بعد معاشرے کی تمام خرابیاں ختم ہوجائیں گی۔ لیکن شرعی قوانین کے باوجود معاشرے کی اخلاقی حالت بہتر نہ ہوئی اور ہندوستانی معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ اور تفریق بڑھتی گئی اور ان کو مشترک کرنے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ اورنگ زیب کے نظریہ نے سیاسی فتح تو حاصل کرلی لیکن عملی میدان میں اسے شکست فاش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی معاشرہ ان گنت تعصبات میں مبتلا ہوکر افراتفری کا شکار ہوگیا۔

اورنگ زیب اپنے بعد لاتعداد مسائل چھوڑ کر گیا۔ اس کے بعد جو دور آیا وہ نہ صرف سیاسی بے چینی کا دور تھا بلکہ اس زمانے میں دور رس سماجی و اقتصادی تبدیلیاں بھی آئیں۔ ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کے کمزور ہوتے ہی جگہ جگہ بغاوتیں اور سیاسی بے چینی پیدا ہوئی۔ جاٹ ' مرہٹہ اور سکھ مغلیہ حکومت سے برسرپیکار ہوئے' غیریقینی سیاسی صورت حال نے دونوں کو متاثر کیا۔ خانہ جنگیوں نے ان کی اقتصادی حالت کو خراب کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ملازمتوں کی تلاش میں ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے جانے لگے اور ہندو مسلمان حکمرانوں اور امراء کی ملازمتیں اختیار کرنے لگے' فوج میں ہندو اور مسلمان ' مذہبی بنیادوں سے بالاتر ہوکر سیاسی اغراض کی بنیاد پر شامل ہوئے اس لیے جاٹوں' سکھوں اور مرہٹوں کی فوج میں مسلمان موجود تھے۔ ان کی موجودگی سیاسی و اقتصادی بحران کی نشان دہی کرتی ہے۔

مغلیہ حکومت کی کمزوری' نالائق و عیاش حکمرانوں کی ملکی امور سے بے پرواہی' امراء کی سازشیں ' خانہ جنگیاں ' بغاوتیں ' صوبائی گورنروں کی خود مختاری ' مالیہ کی آمدنی میں کمی' فوج کے نظم و نسق میں بے ترتیبی ' امراء کے طبقہ کی عیاشی اور اخلاقی انحطاط نے برصغیر کو ایک انتشار میں مبتلا کردیا تھا۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سامنے آئے اور انہوں نے حکومت کے انحطاط اور مسلمان معاشرے کے زوال کو روکنے کی تجاویز پیش کیں۔ لیکن ایک ایسے وقت میں جب کہ پورا ہندوستانی معاشرہ مسائل کا شکار تھا اس وقت صرف ایک طبقہ یا قوم کی بات کرنا اور صرف ان کی فلاح و بہبود کے لیے سوچنا تنگ نظری کی بات تھی اور پھر ایک ایسی حکومت کے احیاء کی بات کرنا جس کی بنیادیں خستہ و فرسودہ ہوچکی تھیں اور جس میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کوئی سیاسی دور رس نہیں تھی لیکن شاہ ولی اللہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نے ان کی ذات کو مسلمان معاشرے کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے' اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے :

"میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ میں قائم الزماں ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر کے نظام کو قائم فرمانا چاہتا ہے تو مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لیے گویا ایک آلہ یا واسطہ بنالیتا ہے۔" (۱۸)

خیر کے اس نظام کے احیاء کے لیے انہوں نے مغل سلطنت کے احیاء کو ضروری سمجھا' مغل سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت کو مذہب کے ذریعے اکثریت کے خلاف متحد کیا جائے اس لیے انہوں نے مغل امراء کی حمایت حاصل کرنا ضروری سمجھی تاکہ ان کے ذریعے وہ ان مقاصد کو حاصل کرسکیں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی حکومت کرسکتے ہیں وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اگر ہندو ہندوستان کے حکمران ہو بھی گئے تو انہیں دین اسلام قبول کرنا پڑے گا ایسے ہی ترکوں نے فتح یاب ہونے کے بعد کیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام ایک بین الاقوامی حکومت کے لیے آیا ہے اور اس کا اظہار اس وقت ہوگا جب اس کے علاوہ تمام ادیان کو بیک وقت مٹا دیا جائے گا اور ان کی ظاہری شان و شوکت پر کاری ضرب لگائی جائے گی اگر کوئی یہودی یا عیسائی اپنے مذہب کا پیرو ہے تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دین محمدی اختیار کرے کیونکہ جب اللہ نے دین محمدی کو آفاقی بنایا تو اس سے روگردانی سراسر معصیت ہے۔

مغلیہ سلطنت کے استحکام کے لیے ایک طاقتور فوج کا ہونا ضروری تھا جو سکھوں جاٹوں اور مرہٹوں کے خلاف برسرپیکار ہوسکتی اور ان کی بغاوتوں کو کچل کر مضبوط مرکز کی بنیاد ڈالتی لیکن کیا یہ ممکن تھا۔ ان حالات میں صرف مسلمانوں پر مشتمل فوج کی بنیاد ڈالی جاتی؟ اور فوج سے تمام ہندو افسروں اور سپاہیوں کو نکال دیا جاتا آخری عہد مغلیہ میں فوج کا ڈھانچہ اس قدر بدل چکا تھا اور اس میں اس قدر غیر مسلم شریک ہوچکے تھے کہ نہ تو انہیں نکالا جاسکتا تھا اور نہ ہی انہیں اسلام کے نام پر لڑایا جاسکتا تھا اور یہ حالت مغل فوج ہی کی نہیں سکھوں جاٹوں اور مرہٹہ فوج کی بھی تھی۔ فتح کے بعد جب لوٹ مار کا بازار گرم ہوتا تو اس میں فوج ہندو اور مسلمان کی تخصیص نہیں کرتی تھی۔ اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے مغل امراء کو لکھے تھے مثلاً" ایک خط میں نجیب الدولہ کو لکھتے ہیں :

"رحم کا مقام ہے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں اگر اس بات کا خیال رکھا جائے تو امید یہ

ہے کہ فتوحات کے دروازے پے در پے کھلتے چلے جائیں گے اگر اس امر سے تغافل برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ آہ مظلوماں سدراہ مقصود نہ بن جائے۔" (۱۹)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"بعض مردم ہندو جو بظاہر تمہارے اور تمہاری حکومت کے ملازم ہیں اور باطن میں ان کا میلان مخالفین کی جانب ہے وہ نہیں چاہتے کہ مخالفین کی جڑ کٹ جائے۔"

ایک اور خط میں ان مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں جو جاٹوں کی فوج میں شامل تھے:

"اگر مسلمانوں کی ایک جماعت جاٹوں کے ساتھ ہے تو اس کا خیال نہ کریں..... اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں کو (جو غیروں کے ساتھ ہیں) روک دے گا وہ جنگ نہ کرسکیں گے دشمنوں کی کثرت اور دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کی رفاقت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔" (۲۰)

تاج محمد خان بلوچ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں دشمنان دین کے غالب ہونے اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان اپنے اغراض نفسانی کو درمیان میں لاتے ہیں اور ہندوؤں کو اپنے کاروبار میں دخیل بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندو غیر مسلموں کا استیصال گوارہ نہ کریں گے۔" (۲۱)

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام اور اس کی وسعت نے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کردیا تھا کہ وہ اقتدار میں اپنے علاوہ ہندوؤں کو بھی شریک کریں۔ اس لیے فوج ہو یا انتظام سلطنت اس میں ہندو ملازمین تھے اور حکومت کے نظم و نسق چلانے میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ یہ اشتراک اس قدر مستحکم ہوچکا تھا کہ ہندو فوجیوں کی فوج سے یا ہندو کلرکوں کو دفتر سے نکال کر صرف مسلمانوں کو رکھنا ناممکن تھا اور ان کی موجودگی میں صرف مسلمانوں کے بہبود کی بات کرنا اور صرف انہیں مظلوم گرداننا' دوسرے طبقہ و قوم میں نفرت کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے چند مسلمان امراء کے ذریعے جو انقلاب لانا چاہا وہ ناکام ہوگیا' اندرونی انقلاب سے مایوس ہوکر انہوں نے غیر ملکی امداد کا سہارا لیا اور احمد شاہ ابدالی کو مسلمان معاشرے کی مدد کے لیے بلایا:

"یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے' ہندوستان کا تصور کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا' اگر"

غلبہ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔" (۲۳)

احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں سے پانی پت میں جو جنگ ہوئی۔ اس کا فائدہ نہ تو مغلیہ سلطنت کو ہوا اور نہ مسلمان معاشرے کو بلکہ انگریزوں نے اس کے نتائج سے فائدہ اٹھایا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں میں اس احساس کو باقی رکھنے کی کوشش کی کہ وہ اس ملک میں غیر و اجنبی ہیں یہ ان کا وطن نہیں بلکہ قسمت نے انہیں یہاں لا ڈالا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"اللہ سے دعا ہے کہ اس حادثہ میں مخالفین اسلام پر ہی مصیبت ٹھہرے، اور مٹھی بھر مسلمان جو اس بلاد میں غرباء کی حیثیت سے پڑے ہیں محفوظ و مامون رہیں۔" (۲۴)

اپنے وصیت نامہ میں وہ اس رجحان کی مزید وضاحت کرتے ہیں :

"ہم لوگ اجنبی ہیں کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد سرزمین ہند میں بطور اجنبی کے آئے تھے۔ اور ہمارے لیے عربی نسب اور عرب زبان دونوں باعث فخر ہیں۔ ہم تابہ مقدور عرب کے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد ہے، عادات و رسوم کو ہاتھ سے جانے نہ دیں عجم کی رسموں اور ہندوؤں کی عادات کے نزدیک نہ پھٹکیں۔" (۲۵)

یہ وصیت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس ثقافتی اشتراک کے مخالف تھے جو ہندوستان میں ہندو مسلم اشتراک سے ابھر رہا تھا وہ ہندی ثقافت کی بجائے عربی ثقافت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی سطح پر کوئی ملاپ اور ہم آہنگی نہ ہو سکے۔

احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکوں کا خاص زور اس بات پر تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب ہندوؤں کی رسومات کو اختیار کرنا ہے حالانکہ یہ ایک فطری امر تھا کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے یہاں کے مخصوص حالات میں اس ثقافت کو اپنایا جائے۔ یہ ثقافتی اقدار، اشتراک، اتحاد، محبت و الفت، یک جہتی و یگانگت کا باعث ضرور ہیں، تفریق، نفاق اور نفرت و عداوت کا نہیں، لیکن اشتراک کی بنیادوں کو ڈھانے کا کام ابتداء میں ہمارے علماء نے کیا اور ان کا ساتھ حکمران طبقے نے دیا۔

○

حوالہ جات

(۱) دربار ملی، مرتبہ، ایس ۔ ایم اکرام ۔ وحید قریشی، اردو ترجمہ لاہور۔ ۱۹۲۶ء۔ ص ۔ ۳ ۔ ۱۰

(۲) ایضاً : ص۔ ۱۱۵ ۔ ۱۱۷

(۳) ضیاء الدین برنی : فتاوائے جہانداری ۔ بحوالہ ' سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از خلیق احمد نظامی۔ دہلی۔ ۱۹۵۸ء۔ ص۔ ۷۵۔ ۷۶

(۴) ضیاء الدین برنی : تاریخ فروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور ۔ ۱۹۶۹ء ۔ ص ۹۶۔۹۸

(۵) ایضاً : ص ۔ ۹۸

(۶) ایضاً : ص ۔ ۴۳۴

(۷) مولانا جمالی : سیر العافین، دہلی ۔ ۱۳۱۱ء ۔ ص ۱۵۹ ۔ ۱۶۰

(۸) شیخ اکرام : رود کوثر، لاہور۔ ۱۹۶۸ء ۔ ص ۔ ۴۵۶

(۹) خلیق احمد نظامی : سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ ص ۔ ۴۴۹

(۱۰) شیخ اکرام : رود کوثر ۔ ص ۔ ۲۳

(۱۱) ایضاً : ص۔ ۱۵۲

(۱۲) ایضاً : ۲۸۸ (نوٹ میں)

(۱۳) دربار ملی۔ ص ۔ ۲۹۶

(۱۴) ایضاً : ص ۔ ۲۹۶ ۔ ۲۹۸

(۱۵) ایضاً : ص ۔ ۳۰۵ ۔ ۳۰۷

(۱۶) ایضاً : ص۔ ۳۰۸

(۱۷) ایضاً : ص ۔ ۳۰۸ ۔ ۳۱۰

(۱۸) مناظر احسن گیلانی : تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کراچی، ۱۹۵۹ء ۔ ص ۶۵ ۔۶۶

(۱۹) خلیق احمد نظامی : شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ لاہور۔ ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۱۰۵

(۲۰) ایضاً : ص ۔ ۱۰۷

(۲۱) ایضاً : ص ۔ ۱۰۸ ۔ ۱۰۹

(۲۲) ایضاً : ص۔ ۱۵۰ ۔ ۱۵۱

(۲۳) ʹ : ص ـ ۹۰

(۲۴) ایضاً : ص ـ ۱۱۸

(۲۵) دربار ملی ـ ـ ۵۰۶

ہندوستان کی تاریخ میں صوفیوں کا کردار

رومیلا تھاپر نے اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ہے "ترک دنیا: ایک متبادل کلچر کی بنیاد" قدیم ہندوستان کے سنیاسیوں اور سادھوؤں کے بارے میں کہ جنہوں نے دنیا کو ترک کردیا تھا لکھا ہے کہ "دراصل یہ لوگ نہ تو اس دنیا کی نفی کر رہے تھے کہ جس سے ان کا تعلق تھا اور نہ ہی وہ اسے انقلابی طور پر تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتے' بلکہ اس کے مقابلہ میں وہ ایک متبادل معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔" یہ بات مسلمان صوفیوں پر بھی پوری طرح سے صادق آتی ہے کہ جو دنیا کو بدلنے' اس کی نئے سرے سے تعمیر و تشکیل کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے' بلکہ ایک طرف تو وہ قائم شدہ نظام سے سمجھوتہ کر رہے تھے' اور دوسری طرف اس کے مقابلہ میں ایک ایسا نظام بنانا چاہتے تھے کہ جس میں ان کی اہمیت ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو صوفیا دنیا ترک کر رہے تھے' دوسری طرف اس ترک دنیا کی وجہ سے لوگوں میں یہ عقیدہ قائم ہوگیا تھا کہ اس کی وجہ سے ان میں ایسی مافوق الفطرت قوت آجاتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے دنیاوی معاملات و مسائل کو حل کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کے پاس اپنے دنیاوی معاملات کی وجہ سے جاتے تھے' اور خانقاہ و درگاہ اس طرح سے لوگوں کی زیارت کی جگہیں بن گئیں تھیں کہ جہاں جاکر وہ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتے تھے اور سکون حاصل کرتے تھے۔ مثلاً" ہندوستان میں جب لوگ سالار سعود غازی کی درگاہ بطور زیارت جاتے ہیں تو یہ اشعار گاتے ہیں:

چلے غازی کی نگریا
اپنی زندگی بنانے' سوئی قسمت جگانے
سارے گناہ بخشوانے' جی کی بپتا سنانے
چلے غازی کی نگریا

صوفیوں نے اگرچہ ترک دنیا تو کی' مگر انہوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے کے بجائے شہروں میں رہنا پسند کیا کہ جہاں ان کی خانقاہوں کی تعمیر میں حکمراں اور امراء نے حصہ

لیا تاکہ اس خدمت کے بعد وہ بھی ثواب میں حصہ بٹا سکیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خانقاہ کے اخراجات کی بڑی رقم حکمرانوں اور امراء کی جانب سے آتی تھی۔ اس طرح سے ایک تو طرف امداد لی جاتی تھی اور دوسری طرف اسے دنیاوی طاقت و اقتدار سے علیحدہ کرکے ایک متبادل قوت بنا دیا تھا کہ جہاں صوفی کو تمام روحانی اور دنیاوی اختیارات پر کنٹرول تھا اور وہ لوگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا۔

برصغیر ہندوستان میں سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیاء کا کردار اور عمل بھی تبدیل ہوتا رہا۔ مثلاً عہد سلاطین میں جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار پوری طرح سے مستحکم نہ ہوا تھا اور ان کی جنگیں ہندو حکمرانوں سے جاری تھیں' تو اس عہد میں حکمرانوں اور اہل اقتدار کو صوفیوں کی دعاؤں' اور سرپرستی کی ضرورت تھی تاکہ ان کی روحانی مدد سے وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں فتح یاب ہوسکیں اور ان کا قلع قمع کرسکیں۔ اگرچہ صوفیاء سلاطین کے دربار میں تو نہیں جاتے تھے مگر ان میں اور حکمرانوں میں ایک طرح سے سمجھوتہ تھا۔ کیونکہ سلاطین بحرانوں پر قابو پانے کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔ مثلاً قحط' خشک سالی' غیر ملکی حملہ' اور بغاوتوں کی صورت میں ان کی دعاؤں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے اس عہد میں جب کہ مسلمان معاشرہ میں عدم تحفظ اور غیر یقینی کی کیفیت تھی۔ صوفیا کی روحانی طاقت کو وہ اپنی حفاظت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

عہد سلاطین کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں سے کسی شاہی خاندان نے ایک طویل عرصہ حکومت نہیں کی' اور نہ ہی انہوں نے کسی بڑی سلطنت یا امپائر کی بنیاد ڈالی۔ اس لیے مسلسل شاہی خاندانوں کی تبدیلی' خانہ جنگی' سازش اور عدم سیاسی استحکام اس عہد کی خصوصیات تھیں۔ لہٰذا ان حالات میں صوفیاء کی خانقاہ کی اہمیت مسلمان معاشرہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی کیونکہ یہ ایک مستقل ادارہ تھی۔ مثلاً نظام الدین اولیاء اور ان کی خانقاہ کئی بادشاہوں کے آنے جانے اور خاندانوں کی تبدیلی کے باوجود اسی طرح قائم رہی۔

جب ہندوستان میں ۱۴ویں اور ۱۵ویں صدیوں میں صوبائی حکمراں حکومتیں قائم ہوئیں تو اس کے نتیجہ میں صوفیاء ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کہ جہاں جہاں سیاسی اقتدار قائم ہوا تھا۔ وہاں پھیل گئے۔ ان میں سے اکثر صوفیوں کو جب بطور مدد معاش جاگیریں ملیں' یا شہروں میں شاہی سرپرستی میسر نہیں آئی تو یہ قصباتی شہروں اور گاؤں میں آباد ہوگئے۔ جہاں انہوں نے کسانوں کو اپنا مرید بنالیا اور ان میں اپنی عقیدت کو بیدار کردیا۔

لیکن مغل دور حکومت میں صوفیاء کا کردار بدل گیا۔ کیونکہ مغلوں نے ہندوستان کے

بڑے حصے کو فتح کرکے یہاں پر اپنی امپائر کی بنیاد رکھ ڈالی' اور سیاسی طور پر وہ انتہائی طاقتور حکمران اور مطلق العنان بن گئے۔ چونکہ ان کے پاس ذرائع کی کمی نہیں تھی کہ جن کی مدد سے وہ فتوحات بھی حاصل کر رہے تھے اور انتظام سلطنت کو بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اس لیے انہیں صوفیوں کی روحانی قوت کی اس قدر ضرورت نہیں تھی کہ جو سلاطین دہلی کو تھی۔ اس لیے انہوں نے صوفیوں سے رجوع کیا تو اپنی خاص خاص خواہشات کی تکمیل کے لیے' جیسے تخت کے لیے جانشین کی پیدائش' یا بیماری سے صحت یاب ہونے کے لیے۔ اس لیے جب انہیں حکمرانوں کی سرپرستی نہیں ملی تو وہ چھوٹے شہروں میں چلے گئے۔ جہاں ان کی خانقاہیں قصباتی امراء اور عام لوگوں کے لیے زیارت گاہیں بن گئیں۔

صوفیاء کو ایک بار پھر اس وقت اہمیت ملی کہ جب مغل شاہی خاندان کو زوال ہونا شروع ہوا۔ سیاسی طاقت کے ختم ہونے کی وجہ سے صوفیاء کی روحانی طاقت کی طرف لوگوں کا میلان ہونا شروع ہوگیا تاکہ وہ ان کی حفاظت کرسکیں۔ جو کام سیاسی طاقت نہیں کرسکتی تھی اس کے لیے روحانی طاقت سے مدد لی گئی۔

جب ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہوگیا تو صوفیوں کی رہی سہی سرپرستی بھی ختم ہوگئی' اس لیے انہوں نے شہروں کی بجائے قصبوں اور دیہاتوں میں اپنے اثر و رسوخ کو قائم کرنا شروع کردیا یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت نے ان کے اثر و رسوخ کو اپنی حکومت کے لیے استعمال کیا اور انہیں لوگوں اور حکومت کے درمیان بطور رابطہ رکھ کر ان کی مراعات اور حیثیت کو برقرار رکھا۔

آزادی کے بعد بھی صوفیاء' مشائخ اور سجادہ نشینوں نے ربط کے اس سلسلہ کو جاری رکھا' یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے تمام سیاسی نشیب و فراز کے باوجود چاہے آمرانہ دور حکومت ہو یا فوجی یا جمہوری ان سب میں صوفیاء نے اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھا ہے۔ وہ آمروں کی بھی اسی طرح سے مدد کرتے رہے ہیں جیسے جمہوری حکومت میں "عوامی نمائندوں کی"

لیکن معاشرے میں جو سیاسی و سماجی اور معاشی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ٹیکنالوجیکل اثرات سے جس طرح لوگوں کی زندگی بدل رہی ہے' ان تمام وجوہات کی وجہ سے صوفیوں کی روایتی حیثیت کو خطرہ درپیش ہے۔ مثلاً" ان کی ابتداء علماء کے تشدد' سختی اور تنگ نظری کی وجہ سے ہوئی تھی اور ان کے مقابلہ میں انہوں نے ماحول کو کھلا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اب جمہوری سیاست میں مزاحمت کا یہ کردار سیاسی جماعتیں اور پریشر گروپ کرتے ہیں جو زیادہ

موثر ہوتے ہیں۔

اسی طرح حکمرانوں اور لوگوں میں رابطے کے نئے سلسلے قائم ہوگئے ہیں ذرائع آمدرفت اور ذرائع ابلاغ عامہ کی وجہ سے لوگ اپنی شکایتیں اور مطالبات باآسانی متعلقہ محکموں تک پہونچا دیتے ہیں۔ تیسری حیثیت صوفیاء کی علاج کرنے والوں کی تھی اس میں بھی اب نئی دواؤں کی ایجاد اور علاج معالجہ کی سہولتوں کے بعد کمی آگئی ہے۔ لوگوں میں اب یہ شعور آگیا ہے کہ بیماریوں کے علاج کے لیے پیروں کی بجائے ڈاکٹروں کے پاس جانا چاہیے۔

اس صورت حال اور تبدیلی کو دیکھتے ہوئے ذہن میں یہ سوالات آتے ہیں کہ : کیا صوفی اور ہمارے معاشرے میں کوئی صحت مند کردار لوا کرسکتے ہیں لور یا کہ بحیثیت ایک طبقہ کے ان کی افادیت ختم ہوگئی ہے اور وہ صرف ماضی کی ایک یادگار رہ گئے ہیں۔؟

○

صوفی روایات کی تشکیل

فرد' ادارے' اور جماعتیں اپنے ذاتی' گروہی اور قومی مفادات کے حصول یا اپنی مراعات کو برقرار رکھنے کی خاطر روایات کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ ان روایات میں شخصیت پرستی' تہوار' تقریبات' رسومات اور رسم و رواج ہوتے ہیں۔ ان روایات کی تشکیل میں وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ ایک وقت میں ان کی ابتداء کو بالکل بھلا دیا جاتا ہے اور ان میں جو اضافے ہوئے ہیں۔ اور جس طرح انہیں خاص مقاصد کے لیے مسخ کیا گیا ہے۔ انہیں اصلی اور حقیقی سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب یہ روایات حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں تو ان سے خاص گروہ اور جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں' اور مزید یہ کہ تاریخ کے ذریعہ ان روایات کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ روایات جتنی قدیم ہوتی ہیں اسی قدر انہیں جائز اور سچا سمجھا جاتا ہے۔

انسان کی فطرت میں توہمات کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے جذبات کو آسانی سے بڑھکایا جاسکتا ہے۔ اس لیے وہ روایات کہ جو عقیدہ اور توہمات کی بنیاد پر تشکیل دی جاتی ہیں' وہ جلد ہی مقبول ہوجاتی ہیں اور انہیں لوگ بغیر کسی تردد کے قبول کرلیتے ہیں۔ مثلاً" اگر یہ مشہور کردیا جاتا ہے کہ کسی صوفی یا پہنچے ہوئے پیر کی قبر اچانک دریافت ہوئی ہے' لوگ اس کی تحقیق کئے بغیر عام طور سے قبر پر ثواب یا منت ماننے کی غرض سے جانا شروع ہوجاتے ہیں۔ اور اس قبر کی دریافت ہونے کے ساتھ ہی اس کے ارد گرد روایات بننے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی ابتداء اس طرح سے ہوتی ہے کہ کچھ پیسے والے عقیدت و ثواب کی خاطر قبر پر مقبرہ تعمیر کروا دیتے ہیں۔ مقبرہ کی تعمیر کے بعد سے یہ پیر کے مریدوں اور متولی کو ایک محفوظ جگہ فراہم کردیتا ہے۔

اس کے بعد دوسری روایات کی ابتداء عرس منانے سے شروع ہوتی ہے۔ عرس کی وجہ سے نہ صرف مریدوں اور متولی کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ اس کے دوسرے لوگ بھی معاشی طور پر فوائد حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً" قوالوں کی کئی جماعتیں یہاں آکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی

ہیں اور سامعین سے پیسے وصول کرتی ہیں۔ پھر اس موقع پر عرس میں آنے والوں کے لیے بازار لگتا ہے کہ جس میں پھولوں والے' خوشبو والے' چادریں فروخت کرنے والے' مٹھائی والے اور کئی دوسری اشیاء فروخت کرنے والے اپنے اسٹال لگاتے ہیں' اور عرس کے دنوں میں کافی منافع کماتے ہیں۔ یہی لوگ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو عرس میں لانے کی خاطر پیر کے بارے میں قصے کہانیاں مشہور کرتے ہیں' اور ان کی کراماتوں کے بارے میں لوگوں کو بتاتے ہیں' جیسے جیسے لوگوں کی منتوں کے پورا ہونے کے واقعات مشہور ہوتے ہیں' اسی طرح سے ان لوگوں کا کاروبار چمکتا ہے یہاں تک کہ مقبرہ کے اردگرد ایک مستقبل بازار وجود میں آجاتا ہے۔

دوسرا گروہ جو اس روایت سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ ناشرین اور کتاب فروشوں کا ہوتا ہے' جو پیر کی کراماتوں پر مشتمل کتابیں چھاپ کر خوب پیسے کماتے ہیں' ان کتابوں کی وجہ سے پیر کی شہرت ایک جگہ سے نکل کر پھیلتی ہے' اور دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بعد میں سنجیدہ محقق اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر اس پر کتابیں لکھتے ہیں۔

اس طرح جو روایات بنتی اور مقبول ہوتی ہیں وہ اس قدر مضبوط ہوجاتی ہیں کہ آخر میں اس کے خلاف بولنا' یا اس کی تصحیح کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ ایک عقیدے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور اس کے خلاف کسی قسم کے دلائل نہیں دیئے جاسکتے ہیں اور اگر دیئے بھی جائیں تو انہیں مشکل سے ہی تسلیم کرتا ہے۔

روایات کو مزید استحکام دینے کی غرض سے تیسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے کہ جس میں تبرکات کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے' ان میں پیر کے بال' لباس' جوتے اور عصا ہوتے ہیں اور یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان تبرکات کی زیارت سے ثواب ہوگا۔ مزید تبرکات کی وجہ سے لوگ زیادہ سے زیادہ قبر یا درگاہ میں منت ماننے اور نذر و نیاز دینے کی غرض سے آتے ہیں' جن سے متولیوں اور حاضر رہنے والے مریدوں کو فائدہ ہوتا ہے۔

برصغیر ہندوستان و پاکستان میں بڑی تعداد میں درگاہیں ملک کے ہر حصہ اور علاقے میں پائی جاتی ہیں کہ جہاں بڑی تعداد میں لوگ جاتے ہیں۔ خاص طور پر عرس کے موقع پر زائرین کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر درگاہیں کس طرح سے گمنامی سے نکل کر مقبول عام ہوئیں اس کی کہانی دلچسپ ہے اکثر ہوتا یہ ہے کہ درگاہ ابتداء میں صرف مریدوں کے حلقہ میں مشہور ہوتی ہے اور وہی اس کی زیارت کرتے ہیں اس کے بعد جب پیر کی کراماتوں کی

کہانیاں پھیلتی ہیں تو قریبی گاؤں اور شہروں سے لوگ آنا شروع کر دیتے ہیں' آخر میں حکمراں اور امراء کی دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ عقیدت کی وجہ سے زیارت کے لیے آنا شروع کر دیتے ہیں' اور یہی لوگ شاندار مقبرے اور اس کے ارد گرد دوسری عمارتیں تعمیر کروا دیتے ہیں ایک مرتبہ جب درگاہ کو شاہی سرپرستی حاصل ہوجاتی ہے تو پھر عوام الناس میں اس کی مقبولیت بہت جلد ہوجاتی تھی۔

روایت کی اس تشکیل کو حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ میں پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ ۱۲۳۶ میں ان کی وفات کے بعد ان کی قبر اس قدر سنسان اور ویران تھی کہ یہاں پر جنگلی جانوروں کا بسیرا ہوتا تھا۔ ان کی قبر پر پہلا مقبرہ صوفی شیخ حسین ناگوری نے تعمیر کردیا' انہیں اس کام کے لیے پیسہ مالوہ کے حکمراں سلطان غیاث الدین خلجی (۱۴۶۹ سے ۱۵۰۰) نے دیا تھا۔ لیکن ان کی شہرت اس وقت ہوئی کہ جب اکبر ان کے مقبرہ پر زیارت کی غرض سے آیا اور بعد میں اس نے اور اس کے جانشینوں نے یہاں پر شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ بادشاہ کی عقیدت کی وجہ سے مغل خاندان کے افراد اور مغل امراء بھی ان کے عقیدت مند ہوگئے اور اس نے ان کی شہرت عوام الناس میں پھیلا دی۔

آہستہ آہستہ درگاہ کے احترام اور عزت کو بڑھانے کی خاطر یہاں پر مختلف قسم کی رسومات کی ابتدا ہوئی' مثلاً" قبر کو غسل دینا' زیارت کے اوقات کا تعین کرنا' درگاہ میں جھاڑو دینا اور روشنی کا انتظام کرنا وغیرہ۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے وہ پورے ہندوستان میں مشہور ہوگئے اور انہیں عقیدت و محبت سے کئی ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ جس میں خواجہ غریب نواز سب سے زیادہ مشہور ہوا۔

اگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو کم از کم تمام درگاہوں کے پس منظر میں اسی قسم کا عمل نظر آئے گا۔ اور کچھ مشہور صوفیوں کی درگاہیں اس لیے اب تک گمنامی میں نظر آئیں گی کہ انہیں کوئی شاہی سرپرستی نہیں مل سکی۔ مثلاً" سندھ میں جھوک کے شاہ عنایت' شاہ عبداللطیف کے مقابلہ میں زیادہ مشہور نہیں ہوسکے' شاہ عبداللطیف کو تقسیم کے بعد سندھ کے قوم پرستوں اور ریاست نے اپنالیا' ان کے مقابلہ میں شاہ عنایت کو قوم پرستوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اگرچہ انہوں نے حقوق کے لیے اپنے وقت کے حکمرانوں سے مزاحمت کی تھی۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف کو اس لیے اپنایا کہ وہ شاعر اور صوفی تھے' مگر ان کے ہاں انقلابی سیاسی افکار نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے قوم پرست مزاحمت سے زیادہ سمجھوتے کے قائل ہیں۔

اس طرح سے روایات کی تاریخ ان رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے جو کہ افراد' جماعتوں اور گروہوں کے ذہنوں میں ہوتے ہیں۔ اور جن کے ذریعہ وہ عام لوگوں کی ہمدردی حاصل کرکے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

○

تصوف اور معاشرہ

نظریات و افکار اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریکیں معاشرے کے سیاسی' سماجی اور معاشی حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور کسی خاص گروہ لوز جماعت کے مفادات اور ان کی ضروریات کا اظہار کرتی ہیں۔ تصوف کے جو مختلف نظریات لور شکلیں اسلامی معاشرت میں پیدا ہوئیں' اس کے پس منظر میں اسلامی معاشرے کی وہ سماجی تبدیلیاں تھیں جو تاریخی عمل کے ساتھ ساتھ ہو رہی تھیں۔ عرب معاشرہ قبائلی سماج سے نکل کر جاگیرداری دور میں داخل ہو رہا تھا۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سیاسی طاقت و اقتدار کی بنیادوں پر نئے نئے طبقے ابھر رہے تھے۔ معاشرے میں استبدادی نظام حکومت طاقت ور ہو رہا تھا۔ قبائل جمہوری روایات' آزادی ' اور مساوات کی روایات کمزور ہو رہی تھیں اور ساتھ ہی فتوحات کے ذریعے نئے علاقے اور نئی قومیں اسلامی حکومت کا حصہ بن رہی تھیں۔ ان حالات میں حکمراں طبقے اپنی سیاسی قوت' مالیہ خوش حالی اور سماجی مرتبے کو برقرار رکھنے میں کوشاں تھے تو اس کے مقابلے میں محروم طبقات اپنی محرومیوں' تلخیوں اور مجبوریوں کا علاج کبھی مزاحمت میں ڈھونڈتے اور کبھی مایوس ہو کر دنیا سے علیحدگی اور نفرت میں۔

اسلامی معاشرے میں اس وقت سماجی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں جب اسلامی فتوحات کے ذریعے عراق و ایران فتح ہوئے اور ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ عرب معاشرے میں کسی فرد کی شناخت اس کے قبیلے کے ذریعے سے ہوتی تھی اس لیے جب غیر عرب مسلمان ہوئے تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ انہیں کس طرح عرب کے قبائلی نظام میں ضم کیا جائے۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسلمان ہونے والے افراد کو کسی نہ کسی عرب قبیلے کا رکن بننا پڑے گا۔ غیر عرب قبیلوں میں شمولیت کے بعد یہ لوگ موالی کہلائے کہ جس کا واحد مولا ہے۔ چونکہ موالی عرب نہیں تھے اس لیے عرب قبائلی نظام میں ان کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ عربوں کو نسلی طور پر جو فخر تھا اس کی وجہ سے موالیوں کے ساتھ انہوں نے سماجی طور پر مساوی سلوک نہیں کیا اور انہیں خود سے ادنیٰ اور حقیر گردانا۔ اس وجہ سے

عربوں اور موالیوں میں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات شدت کے ساتھ پیدا ہوئے اور آگے چل کر تاریخ میں ان دو گروہوں کی دشمنی ایک بار پھر ابھر کر آئی۔ مثلاً" موالیوں نے ہمیشہ ان قوتوں کا ساتھ دیا کہ جو حکومت اور اقتدار کے خلاف تھیں اور حکومت کے خلاف بغاوت کرتی تھیں' وہ ان باغی تحریکوں کے ذریعے سے اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔

امیہ حکومت کے خاتمے اور عباسیوں کی کامیابی میں چونکہ ایرانیوں کا ہاتھ تھا۔ اس لیے نئی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہوا اور انہوں نے عباسی خلیفے کو ساسانی بادشاہ بنا کر ایرانی دربار کی رسومات کا احیاء کر دیا۔ اس لیے اگرچہ فتوحات کا دور جاری تھا۔ خزانے مال غنیمت سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر یہ سارا مال و دولت صرف حکمران طبقوں کے لیے تھا جوان و سائل کو اپنے آرام و آسائش اور عیش پر خرچ کر رہے تھے جبکہ عوام محرومیوں کا شکار تھے۔

یہی وجہ تھی کہ اس دور میں بڑی تعداد میں ایسے فرقے پیدا ہوئے کہ جنہوں نے اس نظام کے خلاف بغاوت کی اور مذہب کی ایسی تاویلات پیش کیں کہ جنہوں نے ان کی بغاوتوں اور ان کے عقیدوں کے لیے جواز فراہم کیے۔

اس ضمن میں عباسی دور میں ہونے والی زنجیوں کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ زنجی حبشی یا افریقی غلام تھے جو کہ عراق زیریں میں کسانوں کی حیثیت سے مزدوری کرتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ شور زدہ زمینوں سے نمک علیحدہ کر کے انہیں قابل کاشت بنائیں۔ ان غلاموں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ اور دن بھر کی محنت و مزدوری کے بعد انہیں تنگ کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور کھانے میں ستو اور چند کھجوریں دی جاتی تھیں۔ اس ظلم کے خلاف ان غلاموں نے کئی بار بغاوتیں کیں۔ مگر ان کی وہ مشہور بغاوت جو ۸۶۸ء سے لے کر ۸۸۳ء تک جاری رہی اس نے عباسی خلافت کو بڑی حد تک پریشان کردیا۔ مگر استبدادی حکومتوں میں بغاوتیں ختم کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے کہ انہیں جبر' تشدد' اور قوت کے ذریعے ختم کیا جائے۔ اور دوبارہ ظالمانہ نظام کو نافذ کیا جائے۔

اس بغاوت کی جو خصوصیات تھیں وہ یہ کہ اس کی راہنمائی کی ایک علوی مدعی خلافت نے کی جو نقاب پوش کے نام سے مشہور ہوا۔ کیونکہ اس نے اپنی شناخت کو چھپائے رکھا اور اسے ظاہر نہیں کیا۔ اس کے دو ساتھی چکی والا اور شربت فروش تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نچلے طبقے اور کچلے عوام کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ بغاوت کے دوران

زنجیوں نے اشتراکی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مال و دولت اور اسباب کو مشترکہ ملکیت قرار دیا۔

اگرچہ عباسی حکومت نے زنجیوں کی بغاوت کا خاتمہ کردیا' مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی جو کہ پہلی سے زیادہ خطرناک اور طاقت ور تھی۔ یہ قرامطیوں کی بغاوت تھی جو کہ ایک شیعہ فرقہ تھا' اور جس نے عباسی دور میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی' وہ اس اصول کو تسلیم کرتے تھے کہ امامت و اقتدار موروثی نہیں ہوتا' بلکہ کوئی بھی' شخص اس مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ اس تحریک میں کسان' دست کار' ہنر مند' اور نچلے طبقے کے لوگ جو محرومیوں کا شکار تھے۔ انصاف اور اپنی محرومیوں کے مداوے کی وجہ سے شامل ہوئے قرامطی فرقے میں بھی اشتراکی نظام پر زور تھا' اور نجی ملکیت سے انکار تھا اس کے علاوہ وہ اپنے عقائد کے بارے میں ہر چیز خفیہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی رہنما کا نام بھی خفیہ رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی تعلیمات میں عدل' انصاف اور مساوات پر زور دیا اور دنیاوی معاملات کو حل کرنے میں عقل کی راہنمائی کو ضروری سمجھا۔

مسلمان مورخین نے ایسی ان تمام تحریکوں کو جنہوں نے عباسی استبداد کے خلاف بغاوت کی تھی' سخت تنقید کی ہے اور ان کی تعلیمات و عقائد کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور ان کے مظالم کی داستانیں بڑھا چڑھا کر پیش کی ہیں۔ انہوں نے ان وجوہات کو بالکل فراموش کردیا ہے کہ جن کی وجہ سے وہ بغاوت پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کی تعلیمات اور عقائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عدل و انصاف' مساوات اور عقل پر زور دیا ہے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے کہ جس میں ظلم و استحصال نہ ہو۔

ان تحریکوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عباسی حکومت میں جاسوسی کا نظام بڑا سخت تھا۔ اس لیے مخالفانہ اور باغیانہ تحریکوں میں ہر بات کو خفیہ رکھا جاتا تھا اور اراکین و پیروکاروں سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ تحریک کے رازوں کو سینوں میں بند رکھیں گے۔ اس لیے اشارے' کنایئے' علامات' تعلیمات' تشبیہات کا رواج ہوا۔ اگرچہ مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے ذریعے ہونے لگی مگر اس نے معاشرے کو بدل ڈالا۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف روک ٹوک' تنقید کرنے کی جرات ختم ہوگئی۔ اور معاشرہ رازوں اور اسراروں کی تہوں میں لپٹ اور سکڑ کر اپنی ذہنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھو بیٹھا۔ ایک اور بڑا فرق جو پیدا ہوا وہ یہ کہ رازو اسرار کے جاننے والوں کا خاص طبقہ پیدا ہوا جبکہ عوام اور عام پیروکار ان کے

حاشیہ نشیں بن کر رہ گئے آگے چل کر اس نے اس قدر جڑیں پکڑیں کہ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کہہ کر عوام نے سیاست سے بالکل علیحدگی اختیار کرلی۔ اور اقتدار و رہنمائی کا کام خواص پر چھوڑ دیا۔

چنانچہ ان حالات میں اسلامی معاشرے میں تصوف کا ارتقا ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکلیں بھی بدلتی رہیں۔ خصوصیت سے عباسی دور حکومت میں کہ جس میں خلیفہ کو لامحدود اختیارات مل گئے تھے اور علماء حکومت کا ایک حصہ بن کر حکومت کی پالیسیوں کو جائز قرار دے رہے تھے۔ ایک ایسے نظام میں عوام کی نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب تک حکومت کے خلاف جو بغاوتیں ہوئی تھیں انہیں سختی سے کچل دیا گیا تھا۔ اس لیے صوفیاء نے اس استبدادی نظام کے خلاف جو راستہ نکالا وہ یہ تھا کہ نظام کو تبدیل کئے بغیر اور اس کے خلاف بغاوت کے بغیر افراد کو سکون و اطمینان فراہم کیا جائے' اور ان کے مادی وسائل کی کمی اور ان کے روحانی درجات بلند کرکے پورا کیا جائے۔

صوفیاء نے خدا کے اس تصور کو بدلا جو کہ اب تک علماء اور مذہبی فرقوں نے دیا تھا کہ جس میں خدا قادر و مالک ' قہار و جبار تھا جس میں جہنم کے خوف اور قیامت کے امتحان سے نجات کے لیے عبادت ضروری تھی۔ صوفیاء نے کہا کہ خدا قہار و جبار ہی نہیں بلکہ رحیم و غفور بھی ہے' وہ آسمان و زمین ہی نہیں انسان کے دل میں بھی ہے۔ لہٰذا صوفی کی معراج یہ ہے کہ اس کا خدا سے ملاپ ہوجائے' یہ ملاپ ایک سفر کے ذریعے ممکن ہے جسے طریقت کا نام دیا گیا اس فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ صوفیاء اور ان کے پیروکاروں میں حکمران اور اس کے مظالم کو سہنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا۔ اس کے استبدادی نظام حکومت سے پناہ خدا کی محبت میں مل گئی۔ دنیا میں محرومیوں سے اس وقت نجات مل گئی جب اس دنیا کو آلام اور آلائشوں کی جگہ قرار دے دیا گیا اور ترک دنیا نے توکل' جذبہ' اخلاص' توبہ' بھوک' صبر' قناعت کے جذبات کو ابھارا' خواہشات مارنے کے لیے نفس کو مارنا ضروری تھا جو کہ ایک ظالم کی طرح تھا۔

لہٰذا صوفیاء نے معاشرے اور اس کے مسائل کا حل یہ نکالا کہ انہیں دور کرنے اور ختم کرنے کی بجائے انہیں ایک رومانوی درجہ دے کر ان کی شان بڑھا دی جائے۔ مثلاً ۹۰۰ء میں بغداد میں اس پر بحثیں ہورہی تھیں کہ امیر و غریب میں کون برتر ہے تو صوفیاء نے کہا کہ غریب' کیونکہ دولت و ساز و سامان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا غلبہ ذات پر ہوگا۔ اور ذات ان کی غلام بن کر ابھر جائے گی۔ اس لیے صحیح آزادی یہ ہے کہ خود کو ان

کے تسلط سے آزاد کرایا جائے۔ مال و دولت سے دنیاوی محبت پیدا ہوتی ہے جو روحانی سفر میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس لیے غربت و فقر آزادی کے لیے ضروری ہیں۔ بھوک روحانی درجات بلند کرنے کے لیے ضروری ہے بقول مولانا رومی اگر بانسری کا پیٹ بھرا ہو تو کیا وہ آواز نکال سکتی ہے۔

صبر، شکر، قناعت، توکل اور فقر کی عظمت نے محروم لوگوں کے لیے سماج کی ناانصافیوں کو چھپا دیا۔ بلکہ وہ ان پر رحم و ترس کھانے لگے اور ان سے ہمدردی کرنے لگے کہ جن کے پاس دولت تھی، اس طرح مظالم سے مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے نفس کو مارنے کی تعلیم دی تاکہ خواہشات پیدا نہ ہوں اور معاشرے کا نظام اسی طرح قائم رہے۔ صوفی ابوسعید ابی الخیر (۱۰۴۹) کا کہنا تھا کہ ذلت میں شاہ ہے غربت میں امیری ہے۔ غلامی میں بادشاہت ہے، موت میں زندگی ہے اور تلخی میں مٹھاس ہے۔

صوفیاء نے اپنی تعلیمات میں اسرار و رموز پر زور دیا اور کہا کہ یہ اسرار درجہ بدرجہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ حکومت و شریعت میں تصادم نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے حسین بن منصور حلاج پر اکثر صوفیاء نے تنقید کی ہے کہ انہوں نے راز افشاء کرکے بد عہدی کی۔ تعلیمات کو پوشیدہ رکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس وقت حکومت و علماء ہر تحریک کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لیے زنجیوں، قرامطیوں، اسماعیلیوں اور شیعوں نے اپنے عقائد کو پوشیدہ رکھا اور خاص عہد و رسومات کے بعد انہیں اپنے پیروکاروں پر ظاہر کیا۔

عباسی دور ہی میں خانقاہ کا ادارہ وجود میں آیا۔ کہ جس میں مرید اجتماعی زندگی گزارتے تھے۔ اور جس میں جائداد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ سب مال و دولت میں برابر کی شرکت کرتے اور مل جل کر کھاتے۔ مگر فرق یہ تھا کہ خانقاہ کے یہ اخراجات مرشد یا مرید اپنی محنت و مزدوری سے پورے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے لیے وہ نذر، نذرانے، عطیات اور فتوحات پر انحصار کرتے تھے یہ مریدوں کو اپنی پناہ گاہ تو فراہم کرتی تھی۔ مگر ساتھ ہی مرید اس کی چار دیواری میں اور اس کے معمولات میں اپنی آزادی بھی کھو بیٹھتا تھا۔ اور معاشرے سے کٹ کر اپنی زندگی کو محدود کرلیتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں صوفیاء کے سلسلوں کی ابتداء اس وقت ہوئی جبکہ عباسی خلافت کمزور ہوئی اور جگہ جگہ خود مختار خاندانوں کی حکومتیں قائم ہونا شروع ہوگئیں۔ ایک ایسے ماحول میں کہ جب اسلامی اتحاد ٹوٹ رہا تھا صوفیاء کے سلسلوں نے روحانی اتحاد کو برقرار رکھنے کی

کوشش کی۔ تیرھویں صدی میں جب منگولوں کے حملوں نے اسلامی دنیا کو تہس نہس کردیا اور معاشرے میں مایوسی و ناامیدی کے جذبات پیدا ہوئے تو اس سیاسی انتشار نے صوفی تحریکوں کو بڑی مقبولیت دی۔ مادی شان و شوکت کھونے کے بعد روحانی درجات بلند کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔

تصوف نے اسلامی معاشروں میں لوگوں کو ظلم و ناانصافی ' بھوک و غربت اور مفلسی سہنے کا حوصلہ دیا معاشرے کو بدلنے کے لیے مزاحمت کی بجائے اسے برداشت کرنے کی تعلیم دی۔ اس میں انفرادی اور گروہی نجات پر زور ہے۔ مگر اجتماعی مسائل سے چشم پوشی ہے فرد زندگی کے مصائب سے گھبرا کر اس میں پناہ لیتا ہے۔ اور اس کی قیمت وہ اپنی آزادی کی قربانی اور خواہشات کے خاتمے کی صورت میں دیتا ہے۔

○

صوفیاء کی روحانی سلطنت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلامی معاشرہ خانہ جنگیوں مذہبی و سیاسی اختلافات اور نظریاتی بنیادوں پر مختلف جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سیاسی اختلافات نے اس میں مزید اضافہ کیا ان خانہ جنگیوں اور سیاسی اختلافات نے اسلامی معاشرے میں دو رجحانات کو پیدا کیا ایک رجحان تو یہ تھا کہ اس سیاسی کشمکش اور اقتدار کی جنگ میں کسی ایک جماعت کا ساتھ دیا جائے تاکہ معاشرے سے خانہ جنگی ختم ہو اور امن و امان بحال ہو دوسرا رجحان یہ تھا کہ اس تصادم میں کسی کا ساتھ دینا اور اس کی حمایت کرنا مزید خونریزی کا سبب ہوگا۔ اس لیے دنیاوی معاملات سے خود کو علیحدہ رکھا جائے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنا وقت یاد الٰہی میں صرف کیا جائے۔

اس نقطے سے اسلامی معاشرے میں مذہب و سیاست کی علیحدگی کا تصور پیدا ہوا اس کی مثال ہمیں عہد امیہ اور عہد عباسیہ میں نظر آتی ہے جبکہ علماء کا ایک طبقہ سیاست میں حصہ لینے کا شدید مخالف تھا اور اسی سبب سے حکومت کی ملازمت اختیار یا عہدے کی کوشش کرنا گناہ سمجھتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے حکومت سے علیحدہ اپنا ایک ادارہ بنایا جس کا کام مذہبی معاملات و امور کا مطالعہ کرنا اور اس میں عوام کی راہنمائی کرنا تھا۔

(ا)

اسلامی معاشرے میں جب صوفیاء کا طبقہ پیدا ہوا تو اس نے مزید اس رجحان میں اضافہ کیا اور سیاست سے قطعی طور پر کنارہ کشی اختیار کی بادشاہوں کے دربار میں جانا ان سے میل جول رکھنا' ان کی ملازمت اختیار کرنا یا حکومت کے خلاف کسی بغاوت و سازش میں حصہ لینا ان معاملات سے یہ طبقہ ہمیشہ دور رہا چونکہ صوفیاء نے اپنے کوئی سیاسی عزائم نہیں رکھے اس لیے ان کا حکمران طبقے سے کوئی سیاسی تصادم بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ سلطان وقت اپنے خلاف ذرا سی مخالفت برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لیے صوفیاء نے خود کو ہمیشہ تنازعات اور جھمیلوں سے دور رکھا۔ یہ حکومت تبدیل کرنے میں کبھی کسی کے شریک نہیں رہے۔

بہت کم ایسے واقعات ہیں کہ انہوں نے بادشاہ وقت کی کھلم کھلا مخالفت کی ہو۔ ورنہ انہوں نے ہمیشہ بادشاہ وقت کا وفادار رہنے کی پالیسی پر عمل کیا اور اپنے مریدوں کو بھی حکومت سے وفادار رہنے کی تلقین کی اس ضمن میں نظام الدین اولیاء کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جنہوں نے ہر سلطان کے زمانے میں مفاہمت کی پالیسی کو اختیار کیا۔ قطب الدین خلجی کے قتل کے بعد جب نومسلم خسرو خاں نے تخت و تاج پر قبضہ کیا تو اس وقت بھی وہ خاموش رہے بلکہ اس نے ان کی خدمت میں جو تحائف بھیجے انہوں نے انہیں بھی قبول کرلیا۔ یہی حال ان کے مرید امیر خسرو کا تھا۔ جنہوں نے ہر سلطان کے دربار میں وفاداری کے ساتھ خدمات سرانجام دیں اس رجحان کا اندازہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انہوں نے سراج الہدایہ میں لکھے ہیں:

> روئے زمین کے بادشاہ خدائے بزرگ و برتر کی برگزیدہ مخلوق ہیں ان کے حکم کی خلاف ورزی یا اہانت شروع میں کسی طرح جائز نہیں۔ پس کسی معاملے میں ظاہر یا پوشیدہ ان کی مخالفت جائز نہیں..... نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے سلطان کی اطاعت کی اور جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اللہ کی اطاعت کی وہ بخشا گیا۔ (۱)

مخدوم صاحب نے یہاں تک سلطان کی اطاعت پر زور دیا کہ اگر کوئی شخص خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے مگر حاکم کی نہیں تو اس کی اطاعت قبول نہیں ہوگی۔ (۲) ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ "مکہ اور خراسان کے مشائخ نے اس خاکسار کو وصیت کی ہے کہ ہر حال میں حکمران کا مخلص اور نیک خواہ رہنا چاہیے۔" (۳)

سلطان وقت سے وفاداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوفیاء سے حکومت کا براہ راست کبھی تصادم نہیں ہوا اور اگر سلطان وقت کو کسی کی سرگرمیوں پر ذرا بھی شبہ ہوا تو اس کو سختی سے کچل دیا گیا جلال الدین خلجی جیسے رحم دل سلطان نے جو چوروں اور ڈاکوؤں کو تو معاف کردیتا تھا مگر سید مولہ کو اس شبہ میں قتل کروادیا کہ وہ اس کے خلاف سازش میں ملوث ہیں کہا جاتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے نظام الدین اولیاء کے سیاسی عزائم کو پرکھنے کے لیے سلطنت کے بارے میں مشورے کی غرض سے ایک پرچہ بھیجا اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ:

> "فقیروں کو بادشاہوں سے کیا مطلب میں ایک فقیر ہوں شہر سے الگ ایک کونے میں رہتا ہوں۔" (۴)

ان الفاظ سے علاؤ الدین کو اطمینان ہوگیا کہ ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں اور اسی لیے اس نے ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

سیاست سے علیحدگی نے صوفیاء اور حکمرانوں میں تصادم نہیں ہونے دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں نے ان کی خوشنودی اور برکت کی خاطر ہر طرح سے ان کی خدمت کی: ان کے لیے خانقاہیں تعمیر کرائیں سرکاری خزانے سے انہیں تحفے تحائف اور وظائف دیئے اور مدد معاش کے طور پر انہیں جاگیریں دیں جس کی وجہ سے صوفیاء کے طبقے کو معاشی و مالی خوش حالی مل گئی ان کی خانقاہوں نے ان کے اثر و رسوخ کو بڑھانے میں مدد دی کیونکہ یہ خانقاہیں بہت جلد صوفیاء کے مختلف سلسلوں کا مرکز بن گئیں خانقاہ میں رہائش، کھو یہاں کے لنگر خانے سے دو وقت کا کھانا مرشد یا شیخ کی جانب سے نذر نیاز اور تحفے تحائف کی تقسیم نے ان کے گرد بہت سے مریدوں کو جمع کردیا یہ مرید خانقاہ کے ادارے کے تحفظ کی خاطر شیخ کی شخصیت کو عوام میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے اور ان کی کرامات اور ان کے زہد و تقویٰ کی کہانیاں ان کے گرد تقدس و پاکیزگی کا ہالہ کردیتی تھیں جن کی وجہ سے معاشرے میں ان کی عظمت بڑھ جاتی تھی۔

معتقدوں اور مریدوں کے ذریعے صوفیاء کی عوام میں جو مقبولیت ہوئی تو ان کے ذریعے اقتدار کی خواہش کا اظہار ایک دوسرے ذریعے سے ہوا: انہوں نے اپنی روحانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے ایک طرف تو انہیں موثر اقتدار دیا اور دوسری طرف یہ سیاسی حکمرانوں سے متصادم بھی نہیں ہوئے۔ سیاسی اقتدار کا حصول ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اس کے لیے جنگ' خونریزی' سازش اور دولت کی ضرورت ہوتی ہے' کامیابی و ناکامی ' فتح و شکست کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک ایسی سلطنت جو بغیر خوں ریزی کے خاموشی سے قائم ہوجائے' جہاں ناکامی اور شکست کا کوئی خطرہ نہ ہو اور جو اپنی باطنی و روحانی قوتوں کی وجہ سے سیاسی حکومتوں سے زیادہ طاقت ور اور بالاتر ہو' ایک ایسی سلطنت صوفیاء کے لیے مثالی تھی پھر مزید یہ کہ یہ روحانی سلطنت کوئی وحدت اور اکائی نہیں تھی بلکہ روحانی دنیا اتنی وسیع و عریض تھی کہ اس میں مختلف صوفیاء کے سلسلے اپنی اپنی سلطنتیں رکھتے تھے۔ شیخ محی الدین العربی نے اس تصور کو مزید تقویت دی کہ دنیا کے ظاہری نظام کے ساتھ ساتھ ایک باطنی و روحانی نظام بھی ہے' جو قطبوں' ابدالوں اور اوتادوں پر قائم ہے۔ احمد سرہندی کے مریدوں نے انہیں قیوم اول قرار دیا اور قومیت کے نظریہ کو اس طرح پیش کیا:

قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تمام اسمائے صفات شیونات

اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان' و حوش پرند' نباتات' ہر ذی روح' پتھر' درخت' بحر و بر کی ہر شے' عرش' کرسی' لوح' قلم ' ستارہ ' ثوابت' سورج' چاند' آسمان' بروج سب اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک و بروج کی حرکت و سکون' سمندروں کی لہروں کی حرکت' درختوں کے پتوں کا ہلنا' بارش کے قطروں کا گرنا' پھلوں کا پکنا' پرندوں کا چونچ پھیلانا' دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کنندہ آسمان کی رفتار سب اسی کے حکم سے ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو' زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا ہے' کوئی گھڑی کوئی دن ' کوئی ہفتہ' کوئی مہینہ' کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کر سکے' غلے کی پیداوار' نباتات کا اگنا غرض جو کچھ بھی خیال میں آ سکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔ (۵)

شاہ ولی اللہ نے خلافت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ظاہری و باطنی۔ ظاہری خلافت کے حدود میں جہاد کی تیاری ' سرحدوں کی حفاظت ' صدقات و محصول کی وصولیابی' مستحقین میں اس کی تقسیم ' مقدمات کے فیصلے راستوں ' سراؤں اور مساجد کی تعمیر آتے ہیں' جبکہ باطنی خلافت کی حدود میں شرائع و قوانین اسلام کی تعلیم وعظ و پندہ نصیحت اور لوگوں کو زہد و تقوی کی طرف بلانا ہے۔ (٦)

بہر حال روحانی سلطنت کا تصور ' صوفیا کے مختلف سلسلوں میں مختلف تھا۔

(۳)

صوفیا کی روحانی سلطنت کا سربراہ شیخ یا مرشد کہلاتا تھا اس کی حیثیت وہی ہوتی تھی جو سیاسی حکومت میں بادشاہ یا سلطان کی ہوتی تھی۔ یہاں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ مرید کو اپنے پیر سے اس قدر عقیدت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے پیر سے بڑھ کر (اپنے زمانے میں) کسی کو اچھا نہ سمجھے اور یہ خیال کرے کہ میرا پیر' ہی خدا رسیدہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیرو مرشد کے علاوہ کسی اور کو خدارسیدہ سمجھے تو اس پر شیطان قابض ہو جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء سے کسی نے پوچھا کہ مریدوں میں سے ایک مرید جو پانچ وقت کی نماز ادا کرتا

ہے اور پیر کی محبت دل میں رکھتا ہے دوسرا نماز پڑھتا ہے اور کثرت سے عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن پیر کی عقیدت دل میں نہیں تو ان دونوں میں سے کون اچھا ہے۔ فرمایا جو شیخ کا معتقد و محب ہے۔ (۷) روحانی و سیاسی سلطنتوں کے سربراہوں میں بڑی مماثلت ملتی ہے۔ مثلاً" اگر سلطان اپنے ملازمین و عہدے داروں کو دنیاوی آرام و آسائش فراہم کرتا ہے تو مرید اپنے مریدوں اور پیرو کاروں کو ابدی راحت کا یقین دلاتا ہے۔ سیاسی سلطنت میں سلطان سے وفاداری لازمی ہے تو اسی طرح روحانی سلطنت میں مرشد کی اطاعت ضروری ہے۔ دونوں سلطنتوں میں سربراہ سے عدول حکمی نافرمانی اور سرکشی جرائم میں سے ہے۔

روحانی سلطنت کے استحکام اور شیخ و مرشد کی عقیدت عزت و احترام نے ان کے تصورات میں اور تبدیلی کی اور وہ یہ کہ: یہ خود کو سلطان یا حکمران سے برتر سمجھنے لگے۔ اور اس نظریے کی تبلیغ کی کہ دراصل سیاسی سلطنت بھی ان کے تابع ہے اور ان کی شخصیت حکمرانوں سے اعلی و افضل ہے بلکہ درحقیت روحانی سلطنت کے سربراہ ہی دنیاوی سلطنت کے کاروبار کو چلاتے ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی دنیاوی سلطنت اور اس کا سربراہ کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا ہے۔ احمد سرہندی "رسالہ تہلیلیہ" میں لکھتے ہیں:

وہ صوفیائے کرام جو خدا پرست' صاحب کشف اور شمع بنوت سے نور حاصل کرتے ہیں زمین ان کے سہارے قائم ہے اور انہیں کے فیوض و برکات سے اہل زمین پر نزول رحمت ہوتا ہے اور انہیں کی وجہ سے لوگوں پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔ (۸)

سلاطین دہلی کے بارے میں اس قسم کے واقعات مشہور ہیں کہ انہیں ہندوستان کی سلطنت کسی صوفی یا پیر کی دعا سے ملی مثلاً" التمش' بلبن' محمد تغلق اور حسن گنگو بھمنی کے بارے میں خواجہ معین الدین چشتی' فرید الدین شکر گنج اور نظام الدین اولیاء کی پیش گوئیاں ہیں۔ (۹) سندھ کے حکمران جانی بیگ کی وفات پر تخت نشینی کے بارے میں لوگوں کے قیاسات زیر بحث تھے تو مخدوم نوح ہالائی نے اپنی مجلس میں مریدوں سے پوچھا کہ "اب کس کو تخت نشین کرنا چاہئے؟" تو ان کے مرید شیخ احمد یحیٰی نے ادب سے کہا کہ دستار سلطنت مرزا غازی کو ملنی چاہئے(۱۰) چنانچہ ان کے معتقدین کے نزدیک یہ ان کا فیصلہ تھا جس کے تحت غازی بیگ حکمران ہوا۔ ان واقعات سے جن کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ صوفیا کے پیرو کاروں نے اس تصور کو آگے بڑھایا کہ دنیاوی سلطنت کے حکمران ان کی مرضی کے بغیر تخت و تاج حاصل نہیں کر سکتے اور ان کی تخت نشینی میں دراصل ان ہی کا ہاتھ ہوتا تھا۔

اسی طرح سلطان کی سیاسی کامیابیاں' فتوحات' ملک کی فارغ البالی اور امن و امان بھی ان ہی کے دم سے تھی۔ محمود غزنوی کی فتوحات خواجہ ابو محمد چشتی کی دعاؤں کا نتیجہ تھیں' شہاب الدین غوری کی کامیابی معین الدین چشتی کی وجہ سے ہوئی علاؤ الدین خلجی کی فتوحات نظام الدین اولیاء کی کرامات کا کرشمہ تھیں اور مغلوں کی کامیابی و فتح مندی غوث گوالیاری کی اعانت سے ہوئی۔

روحانی سلطنت کی جڑیں آہستہ آہستہ اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ خود سلاطین بھی ان کی برتری کے قائل ہو گئے اور مشکل معاملات میں ان سے اعانت کے طلب گار ہونے لگے مثلاً" دہلی میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا تو اس موقع پر التمش نے صوفیاء سے مخاطب ہو کر کہا: "ظالم کا فتنہ رفع کرنا بادشاہوں کا کام ہے میں اس کام میں کوتاہی نہیں کرتا حق تعالٰی کی طرف سے باطن اور خلق کی بہتری کے لیے دعا کرنا آپ کا حق ہے۔" (۱۱)

اگر کبھی روحانی سلطنت اور سیاسی سلطنت کے سربراہ میں تصادم ہوا تو اس کے نتیجے میں سیاسی حکمران ہمیشہ ان کی بد دعا کا شکار ہوا۔ یہ واقعات اس قدر عام ہوتے کہ حکمران ان کی بد دعاؤں سے خوفزدہ رہتے تھے۔ مثلاً" نظام الدین اولیاء کے ستانے کے نتیجے میں قطب الدین خلجی کا قتل ہوا۔ (۱۲) نظام الدین اولیاء ہی سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ غیاث الدین تغلق نے جب بنگال سے واپسی پر انہیں کہلا بھیجا کہ وہ اس کے آنے تک دلی چھوڑ دیں تو انہوں نے کہا "ہنوز دلی دوراست " اور سلطان دلی سے باہر ہی محل کے گرنے سے مر گیا ان واقعات کی شہرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران صوفیاء کی شخصیت سے مرعوب ہو گئے اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی خانقاہوں میں حاضری دینے لگے وہ ان کی خوشنودی اور دعاؤں کے خواہش مند رہتے تھے اور بددعاؤں سے ڈرتے تھے۔

(۳)

سیاسی سلطنت اور صوفیاء کی روحانی سلطنت کی ساخت میں فرق تھا۔ مثلاً" سیاسی سلطنت کا سربراہ اور حکمران صرف ایک شخص ہی ہو سکتا تھا اگر ایک سے زیادہ امیدوار ہوتے تو فیصلہ طاقت کے ذریعے ہوتا تھا لیکن روحانی سلطنت میں بیک وقت کئی سلسلوں کے مرشد یا شیخ سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر سلسلے کا شیخ اپنی سلطنت کو مختلف ولایتوں میں تقسیم کر کے وہاں اپنے خلفاء کا تقرر کرتا تھا صوفیاء کے سلسلوں کے مرشدوں اور خلفاء میں اقتدار کی کوئی جنگ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ جب بو علی قلندر پانی پت میں آئے تو شمس الدین ترک نے جو پہلے سے وہاں مقیم

تھے ان کے پاس دودھ سے بھرا ہوا پیالا بھیجا وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور اس پر پھول کی چند پتیاں ڈال دیں جب شمس الدین نے یہ دیکھا تو کہا: میری مراد دودھ کے پیالے سے یہ تھی کہ یہ ملک میرے شیخ نے مجھے دیا ہے اس میں آپ کی گنجائش نہیں لیکن انہوں نے کہا کہ میں یہاں پھول کی پتیوں کی طرح رہوں گا۔ (۱۳)

چنانچہ کئی سلسلوں کے خلفاء اپنے اپنے سلسلوں کی جانب سے ایک ہی ولایت کے انچارج ہوتے تھے لیکن ایک ہی سلسلے کے خلفاء ایک دوسرے کی ولایت میں دخل نہیں دیتے تھے۔ مثلاً" جب فیروز شاہ تغلق ٹھٹھہ سے چلا اور سرستی پہنچا تو شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی نے سلطان سے کہا: ٹھٹھہ سے یہاں تک میں نے دعا کی اور بادشاہ مع لشکر اور خزانے کی خیریت سے پہنچ گیا اب یہاں سے قطب الدین منور کی ولایت شروع ہوتی ہے لہذا اب ان کی خدمت میں لکھ کر اجازت طلب کی جائے۔ (۱۴)

(۵)

مرشد یا شیخ کی عظمت کو بڑھانے کے لیے ان کے تذکروں میں خاص طور سے ان کی خاندانی حیثیت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اکثر بڑے بڑے صوفی شیخ و مرشد جنہوں نے صوفیاء کے سلسلوں کی بنیاد رکھی ان کا تعلق خاندان سادات سے بتایا گیا ہے۔ تاکہ ان کی شخصیت کو ان کے سارے مزید ممتاز بنایا جائے اور انہیں عام مسلمانوں سے بلند مرتبت ظاہر کیا جائے اس خاندانی تعلق کی وجہ سے ان کے مریدوں اور معتقدوں میں ان کی ذات اور شخصیت کا اثر بیٹھ جاتا تھا۔

(۶)

روحانی سلطنت کے ادارے کو مستحکم کرنے کی غرض سے رسومات و روایات کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان میں سب سے اہم رسم بیعت کی تھی۔ جب ایک مرید اپنے مرشد سے بیعت کرتا ہے تو وہ مرشد کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوجاتا ہے اور اس کے لیے یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی اطاعت کرے اور مرشد کے سلسلے کی روایت کی پابندی کرے' بیعت کی رسومات ہر سلسلے کی علیحدہ علیحدہ تھی مثلاً" چشتیہ سلسلے میں بیعت کے وقت مرید کے کان کے قریب تھوڑے سے بال کاٹ دیئے جاتے تھے اور مرید کو سلسلے کی ٹوپی پہنائی جاتی تھی۔ (۱۵)

بیعت کی رسم کے پس منظر میں جو مقاصد کارفرما تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ مرید کو مرشد

اور اس کے سلسلے میں ذہنی طور پر جکڑ لیا جائے تاکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو اور سلسلے کی قوت و طاقت بڑھے۔

(۷)

مرشد کی مجلسوں میں بھی بادشاہ یا سلطان کے دربار کا نقشہ نظر آتا ہے۔ یہاں جو آداب و رسومات تھیں، ان میں اور بادشاہ کے دربار کے آداب و رسومات میں مماثلت تھی، مثلاً مرشد یا شیخ سب سے علیحدہ، ممتاز جگہ پر مسند پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ اسی طرح جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا۔ مجلس میں آنے والا ہر شخص خاموشی سے آتا اور مرشد کے سامنے جھک کر، مرشد کے ہاتھ پیر، یا آستین چومتا یا بعض حالات میں مرشد کے سامنے سجدہ کرتا اور اس کے قدموں پر سر رکھتا۔ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں جب مرید آتے تو زمین بوسی کرتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ چونکہ میرے شیخ کے روبرو ان کے مرید ایسا کرتے تھے اس لیے میں انہیں منع نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ ان کی مجلس میں ایک مسافر شام یا روم سے آیا جب اس نے مریدوں کو سجدہ کرتے دیکھا تو مریدوں کو ڈانٹا کہ سجدہ مت کرو کیونکہ شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں، اس پر نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ گذشتہ امتوں میں سجدہ مستحب تھا چنانچہ رعایا بادشاہ کو اور امت پیغمبروں کو کرتی تھی۔ حضور ﷺ کے زمانے میں اس کا مستحب ہونا جاتا رہا۔ لیکن یہ مباح ہے اور مباح کو روکنا جائز نہیں۔ (۱۶) مرشد کی مجلسوں میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ خاموشی سے بیٹھا جائے نگاہیں نیچی رہیں، دائیں بائیں نہ دیکھیں، کسی سے بات نہ کریں زور سے نہ کھانسیں، ہنسیں نہیں مرشد کی طرف پشت نہ ہو وغیرہ وغیرہ نظام الدین اولیاء کے مریدوں کا کہنا تھا کہ جب وہ ان کی مجلس میں ہوتے تھے تو ان کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھیں۔ (۱۷) مرشد خاص خاص لوگوں کی آمد پر کھڑے ہو کر استقبال کرتا تھا ورنہ مسند پر ہی بیٹھا رہتا تھا اس کے علاوہ یہ بھی دستور تھا کہ آنے والا مرشد کی خدمت میں عقیدت کے اظہار کے طور پر انہیں نذر پیش کرتا تھا۔ (۱۸)

اس کے علاوہ ان میں اور بادشاہ میں کئی لحاظ سے مماثلت تھی، جس طرح بادشاہ کی خدمت کے لیے کئی کئی ملازم اور خادم موجود ہوتے تھے اسی طرح شیخ کی خانقاہ میں بھی اس کے ذاتی کاموں کے لیے مریدوں کے فرائض ہوتے تھے جیسے وضو کرانا، مصلیٰ کی خدمت سنبھالنا اور ان کے کھانے اور کپڑوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرنا۔ (۱۹)

جس طرح بادشاہوں کے لکھنے کے لیے دربار میں مورخ ہوتے تھے اسی طرح شیخ کے

حالات زندگی اور اس کے اقوال ان کے مرید لکھتے تھے جو ملفوظات کے نام سے مشہور ہوئے ان کی خانقاہوں کو بادشاہوں کے محلات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے ' مرنے کے بعد ان کے شاندار مقبرے تعمیر ہوتے تھے جہاں عوام زیارت اور برکت کی غرض سے آج تک جاتے ہیں۔

(۸)

مرشد اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین منتخب کرتا تھا تاکہ اس کا سلسلہ بغیر کسی سربراہ کے نہ رہ جائے۔ اس جانشینی کا بھی کوئی خاص قانون نہیں تھا۔ یہ جانشین کوئی بھی مرید ہو سکتا تھا۔ سہروردیہ سلسلے کے بزرگ بہاؤالدین زکریا نے اپنے بعد اپنے لڑکے شیخ صدر الدین کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ ہندوستان میں موروثی سجادہ نشین کی یہ پہلی مثال تھی۔ (۲۰) اس کے بعد دوسرے سلسلوں میں بھی یہ رسم چل نکلی۔

جانشینی کے وقت اپنے جانشین کو اپنی خاص خاص چیزیں بطور علامت عطا کرتا تھا' جیسے سجادہ ' خرقہ' دستار' کھڑاؤں' عصاء' قمیض اور چادر خواجہ معین الدین چشتی نے جب قطب الدین بختیار کاکی کو خلافت عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا تو ان کے سر پر دستار باندھی' زرہ پہنائی اور اپنے مرشد کا مصلی اور قرآن انہیں دیا۔ نظام الدین اولیاء نے اپنے جانشین و خلیفہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کو خرقہ' عطائے مصلی تسبیح اور لکڑی کا پیالہ دیا۔ جو انہیں اپنے مرشد فرید الدین گنج شکر سے ملا تھا (۲۱) سجادہ نشینی کی رسم و تاجپوشی سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس رسم کے بعد ہی ان کی حیثیت شیخ یا مرشد کی ہوتی تھی۔

(۹)

مرشد اپنی روحانی سلطنت کو مختلف ولایتوں میں تقسیم کرکے وہاں انتظام و انصرام کے لیے اپنے خاص خاص مریدوں کو خرقہ عطا کرکے' بطور خلیفہ ان کا تقرر کرتے تھے خلیفہ مقرر کرنے کے تین طریقے تھے : خدا کی طرف سے الہام ہو کہ فلاں مرید کو خلیفہ بناؤ' شیخ اپنے مرید کے احوال کو دیکھ کر فیصلہ کرے یا مرید سفارش کے ذریعے یہ منصب حاصل کرے۔ (۲۲) خلافت کی باقاعدہ سند دی جاتی تھی اور اس کو یہ اختیار بھی دیا جاتا تھا کہ وہ دوسروں کو خلافت دینے کا اہل ہے۔ خلیفہ کی طرف سے کوتاہی کی صورت میں اس سے "خلافت نامہ" واپس بھی لیا جاسکتا تھا۔ (۲۳) مسند خلافت ملنے کے بعد اسے ساتھیوں اور حاضرین کی جانب سے مبارک باد دی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے علاقے میں چلا جاتا اور اس علاقے کا

روحانی سربراہ بن جاتا۔

(۱۰)

خلافت عطا کرتے وقت مرشد یا خلیفہ کو خطاب بھی عنایت کرتا تھا ان خطابات میں بھی سیاسی سلطنت کے اثرات نظر آتے ہیں کیونکہ جس طرح سلاطین کے خطابات دین پر ختم ہوتے تھے صوفیاء کے خطابات بھی اسی طرح کے ہوتے تھے جیسے معین الدین، جلال الدین، نصیرالدین اور نظام الدین وغیرہ ان کے علاوہ مریدوں اور معتقدوں کی جانب سے مرشد کو پرعظمت خطابوں سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ جیسے:

سلطان اولیاء، محبوب سبحانی، غوث الاعظم، شیخ محی الدین، عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ الشیوخ، شہاب الملت، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ المشائخ، شیخ ضیاء الدین، معین الاولیاء، سلطان کشور کشائے ولایت و کرامت، خواجہ معین الدین حسن چشتی، قطب المشائخ، خداوند خلافت عظمیٰ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، سلطان التارکین، شیخ حمید الدین صوفی۔

(۱۱)

صوفیاء کی روحانی سلطنت اور بادشاہ کی سیاسی سلطنت میں مماثلت اور تضاد دونوں ہی ملتے ہیں لیکن ان دونوں سلطنتوں کا انجام مختلف ہوا۔ بادشاہتیں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی چلی گئیں۔ اور زمانے نے بادشاہوں کی مطلق العنانیت کا خاتمہ کردیا لیکن روحانی سلطنت آج بھی قائم ہے اور ایک مستحکم ادارے کی حیثیت سے موجود ہے، مرشد اور شیخ آج بھی مطلق العنانیت کے ساتھ مریدوں کے ذہنوں پر حکومت کرتے ہیں اور ان کی رعیت آج بھی تحفے تحائف اور نذر و نیاز کی شکل میں انہیں خراج دیتی ہے۔ ان کی مجلسوں اور محفلوں کے آداب آج بھی وہ ہیں جو بادشاہوں کے دربار میں تھے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس روحانی سلطنت کی بھی تسخیر کی جائے۔

○

حوالہ جات

(۱) محمد ایوب قادری: مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ کراچی۔ ۱۹۶۳ء۔ ص۔ ۱۳۲
(۲) ایضاً: ص۔ ۱۳۳
(۳) ایضاً: ص ۔ ۱۳۳
(۴) صباح الدین عبدالرحمان: بزم صوفیہ۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۹ء۔ ص۔ ۱۹۸
(۵) روضہ القیومیہ۔ جلد اول۔ ص ۔ ۹۳۔ بحوالہ : شیخ محمد اکرم رود کوثر چوتھا ایڈیشن، لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ص۔ ۱۹۸
(۶) سید محمد مبارک میر خورد: سیر الاولیاء (اردو ترجمہ) لاہور (؟) ص۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰
(۷) ایضاً : ص۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴
(۸) رود کوثر ص۔ ۲۴۷
(۹) منہاج سراج : طبقات ناصری۔ حصہ اول (اردو ترجمہ لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۷۸۴
خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت۔ اسلام آباد (؟) ص ۔ ۲۰۳
(۱۰) حسام الدین راشدی : مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب۔ کراچی ۱۹۷۰ء ص۔ ۲۰
(۱۱) حامد بن فضل اللہ جمالی : سیر العارفین (اردو ترجمہ) لاہور۔ ۱۹۷۶ء ص۔ ۱۵۱ ۔ ۱۵۵
(۱۲) بزم صوفیہ : ص ۔ ۲۰۵
(۱۳) ایضاً : ص ۔ ۲۴۲
(۱۴) خلیق احمد نظامی: سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۳۹۳
(۱۵) بزم صوفیہ : ص ۔ ۵۰۰ ۔ ۵۰۱
(۱۶) سیر الاولیاء ص ۔ ۲۹۸ ۔ ۲۹۹
(۱۷) ایضاً : ص۔ ۱۱۲
(۱۸) سیر العارفین ص ۔ ۱۰۲ ۔ ۲۵۹
بزم صوفیہ ص ۵۱۷، ۵۱۸
(۱۹) تاریخ مشائخ چشت ص ۔ ۲۸۷
(۲۰) رود کوثر ص۔ ۲۴۳

(۲۱) سیر العارفین ص۔ ۴۰

(۲۲) سیر الاولیاء ص۔ ۳۰۳ ۔ ۳۰۴

(۲۳) تاریخ مشائخ چشت ص۔ ۲۴۶ ۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹

ہندوستان میں اسلام کیسے پھیلا؟

مذاہب کی تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی بھی مذہب محض اپنی تبلیغ کے سہارے ایک آفاقی مذہب نہیں بن سکا جب تک کہ اس کی ترویج و تبلیغ کے لیے سیاسی طاقت کو استعمال نہ کیا گیا ہو اس کے پیروکاروں میں اس وقت اضافہ ہوا جب کسی سیاسی اقتدار کے ذریعے اس کی حمایت کی گئی اس کی مثال بدھ مذہب سے دی جاسکتی ہے جس کی عالمگیر اشاعت اس وقت ہوئی جب اشوک نے اسے اختیار کیا اور حکومت کے ذرائع استعمال کرکے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اس کی اشاعت کی۔ عیسائیت کو اسی وقت فروغ ہوا جب قسطنطین نے اسے قبول کیا۔

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں جہاں اسلامی فتوحات ہوئیں اور جو جو ممالک فتح ہوئے وہاں سیاسی قوت کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی استحکام ملتا رہا۔ عراق' شام' ایران اور مصر میں حکمران جماعتوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کیا لیکن شکست کے بعد ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ مسلمان ہوکر اپنی مراعات اور جائیدادوں کو بچائیں اور فاتح جماعت کا ساتھ دے کر حکمران اداروں میں ان کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ چنانچہ فتح ایران کے بعد وہاں کی دہقان جماعت جو زمینداروں اور جاگیرداروں پر مشتمل تھی سب سے پہلے مسلمان ہوئی اور اپنی وہ تمام مراعات برقرار رکھیں جو ساسانی عہد میں ان کے لیے مخصوص تھیں یہ اس طبقے کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنی جائیداد کے تحفظ کے لیے ہمیشہ حالات سے سمجھوتہ کیا ہے ان کے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی ان کی رعیت جو نظام جاگیرداری میں ان کی ملکیت ہوتی تھی اپنے آقا کے مذہب میں شامل ہوگئی۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے بارے میں ایک بات بڑے وثوق سے کہی جاتی ہے اور اسے اسی طرح بغیر سوچے سچ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیاء کے ذریعے پھیلا۔ کیا در حقیقت صرف صوفیاء نے ہندوستان میں اسلام پھیلایا؟ یا یہ ان کے معتقدوں اور مریدوں کا محض پروپیگنڈا ہے' اس مقالے کا مقصد اس کا تجزیہ کرنا ہے۔

اسلام میں جب ملوکیت قائم ہوئی تو بادشاہوں اور حکمرانوں نے علماء' صوفیاء اور مشائخ کے اثرات کو کم کردیا۔ انہیں یا تو مراعات دے کر اپنا ہمنوا بنالیا' یا اقتدار سے محروم کر کے بیکار کردیا' اقتدار سے محرومی کے بعد رد عمل کے طور پر اس طبقہ نے اپنی ایک علیحدہ اور آزادانہ حیثیت قائم کی اور خود کو بادشاہوں پر فوقیت دینے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے اور اس بات کی کوشش کی کہ عوام کے ذہنوں میں اس بات کو راسخ کیا جائے کہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار' لوگوں کے اخلاق کی تربیت کرنے والے اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلانے والے صرف وہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں مذہب کو قائم کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے معاشرے میں دو متوازی رجحانات اور جماعتیں پیدا ہوئیں : ایک وہ جو حکومت و سلطنت پر قابض تھے اور سیاسی اداروں کے مالک تھے ' دوسری صوفیاء کی جماعت جو غیر سیاسی تھی لیکن جنکی علیحدہ روحانی سلطنت تھی' اور جن کی علیحدہ رعیت تھی' جو ان کی شخصیت اور کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں ہندوستان میں اشاعت اسلام کے کارنامے کو بھی ان سے منسوب کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہاں مسلمان حکمرانوں نے دین اسلام کی اشاعت کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے صوفیاء و علماء کی اشاعت اسلام میں مدد کی۔ یہ صرف ان کی انفرادی کوششیں تھیں کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ یہاں اس مفروضے کو رد کرتے ہوئے دلائل کے ذریعے اسلام کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ہندوستان میں ، اسلام اول جنوبی ہندوستان میں تاجروں کے ذریعے پھیلا پھر سندھ میں عربوں کی فتح کے بعد اور آخر میں ترکوں کی فتح کے بعد شمالی ہندوستان میں آیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں جو مذہبی' سیاسی سماجی' اور اقتصادی حالت تھی اس کی بنیاد ذات پات تھی۔ معاشرے کے مختلف طبقے مختلف ذاتوں ' اور طبقوں میں تقسیم تھے۔ اب ذات پات کی تقسیم میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی شخص اپنی صلاحیت کے ذریعے معاشرے میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر سکے۔ یہاں انسان کی پیدائش ہمیشہ کے لیے اسے ایک نہ تبدیل ہونے والا سماجی مقام اور مرتبہ دیتی تھی۔ جس سے چھٹکارا پانا یا تبدیل کرنا اس کے لیے ایک ناممکن امر تھا۔ اس سارے ڈھانچہ کی بنیاد مذہبی روایات پر تھی جو ذہن میں اس قدر راسخ تھیں کہ ان سے بغاوت کرنا یا ان سے انحراف کرنا ایک ناممکن امر تھا چونکہ اس کے سامنے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اس لیے وہ اس نظم کے بندھنوں میں اسیرو گرفتار رہنے پر مجبور تھے' لیکن جب اسلام ان کے معاشرے میں آیا تو ان کے لیے

ایک راستہ نکل آیا' چنانچہ جنوبی ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے شیخ زین الدین معبری نے "تحفتہ المجاہدین" میں لکھا ہے۔

؟ ہنود میں رسم و رواج کی بندشیں اور ذات پات کی پابندی مدت سے قائم تھیں۔ اگر اعلیٰ ذات کا کوئی ہندو کسی ادنیٰ ذات کے آدمی سے چھو جاتا' حد مقررہ سے قریب ہوجاتا' تو غسل کے بغیر کھانا کھانا اُسے جائز نہیں اگر بغیر غسل کھا لیتا ہے تو اپنی ذات سے باہر ہوجاتا ہے ادنیٰ ذات والوں کا پکایا ہوا کھانا اعلیٰ ذات والوں کے منع ہے۔ اگر اعلیٰ ذات کا کوئی مرد کسی ادنیٰ ذات کی عورت سے شادی کرتا ہے یا کسی اعلیٰ ذات کی عورت کے ساتھ ادنیٰ ذات کے مرد کی شادی ہو جاتی ہے تو اعلیٰ ذات والا اپنی ذات سے خارج ہوجاتے ہے۔ (۱)

اسی طرح جب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے رسم و رواج کے خلاف کوئی فعل سرزد ہوجاتا تو بد نامی سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر لیتے تھے۔ محمود بنگلوری کتاب نے ملیبار کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ

رسم و رواج کے خلاف نائر جب کسی فعل کے مرتکب ہوتے تو اس بد نامی سے بچنے کے لیے یا تو وطن چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جاتے جہاں ان سے کوئی واقف نہیں ہے یا اسلام قبول کر لیتے ہیں پولیوں کے لیے بھی اس ذلت سے بچنے کا طریقہ صرف قبول اسلام ہے۔ (۳)

جنوبی ہند میں نائر اعلیٰ ذات والے تھے جب کہ پولی ادنیٰ ذات کے تھے اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام سے پہلے اس رسم و رواج سے چھٹکارا پانے کی ایک ہی صورت جلا وطنی تھی ' اسلام کے بعد جلا وطنی کے ساتھ عقیدہ کی تبدیلی کی بھی آزادی ملی۔ چونکہ وطن چھوڑ کر جانا ہر ایک کے لیے مشکل ہوتا تھا اس لیے جب مسلم تاجر وہاں آئے اور انہوں نے اپنی بستیاں علیحدہ سے بسائیں تو اس صورت میں ان کے لیے یہ آسان طریقہ تھا کہ اسلام قبول کر کے ان کے معاشرے کا ایک حصہ بن جائیں۔

اس کے علاوہ جنوبی ہند میں تاجروں کے آمد ' رہائش ' میل جول' شادی بیاہ' کنیزوں کی خریداری اور ان سے اولاد کا ہونا وہ ذرائع تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا' ان حقائق اور شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کا سہرا تاجروں کے سر ہے صوفیاء کے نہیں۔

جنوبی ہند کے بعد مسلمانوں کی آمد سندھ میں بحیثیت فاتح ہوئی جہاں انہوں نے سیاسی اقتدار قائم کیے۔ محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والوں میں اگرچہ ہر طبقے کے لوگ تھے۔ لیکن اکثریت بہرحال فوجیوں کی تھی اور سندھ میں اس وقت اسلام پھیلا جب یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ سندھ کے سردار یکے بعد دیگرے محمد بن قاسم کے پاس آئے اور اس لیے مسلمان ہوئے تاکہ ان کی قدیم حیثیت باقی رہے۔ اور وہ معاشرے میں اپنی قدیم مراعات کو برقرار رکھ سکیں۔ اس لیے جب حکمران طبقہ مسلمان ہوا تو عام لوگوں نے بھی ان کی پیروی کی اور اس کے مذہب میں شامل ہوگئے۔

شمالی ہندوستان میں بھی اگرچہ مسلمان بحیثیت فاتح آئے تھے اس کے باوجود یہاں کی اکثریت کو مسلمان نہیں کرسکے' کیونکہ اس علاقے میں برہمن ازم کی جڑیں انتہائی مضبوط تھیں' اور اس نے اسلام کا مقابلہ قوت کے ساتھ کیا' دوسرے شمالی ہندوستان میں برہمن مراعات یافتہ طبقہ تھا جس کی مراعات کی بنیاد مذہب پر تھی' اس لیے اس نے اپنی مراعات اور اپنی حیثیت کے تحفظ کے لیے اپنے پیروکاروں کو مذہب پر برقرار رکھا اس لیے یہاں جو تبدیلی مذہب ہوئی وہ ادنیٰ ذات کے لوگوں میں ہوئی۔

اگر ہندوستان میں اشاعت اسلام کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ملتی ہیں:

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے کے بعد ایک طبقہ ان مفاد پرست لوگوں کا تھا جو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلمان حکومت سے تعاون کرنا چاہتے تھے اس لیے اس طبقے نے اپنی وفاداری کے اظہار کے طور پر اسلام قبول کرلیا' جس کی وجہ سے انہیں حکومت کی ملازمتیں' عہدے اور مناصب ملے۔

(۲) دوسرے جاگیرداروں اور زمینداروں کا طبقہ تھا جو اپنی جاگیروں کا تحفظ چاہتے تھے اور یہ تحفظ تب ہی مل سکتا تھا جب وہ مسلمان ہوجاتے۔

(۳) وہ لوگ تھے جو فاتحین کی لوٹ مار سے محفوظ رہنے کے لیے مسلمان ہوئے تاکہ ان کی جان و مال اور عزت کا تحفظ ہوسکے۔

(۴) نچلی ذات کے لوگ اسی امید میں مسلمان ہوئے کہ اس صورت میں ان کا سماجی مرتبہ بڑھ جائے گا اور مسلمان معاشرے میں انہیں کوئی باعزت مقام مل سکے گا۔

(۵) وہ لوگ جو اپنی ذات و برادری سے خارج کردیئے گئے تھے انہوں نے اسلام قبول کرکے مسلمانوں میں پناہ لی۔

(۶) وہ لوگ بھی مسلمان ہوئے' جن پر آپس کے میل جول کے اور خیالات کے تبادلے کا اثر ہوا۔

(۷) ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد خاص دینی جذبے کے تحت مسلمان ہوئے۔

اشاعت اسلام کے ضمن میں جو یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ' غلط ہے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے قائم ہونے کے بعد ہی یہاں مسلمانوں کی تعداد بڑھی حکومت کو اس سے دلچسپی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھے تاکہ ان کی حکومت کو استحکام ملے اس کے علاوہ حکمرانوں کو حکومت چلانے کے لیے فوج اور دوسرے اداروں میں ان لوگوں کی ضرورت تھی جن پر وہ اعتماد کرسکیں ہم مذہب ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ ان کے لیے زیادہ مفید ہوسکتے تھے اس لیے انہوں نے جہاں جہاں ہوسکا نئے علاقوں کی فتح کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مسلمان کیا جائے چنانچہ اکثر جنگ کے بعد قیدیوں کی ایک بڑی تعداد قتل کے ڈر سے مسلمان ہوجاتی تھی وہ لوگ جو جنگ میں غلام بنائے جاتے تھے یا جنہیں بچپن سے غلام بنا کر بیچا جاتا تھا وہ مسلمان ہوجاتے تھے مثلاً" ایسے مشہور غلاموں میں ملک کافور علاؤ الدین کا غلام تھا اور ملک خسرو جو قطب الدین خلجی کا غلام تھا یہ دونوں ہندو سے مسلمان ہوئے انہوں نے مسلمان حکمرانوں کی جانب سے جنگیں لڑیں ہندوؤں کو قتل کیا اور نئے نئے علاقے فتح کرکے انہیں سلطنت میں شامل کیا مسلمان ہونے والوں میں بہت سے سیاسی قیدی یا مشہور راجہ اور سردار ہوا کرتے تھے جن کے سامنے یہ شرط رکھی جاتی تھی کہ مسلمان ہوجاؤ ورنہ قتل کردیئے جاؤ گے۔ یہ تاریخی حقائق ہیں کہ پنجاب کے گکھر' معزالدین غوری کے زیر اثر مسلمان ہوئے ان کا سردار جب گرفتار ہوکر آیا تو اس سے کہا گیا کہ اگر وہ مسلمان ہوجائے تو اس کا علاقہ اور جائیداد اسے واپس مل جائیں گی اسے یہ ترغیب بھی دی گئی کہ وہ اپنے قبیلے کو بھی مسلمان کرے۔ (۴) عہد خلجی میں نو مسلموں کو بادشاہ کی جانب سے تحفے تحائف دیئے جاتے تھے تاکہ دوسروں کو اس سے ترغیب ہو۔ فیروز شاہ تغلق نے ان لوگوں کو جزیے سے معافی دے دی جو مسلمان ہوگئے۔ (۵)

اورنگ زیب کے زمانہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ سردار' زمیندار' یا جاگیردار زمین و جائیداد کے تحفظ کی خاطر مسلمان ہوئے۔ کانپور ڈسٹرکٹ کے کئی راجپوت زمیندار اسی طرح مسلمان ہوئے۔ (۶) جس طرح قبیلوں کے سرداروں اور زمینداروں نے

اپنی مراعات کی خاطر اسلام قبول کیا اسی طرح ان کی رعایا اپنے سردار کے ساتھ مسلمان ہو گئی' کیونکہ اس کی خوشنودی کے بغیر ان کی زندگی بھی محال تھی۔

صوفیاء کی وجہ سے جو تھوڑی بہت اشاعت اسلام ہوئی اس میں بھی سلاطین برابر کے شریک تھے کیونکہ انہوں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ انہوں نے مدد معاش کے طور پر جاگیریں دیں جائیں۔ اور ان کے لیے خانقاہیں تعمیر کرائی جائیں۔ ان سہولتوں سے انہیں یہ فرصت ملی کہ انہوں نے علمی و مذہبی کام کئے اور اطمینان سے عبادت میں مصروف رہے۔

صوفیاء کے تذکروں میں جہاں لوگوں کے مسلمان ہونے کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہاں ان کے اخلاق و کردار سے زیادہ ان کی کرامات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جوگیوں اور برہمنوں سے مقابلہ کیا۔ آگ میں سے گزرے پانی پر چلے۔ ہوا میں اڑے اور اسی طرح کی کرامات دکھا کر اپنے مذہب کی برتری قائم کی اور آخر میں اپنے مخالفین کو شکست دے کر فتح یاب ہوئے اور ان کے ان کارناموں سے متاثر ہو کر لوگ مسلمان ہوئے۔

ہم ہندوستان میں صوفیاء کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں' ایک وہ صوفی جو مذہبی لحاظ سے تنگ نظر تھے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے' اس لیے ایسے صوفیاء کا ہندوؤں کو اپنے اخلاق سے متاثر کرنا ایک مشکل کام تھا۔ کیونکہ جب تک دوسروں کے عقائد کا احترام نہیں کیا جائے اس وقت تک انہیں کسی بھی طرح متاثر نہیں کیا جاسکتا ہے دوسرے وہ صوفی تھے جو وحدت الوجود کے ماننے والے تھے اور جن کی نظر میں مذہب و عقیدے کی عزت تھی۔ یہ صوفی ذہنی لحاظ سے وسیع المشرب تھے اور نبی نوع انسان کو ایک ہی لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندو' مسلمان' بدھ اور عیسائی سب برحق تھے۔ ان صوفیاء نے ہندوستان میں ہندو مسلم اشتراک کی تحریک چلائی۔ چشتیہ' قادریہ' امدادیہ اور غوثیہ سلسلوں کے صوفیاء نے اس بات کی کوشش کی کہ تمام مذہبوں میں یک جہتی کے اصول تلاش کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے انہوں نے اس قسم کی کوئی تحریک نہیں چلائی کہ لوگوں کو ان کے مذہب سے چھڑا کر انہیں مسلمان کیا جائے۔

ہندوستان میں بہت سے قبائل اور برادریاں اس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات ایک خاص مقصد کے تحت وضع کی گئیں ہیں۔ اس ذریعے سے وہ شائد اس بات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں کہ وہ کسی لالچ اور جبر کے تحت مسلمان ہوئے ہوں' یا خود کو ان بزرگ سے منسوب کرکے مسلمان معاشرے میں بہتر مقام پیدا کرنا چاہتا ہوں مثلاً" انور کے خانزادے اس بات کا

دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا جدامجد ناصر بہادر فیروز شاہ تغلق کے عہد میں قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھوں مسلمان ہوا جب کہ دونوں شخصیتوں کے عہد میں تقریباً دو سو برس کا فرق ہے۔ (۷)

اس کے علاوہ صوفیاء کا دنیا کے بارے میں ایک علیحدہ رجحان تھا۔ وہ دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر خانقاہوں میں اپنا زیادہ وقت عبادت ذکر مراقبہ اور چلہ کشی میں گزارتے تھے۔ اس لیے انہوں نے باضابطہ طریقے سے نہ تو اشاعت اسلام کی اور نہ تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

اس لیے یہ کہنا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت صوفیاء کے اخلاق و کردار سے ہوئی ایک مبالغہ آمیز بیان ہے۔ ہندوستان میں اسلام صرف اسی وقت پھیلا جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ اشاعت اسلام میں حکومت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مذہبی' سیاسی' ثقافتی' اقتصادی اور سماجی حالات کا بھی بڑا دخل ہے۔

○

حوالہ جات

(۱) محمود بنگلوری: تاریخ جنوبی ہند ۔ لاہور ۔ ۱۹۴۷ء ۔ ص ۔ ۵۷

(۲) ایضاً: ص ۔ ۵۸

(۳) ایضاً: ص ۔ ۵۸

(۴) ٹامس آرنلڈ: پریچنگ آف اسلام ۔ لاہور (؟) ص ۔ ۲۵۸

(۵) ایضاً: ص ۔ ۲۵۵

(۶) ایضاً: ۳۲۲

(۷) محمد مخدوم تھانوی مرقع الور ۔ آگرہ ۱۸۷۶ء ۔ ص ۔ ۱۷ ۔ ۱۸

معاشرہ' عورت اور بہشتی زیور

جاگیردارانہ معاشرے میں عورت کی حیثیت ہمیشہ ملکیت کی ہوتی ہے۔ جہاں اس کی آزادی' حقوق اور رائے مرد کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ اس معاشرے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسی اقدار کو فروغ دیا جائے جن کے ذریعے عورتوں کو مرد کا تابع اور فرماں بردار رکھا جائے اور اس کی آزادی کے تمام راستے مسدود کر دیئے جائیں۔

ہندوستان میں مسلمان معاشرہ' دو طبقوں میں منقسم تھا۔ ایک اشراف یا امراء کا طبقہ اور دوسرا اجلاف اور عوام کا۔ طبقہ اعلیٰ نے جو ثقافتی و اخلاقی اقدار تخلیق کیں مثلاً" ناموس' عزت' عصمت ' شان و شوکت اور آن بان کے لئے بہترین قیمتی سازوسامان ' ہیرے جواہرات' ہاتھی گھوڑے اور محلات رکھتا تھا۔ عمدہ کھانا کھاتا اور نفیس لباس استعمال کرتا تھا وہ اسی طرح اپنے حرم میں خوبصورت عورتیں جمع کرتا تھا جیسے دوسری قیمتی اشیاء اور جس طرح وہ قیمتی اشیاء کی حفاظت کرتا تھا اسی طرح بیگمات کی حفاظت کی غرض سے اونچی اونچی دیواروں کی محل سرائیں تعمیر کراتا تھا اور پہرے پر فوجی و خواجہ سرا رکھا کرتا تھا۔ ان پر پردے کی سخت پابندی ہوتی تھی تاکہ دوسروں کی ان پر نظر نہ پڑے ۔ اس نے ناموس حرم "عزت' خاندانی وقار" کی اقدار پیدا کیں۔ ان جاگیردارانہ اقدار نے معاشرے کے متوسط طبقے کو بھی متاثر کیا' لیکن عوام کی اکثریت ان اقدار کو نہیں اپنا سکی کیونکہ معاشی ضروریات انہیں اس پر مجبور کرتی تھیں کہ وہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر تلاش معاش میں ادھر ادھر جائیں ایک کسان عورت گھر کے کام کے علاوہ مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے اور کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ شہروں میں غریب خاندان کی عورتیں اعلیٰ طبقے کو ملازمائیں' ماماَئیں اور مغلانیاں فراہم کرتی تھیں۔ یہ جاگیردارانہ اقدار ایک طبقے تک محدود رہیں جو سیاسی' معاشی اور سماجی لحاظ سے معاشرے کا اعلیٰ طبقہ تھا۔

مسلمانوں کا یہ جاگیردارانہ معاشرہ سلاطین دہلی اور مغلیہ خاندان کی حکومتوں تک مستحکم رہا۔ اس معاشرے میں عورت کا مقام محض ایک شے کا تھا جو مرد کی ملکیت رہ کر آزادی '

خودی اور انا کو ختم کر دیتی تھی اس کی زندگی جس نہج پر پروان چڑھتی تھی' اس میں بیٹی کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ ماں باپ کی خدمت کرے' بیوی کی حیثیت سے شوہر کی فرماں بردار رہے اور ماں کی حیثیت سے اولاد کی پرورش کرے' ان تینوں حیثیتوں میں اس کی خواہشات جذبات اور تمنائیں ختم ہوجاتی تھیں اسے یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ بحیثیت عورت زندگی سے لطف اندوز ہوسکے۔ (۱)

اس جاگیر دارانہ معاشرے میں مرد کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ان اقدار میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ عورت ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجائے۔ لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان اقدار میں تبدیلی آنا شروع ہوئی' مغربی خیالات و افکار اور تہذیب اور تمدن نے آہستہ آہستہ ہمارے جاگیردارانہ معاشرے کو متاثر کرنا شروع کیا۔ ان تبدیلیوں نے قدیم اقدار کے حامیوں کو چونکا دیا یہ حضرات معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے اور خصوصیت کے ساتھ عورت کے مخصوص کئے ہوئے مقام کو بدلنے پر قطعی تیار نہیں تھے۔

اس طبقے کی نمائندگی ایک بڑے عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۳ء) نے اپنی اور تصانیف کے ذریعے عموماً اور بہشتی زیور لکھ کر خصوصاً کی۔ مولانا کا دور جدید اور قدیم اقدار کے تصادم کا زمانہ تھا جب کہ قدیم نظام زندگی اور اس کی اقدار اپنی فرسودگی اور خستگی کے آخری مراحل میں داخل ہوکر دم توڑ رہی تھیں اور جدید رجحانات و افکار کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہوئی تھیں مولانا نے آخری بار اس گرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو مذہبی و اخلاقی سہارے سے روکنے کی کوشش کی اور یہ کوشش بھی کی کہ عورت کو مذہبی بنیادوں کے سہارے اسی مقام پر رکھا جائے جو جاگیردارانہ نظام نے اس کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مولانا نے بہشتی زیور کے دس حصے لکھے تاکہ ان کے مطالعے کے بعد عورت آسانی سے مرد کی افضلیت کو تسلیم کرے اور اپنی غلامی پر نہ صرف قانع ہو بلکہ اسے باعث فخر سمجھے اس کتاب میں عورت کو اچھا غلام بننے کی ساری ترکیبیں اور گر بتائے گئے ہیں۔ مذہبی مسائل سے لے کر کھانا پکانے اور امور خانہ داری کے تمام طریقوں کی تفصیل ہے جو مرد کو خوش و خرم رکھ سکے۔ اس لئے یہ دستور ہوگیا کہ بہشتی زیور کی یہ دسوں جلدیں (جو ایک جلد میں ہوتی ہیں) جہیز میں لڑکی کو دی جاتی ہیں تاکہ وہ اسے پڑھ کر ذہنی طور پر غلامی کے لئے تیار رہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا

نے ایک بہترین عورت کا جو تصور بہشتی زیور میں پیش کیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے خیالات کا جاگیردارانہ معاشرے کے پس منظر میں پیدا ہونے والی ثقافت اور اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ (۱)

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں جدید مغربی تعلیم مقبول ہو چکی تھی اور ہمارے مصلحین قوم جدید تقاضوں کو تسلیم کرنے کے باوجود تعلیم نسواں کے شدید مخالف تھے۔ وہ مردوں کے لئے تو جدید مغربی تعلیم ضروری سمجھتے تھے مگر یہی تعلیم ان کے نزدیک عورتوں کے لئے انتہائی خطرناک تھی۔ سر سید احمد خان نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تعلیم نسواں کے اس لئے مخالف ہیں کیونکہ جاہل عورت اپنے حقوق سے نا واقف ہوتی ہے اور اسی لئے مطمئن رہتی ہے اگر وہ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق سے واقف ہو گئی تو اس کی زندگی عذاب ہو جائے گی (۲) سر سید نے لڑکیوں کے اسکول کھولنے کی بھی مخالفت کی۔ اور اس بات پر زور دیا کہ وہ صرف مذہبی کتابیں پڑھیں اور جدید زمانے کی مروجہ کتابیں جو نا مبارک ہیں ان سے دور رہیں۔ (۳)

مولانا اشرف علی تھانوی عورتوں کے لئے صرف مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ بے علم عورتیں کفر و شرک میں تمیز نہیں کرتیں اور نہ ہی ان میں ایمان اور اسلام کی محبت پیدا ہوتی ہے یہ اپنی جہالت میں جو چاہتی ہیں بک دیتی ہیں اس لئے ان کے ایمان اور مذہب کو بچانے کے لئے ان کے لئے دین کا علم انتہائی ضروری ہے۔ مولانا دینی تعلیم کے علاوہ عورتوں کے لئے دوسری ہر قسم کی تعلیم کے سخت مخالف ہیں اور اسے عورتوں کے لئے انتہائی نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ (۴)

مولانا لڑکیوں کے اسکول جانے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بھی سخت مخالف ہیں کیونکہ اسکول میں مختلف اقوام، طبقات اور خیالات کی لڑکیاں جمع ہوں گی جس سے ان کے خیالات اور اخلاق متاثر ہوں گے اگر خدا نخواستہ استانی آزاد خیال ہوئی تو بقول مولانا "کریلا نیم چڑھا" اور مزید یہ کہ اگر مشن کی میم انگریزی تعلیم دینے آگئی تو نہ آبرو کی خیر اور نہ ایمان کی۔ (۵) ان کے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ دو چار لڑکیاں گھر پر پڑھیں اور ایک ایسی استانی لیں جو تنخواہ بھی نہ لے کیونکہ اس سے تعلیم بابرکت ہوتی ہے۔ (۶) (لڑکیوں کے لئے تو ہو سکتی ہے مگر استانی کے لئے نہیں) مولانا اس راز سے واقف تھے کہ میل اور اشتراک سے خیالات پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لئے وہ اس راستے کو مسدود کرنا چاہتے تھے اور خواہش مند تھے کہ عورت گھر کی چار دیواری سے قطعی باہر قدم نہ نکالے۔

مولانا عورتوں کے نصاب تعلیم پر خاص طور سے زور دیتے ہیں کہ تاکہ اس کے ذریعے سے ایک خاص قسم کا ذہن تیار ہو سکے۔ اس لئے وہ قرآن شریف کتب دینیہ اور بہشتی زیور کے دس حصوں کو کافی سمجھتے تھے' بہشتی زیور کے سلسلے میں وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ اس میں شرمناک مسائل کو یا تو کسی عورت سے سمجھا جائے یا نشان لگا کر چھوڑ دیا جائے اور سمجھدار ہونے کے بعد پڑھا جائے یہاں تک صرف پڑھنے کی استعدلو کا ذکر ہے جب لکھنے کا سوال آتا ہے تو مولانا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر عورت کی طبیعت میں بے باکی نہ ہو تو لکھنا سکھانے میں کوئی حرج نہیں ورنہ نہیں سکھانا چاہئے۔ (۷) اگر لکھنا سکھایا بھی جائے تو صرف اس قدر کہ وہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکے بس اس سے زیادہ ضرورت نہیں۔ (۸)

عورتوں کو کون سی اور کس قسم کی کتابیں پڑھنا چاہئیں اس پہلو پر مولانا خاص طور سے بہت زیادہ زور دیتے ہیں مثلاً" حسن و عشق کی کتابیں دیکھنا اور پڑھنا جائز نہیں۔ غزل اور قصیدوں کے مجموعے اور خاص کر موجودہ دور کے ناول عورتوں کو قطعی نہیں پڑھنا چاہئیں بلکہ ان کا خریدنا بھی جائز نہیں اس لئے اگر کوئی انہیں اپنی لڑکیوں کے پاس دیکھ لے تو اسے فوراً" جلا دینا چاہئے۔ (۹) مولانا کتابوں کے سلسلے میں اس قدر احتیاط کے قائل ہیں کہ دین ہر قسم کی کتابوں کو بھی عورتوں کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں کیونکہ اکثر دین کی کتابوں میں بہت سی غلط باتیں شامل ہوتی ہیں۔ جن کو پڑھنے سے نقصان ہوتا ہے۔ انہیں اس بات پر سخت افسوس ہے کہ ان کے زمانے میں عورتیں ہر قسم کی کتابیں پڑھتی ہیں اور اسی وجہ سے انہیں نقصان ہو رہا ہے عادتیں بگڑ رہی ہیں۔ اور خیالات گندے ہو رہے ہیں اس لئے مولانا کا خیال ہے کہ دین کی اگر کوئی کتاب پڑھنا ہو تو اسے پڑھنے سے پہلے کسی عالم دین کو دکھا لو اگر وہ اسے پڑھنا منظور کرے تو پڑھو ورنہ نہیں۔ (۱۰) لیکن اس سے بھی مولانا مطمئن معلوم نہیں ہوتے کیونکہ انہیں شائد اپنے علاوہ اور کسی عالم دین پر بھروسہ نہیں کہ غلطی سے وہ کسی غلط کتاب کو پڑھنے کی اجازت نہ دے دے اس لئے وہ خود ان کتابوں کی فہرست دیتے ہیں جن کا پڑھنا عورتوں کے لئے مفید ہے مثلاً" نصیحتہ المسلمین 'راسلہ عقیقہ' تعلیم الدین' تحفتہ الزوجین 'فروغ الایمان' اصلاح الرسوم' بہشت نامہ' دوزخ نامہ' تنبیہ النساء' تعلیم النساء مع دلہن نامہ' ہدایت النساء اور مراۃ النساء وغیرہ

اس کے بعد مولانا ان کتابوں پر سنسر لگاتے ہیں جن کا پڑھنا انتہائی نقصان دہ ہے۔ مثلاً" دیوان اور غزلوں کی کتابیں' اندر سبھا' قصہ بدر منیر' قصہ شاہ یمن' داستان امیر حمزہ' گل

بکاولی' الف لیلہ' نقش سلیمانی' فال نامہ' معجزہ آل نبی' آرائش محفل' جنگ نامہ حضرت علی وغیرہ اور تفسیر سورۃ یوسف " تفسیر سورۃ یوسف کے بارے میں مولانا وضاحت کرتے ہیں کہ اس میں ایک تو کچی داستانیں ہیں دوسرے عاشق و معشوق کی باتیں عورتیں کو سننا اور پڑھنا نقصان کی بات ہے "مراۃ العروس' محصنات اور ایامی کے بارے میں مولانا کہتے ہیں کہ " بعض اچھی باتیں ہیں مگر بعض ایسی ہیں جن سے ایمان کمزور ہوتا ہے" ناول کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ برا ہوتا ہے اور اخبار پڑھنے سے وقت خراب ہوتا ہے (۱۲) مولانا کے ان خیالات سے تعلیم نسواں کے بارے میں ان کا نظریہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ وہ عورت کے لئے ہمیشہ بہت محدود تعلیم کے قائل تھے اور اسے جاہل رکھ کر جاگیر دارانہ اقدار کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔

(۲)

جاگیردارانہ معاشرے میں مرد کی افضلیت کی ایک بنیاد یہ بھی ہوتی ہے کہ خاندانی معاش کا ذمہ دار ہوتا ہے اور عورت معاشی طور پر ان کی محتاج ہوتی ہے محتاجی کے سبب اس میں اس قدر جرات پیدا نہیں ہوتی کہ وہ خود کو مرد کی غلامی سے آزاد کرا سکے اور مرد کی افضلیت کو چیلنج کر سکے مولانا اس ضمن میں کہتے ہیں کہ : کسب معاش صرف مردوں کے لئے ضروری ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ عورتوں کا نان و نفقہ پورا کرے (۱۳) نان ونفقہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ : روٹی کپڑا مرد کے ذمہ واجب ہے جبکہ گھر کا کام کاج کرنا عورت پر واجب ہے۔ تیل' کنگھی' کھلی' صابن' وضو اور نہانے کے پانی کا انتظام مرد کے ذمہ ہے مگر مسی' پان اور تمباکو اس کے ذمہ نہیں۔ دھوبی کی تنخواہ مرد کے ذمہ نہیں اور عورت کو چاہئے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ سے دھوئے اور اگر مرد اس کے لئے پیسے دے تو یہ اس کا احسان ہے۔ (۱۴)

(۳)

جاگیردارانہ معاشرے میں شوہر عورت کے لئے مجازی خدا کا درجہ رکھتا ہے اس لئے عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ شوہر کی فرماں برداری کرے اگر وہ شوہر کے احکامات کی خلاف ورزی کرے تو یہ معاشرے کی اقدار کی خلاف ورزی تصور کی جاتی ہے ۔ مولانا نے اس ضمن میں عورتوں کو جو ہدایات دی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی افضلیت کو مذہب اور اخلاق کی بنیاد پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورت کو

شوہر کے تمام احکامات بلاچوں و چرا بجا لانے چاہئیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ کہے کہ ایک پہاڑ سے پتھر اٹھا کر دوسرے پہاڑ تک لے جاؤ اور پھر دوسرے سے تیسرے تک تو اسے یہی کرنا چاہئے اگر شوہر بیوی کو اپنے کسی کام سے بلائے اور وہ چولہے پر بیٹھی ہو تو تب بھی اس کے کام کے لئے اسے فوراً اٹھ جانا چاہئے۔(۱۵) یہاں تک مرد کی فرماں برداری ضروری ہے کہ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو نفلی روزے نہ رکھے اور نفلی نماز نہ پڑھے عورت کے لئے ضروری ہے کہ مرد کو خوش رکھنے کے لئے بناؤ سنگھار کے ساتھ رہا کرے۔ اگر مرد کے کہنے کے باوجود بناؤ سنگھار نہ کرے تو مرد کو مارنے کا اختیار ہے۔ اس کو چاہئے کہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جائے' رشتہ داروں کے یہاں اور نہ غیروں کے ہاں۔ (۱۶)

مولانا بیوی کا مقصد حیات شوہر کی خوشی قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے عورت کے لئے مکمل ہدایات پیش کی ہیں مثلاً" شوہر کا دل ہاتھ میں لئے رہو' اس کی آنکھ کے اشارے پر چلو' اگر وہ حکم کرے کے کہ ساری رات ہاتھ باندھے کھڑی رہو تو اس حکم کی بھی تعمیل کرو۔ کیونکہ اس میں عورت کی بھلائی ہے ' اگر وہ دن کو رات بتائے تو عورت بھی دن کو رات کہنے لگے۔' شوہر کو کبھی بھی برا بھلا نہیں کہنا چاہئے کیونکہ اس سے دنیا اور آخرت دونوں خراب ہوتی ہیں شوہر سے کبھی زائد خرچ نہیں مانگنا چاہئے اور نہ ہی اس سے کوئی فرمائش کرنی چاہئے۔ اگر عورت کی کوئی خواہش پوری نہ ہو تو خاموش رہنا چاہئے اور اس بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہے ' کبھی کسی بات پر ضد نہیں کرنی چاہئے۔ اگر شوہر سے کوئی تکلیف بھی ہو تو اس پر بھی خوشی ظاہر کرنی چاہئے۔ اگر شوہر کبھی کوئی چیز لادے چاہے وہ اسے پسند آئے یا نہ آئے لیکن اس پر خوشی کا اظہار کرنا چاہئے' اگر شوہر کو غصہ آجائے تو ایسی بات نہیں کرنی چاہئے کہ اور غصہ آئے اس کے مزاج کو دیکھ کر بات کرنی چاہئے اگر وہ ہنسی دل لگی چاہتا ہے تو اسے خوش کرنے کی باتیں کرو۔ اگر وہ ناراض ہو تو عذر و معذرت کر کے ہاتھ جوڑ کر' اسے راضی کرو۔ شوہر کو کبھی اپنے برابر کا مت سمجھو اور اس سے کسی قسم کی خدمت مت لو' اگر وہ کبھی سر دبانے لگے تو اسے ایسا مت کرنے دو اٹھتے بیٹھتے ' بات چیت ' غرض کہ ہر بات میں ادب اور تمیز کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

اگر شوہر پردیس سے آئے تو اس کا مزاج پوچھنا چاہئے اس کے ہاتھ پاؤں دبانا چاہئیں اور فوراً" اس کے لئے کھانے کا انتظام کرنا چاہئے اگر گرمی کا موسم ہو تو پنکھا لے کر اس پر جھلنا چاہئے اور اسے آرام پہنچانا' عورت کے فرائض میں سے ہے۔ گھر کے معاملات میں مولانا ہدایت دیتے ہیں کہ بیوی کو یہ حق نہیں کہ میاں سے تنخواہ کا حساب کتاب پوچھے اور

کہے کہ تنخواہ تو بہت ہے ' اتنی کیوں لاتے ہو' یا بہت خرچ کر ڈالا اور کس چیز میں اتنا پیسہ اٹھایا وغیرہ۔ اسی طرح شوہر کی ہر چیز سلیقے سے رکھو رہنے کا کمرہ ' بستر' تکیہ اور دوسری چیزیں صاف ستھری ہونی چاہئیں۔ اگر شوہر کسی دوسری عورت سے ملتا ہے تو اسے تنہائی میں سمجھاؤ پھر بھی باز نہ آئے تو صبر کر کے بیٹھ جاؤ لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کر کے اسے رسوا مت کرو' اس ضمن میں مولانا کہتے ہیں کہ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے' دباؤ اور زبردستی سے ہرگز زیر نہیں ہو سکتے ان کے زیر کرنے کی بہت آسان ترکیب خوشامد اور تابعداری ہے۔ (۱۷) اس سلسلے میں مولانا ایک عورت کا ذکر کرتے ہیں۔ " لکھنؤ میں ایک بیوی کے میاں بد چلن ہیں دن رات باہر بازاری عورت کے پاس رہتے ہیں' گھر میں بالکل نہیں آتے بلکہ فرمائش کر کے کھانا پکوا کر باہر منگواتے ہیں وہ بیچاری دم نہیں مارتی جو میاں کہتے ہیں ان کی فرمائش پوری کرتی ہے۔ دیکھو ساری خلقت اس بیوی کو کیسی واہ واہ کرتی ہے اور خدا کے یہاں جو اس کو مرتبہ ملے گا وہ الگ رہا۔" (۱۸) مزید ہدایت میں یہ بھی ہے کہ ساس سسر اور نندوں سے الگ رہنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے' سسرال ہی کو اپنا گھر سمجھنا چاہئے۔ شوہر اور بڑوں کا نام لے کر پکارنا مکروہ اور منع ہے۔ (۱۹) عورتوں کے لئے پچیسی ' چوسر اور تاش کھیلنا وغیرہ بھی درست نہیں۔ (۲۰) عورت کے لباس کے معاملے میں بھی مولانا وضاحت کرتے ہیں کہ خلاف شرع لباس قطعی استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسے کلیوں کا پاجامہ یا ایسا کرتہ جس میں پیٹھ ' پیٹ یا بازو کھلے ہوں یا ایسا باریک کپڑا جس میں بدن یا سر کے بال جھلکتے ہوں۔ عورت کے لئے موزوں ترین لباس یہ ہے کہ لانبی آستینوں کا نیچا' موٹے کپڑے کا کرتا اور اسی کپڑے کا دوپٹہ استعمال کرے۔ (۲۱)

مولانا عورت کو گھر میں رکھنے کے قائل ہیں ' اس سلسلے میں انہوں نے جو پروگرام تیار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ مثلاً" ماں باپ کو دیکھنے کے لئے ہفتے میں ایک بار جا سکتی ہے دوسرے رشتہ داروں سے سال میں ...... ایک دفعہ اس سے زیادہ کا اسے حق نہیں اسی طرح ماں باپ بھی ہفتے میں ایک بار ملنے آسکتے ہیں شوہر کو اختیار ہے کہ زیادہ نہ آنے دے یا زیادہ نہ ٹھہرنے دے (۲۲) وہ تقریبوں میں بھی آنے جانے کو عورت کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں' شادی بیاہ' مونڈن' چلہ' چھٹی' ختنہ' عقیقہ ' منگنی اور چوتھی وغیرہ کی رسموں میں قطعی نہیں جانا چاہئے اسی طرح نہ غمی میں اور نہ بیمار پرسی کے لئے۔ خاص طور پر برات کے موقع پر جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو اس وقت غیر محرم رشتہ دار کے گھر میں جانا درست نہیں اگر شوہر اجازت دے دے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا۔ اس کے بعد مولانا بڑے افسوس کے

ساتھ لکھتے ہیں کہ : افسوس اس حکم پر ہندوستان بھر میں کہیں عمل نہیں بلکہ اس کو تو ناجائز ہی نہیں سمجھتے (۲۳) آنے جانے کے خلاف مولانا کے یہ دلائل ہیں' اس میں قیمتی جوڑے بنوانا پڑتے ہیں اور یہ فضول خرچی ہے اس کی وجہ سے خاوند پر خرچہ کا بار پڑتا ہے پھر بزاز کو بلا کر بلا ضرورت اس سے باتیں ہوتی ہیں تھان لیتے وقت آدھا ہاتھ جس میں مہندی اور چوڑی ہوتی ہے باہر نکالنا پڑتا ہے جو غیرت و حمیت کے خلاف ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کے وقت پیدل چل کر گھر جاتی ہیں جو انتہائی بے حیائی ہے اور اگر چاندنی رات ہو تو اس کی کوئی انتہاہی نہیں۔ ڈولی میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پلو یا آنچل باہر لٹک رہا ہے یا کسی طرف پردہ کھل گیا یا عطر و پھلیل اس قدر ہے کہ راستے میں خوشبو ہی خوشبو ہے یہ نا محرموں کے سامنے بناء سنگھار ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔ عورتیں یہ بھی کرتی ہیں کہ ڈولی سے اتریں اور ایک دم بھر میں داخل ہوگئیں یہ خیال نہیں کرتیں کہ گھر میں کوئی نا محرم بیٹھا ہو۔ محفل میں بہشتی آتا ہے تو منہ پر نقاب ڈال لیتا ہے مگر دیکھتا سب کو ہے۔ بعض دفعہ دس بارہ سال کے لڑکے گھر میں آجاتے ہیں جس سے بے پردگی ہوتی ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر کسی تقریب و رسم اور ملنے جلنے کی وجہ سے گھر سے نکلنا وہ بے حیائی خیال کرتے ہیں۔ (۲۴)

(۵)

بہشتی زیور اس ذہن کی پوری پوری عکاسی کرتی ہے جو ہندوستان میں جاگیر دارانہ ثقافت اور اقدار نے بنایا تھا۔ لیکن بہشتی زیور جدید خیالات و افکار اور سماجی شعور کو نہیں روک سکی اور قدیم روایات کی فرسودگی کو کہنگی کو اس کے ذریعے کوئی استحکام نہ مل سکا۔

○

حوالہ جات

(۱) اس موضوع پر مشہور جرمن ادیب برتولڈ بریخت کا ایک افسانہ ہے جس کا اردو ترجمہ مصنف نے "دوسالہ عورت" کے عنوان سے کیا ہے۔ دیکھئے پندرہ روزہ "پرچم" کراچی - یکم اپریل - ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء ص - ۲۸-۲۹

(۲) سرسید احمد خاں: مکتوبات سرسید - لاہور' ۱۹۵۹ء ص- ۳۸۱

(۳) ایضاً: ص- ۳۸۲

الطاف حسین حالی: حیات جاوید لاہور' ۱۹۴۶ء ص- ۲۹۶

(۴) مولانا اشرف علی تھانوی' بہشتی زیور لاہور(؟)

حصہ اول' ص - ۷۹- ۸۰

(۵) ایضاً: ص- ۸۴

(۶) ایضاً: ص- ۸۵

(۷) ایضاً: حصہ چہارم' ص - ۸۵

(۸) ایضاً: ص- ۳۸

(۹) ایضاً: حصہ سوم ص- ۵۹

(۱۰) ایضاً: حصہ دہم ص- ۴۷

(۱۱) ایضاً: ص- ۴۷-۴۸

(۱۲) ایضاً: حصہ اول ص- ۸۳

(۱۳) ایضاً: حصہ چہارم ص- ۲۹

(۱۴) ایضاً: ص- ۳۳

(۱۵) ایضاً: ص- ۳۴

(۱۶) ایضاً: ص- ۳۴-۳۷

(۱۷) ایضاً: ص- ۳۷

(۱۸) ایضاً: حصہ دوم ص- ۵۷

(۱۹) ایضا: حصہ سوم ص۔ ۵۸
(۲۰) ایضا: حصہ ہفتم ص۔ ۵۴
(۲۱) ایضا: حصہ چہارم ص۔ ۴۹
(۲۲) ایضا: حصہ ہشتم ص۔ ۱۵
(۲۳) ایضا: ص۔ ۱۴۔ ۱۷

علماء اور سائنس

ہندوستان میں انگریزی اقتدار نے یہاں کے معاشرے کی ہیئت و ساخت میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کیں۔ سیاسی و ثقافتی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سائنسی اور فنی ایجادات نے مذہبی عقائد اور توہمات پر کاری ضربیں لگائیں اور مذہبی رجعت پرستی کو کمزور کیا۔ اس عمل میں یورپی اور ہندوستانی معاشروں میں فرق نمایاں اور واضح رہا' کیونکہ یورپی معاشرہ سائنسی اور فنی ایجادات کے عمل کے نتیجے میں ذہنی طور پر آگے بڑھا اور معاشرے کی ترقی میں ہر فرد نے برابر کا حصہ لیا اور ان تمام ایجادات کو جو وقت کی ضرورت کے تحت عمل میں آئی تھیں انہیں نہ صرف ذہنی طور پر قبول کیا بلکہ یہ ان کی زندگی میں رچ بس گئیں اس کے مقابلے میں ہندوستان میں یہ ایجادات یورپ سے آئیں اور ایک ایسے معاشرے میں رائج ہوئیں جو ذہنی طور پر ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ہر نئی چیز کو شک شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ اور ان کو قبول کرتے ہوئے خوف و جھجک کا مظاہرہ کیا۔

مسلمان معاشرے میں خصوصیت سے علماء کا طبقہ نئی سائنسی اور فنی ایجادات کا زبردست مخالف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا نظام تعلیم پرانی اور فرسودہ روایات پر قائم تھا اور ہر زمانے کی تبدیلیوں اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا گیا تھا۔ بنیادی طور پر مسلمان معاشرے میں جو نظام تعلیم رائج تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ صرف وہ مضامین پڑھائے جائیں جن سے عقائد اور ایمان سلامت رہے اور ایسے تمام مضامین' افکار و نظریات جو ذہن میں شک و شبہ پیدا کریں اور جن سے عقائد کے بارے میں سوالات پیدا ہوں انہیں قطعی طور پر نہ پڑھایا جائے۔ چنانچہ ابتداء ہی سے ہندوستان کے علماء فلسفے کے مخالف تھے' کیونکہ فلسفہ ذہن میں شک و شبہ پیدا کر کے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس لئے دیو بند کے سربراہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے فلسفے کو دیو بند کے نصاب میں نہیں رکھا۔ اور سختی کے ساتھ اس بات کو کہا کہ جو میرا شاگرد فلسفے سے شغل

رکھے گا وہ میرا مرید اور میرا شاگرد نہیں (۱) دیو بند کا نصاب درس نظامی جو اٹھارھویں صدی میں تیار کیا گیا تھا۔ اور اسی کو بغیر تبدیلی کے پڑھایا جاتا تھا۔ اس نصاب کے اہم مضامین تھے۔ عربی صرف و نحو، منطق، حکمت، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تفسیر اور حدیث۔

اس نصاب میں نہ تو اسلامی ملکوں کی تاریخ تھی، نہ ہندوستان کی تاریخ، نہ جغرافیہ، نہ سائنس کے علوم، مشیر الحق نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "جدید سائنس پر کوئی زور نہیں دیا جاتا تھا، طالب علموں کو باقاعدہ کوئی جدید ہندوستان یا یورپی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ انگریزی بھی نہیں جو ہندوستان کی دوسری زبان بن چکی تھی۔ عالمی تاریخ کو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ ہی ہندوستان کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی، یا جغرافیہ اور دوسرے سماجی علوم ایسی کوئی کتاب نصاب میں نہیں تھی جو غیر مسلموں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہو۔"

دیو بند، فرنگی محل اور مظاہر العلوم اور ان جیسے مدرسوں نے جن طالب علموں کو پیدا کیا وہ جدید تعلیم، جدید روایات اور وقت کی تبدیلیوں سے قطعی ناواقف تھے۔ اور ذہنی طور پر وہ عہد وسطی کی پیداوار تھے۔ نئی سیاسی و سماجی اور سائنسی و فنی ایجادات اور تبدیلیوں سے نہ صرف ناواقف تھے بلکہ اس عمل کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے یہ نہ کوئی پیشہ اختیار کر سکتے تھے اور نہ کوئی ملازمت ان کی جگہ صرف مدرسے اور مسجد میں تھی، اور اپنے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے ان کی کوشش تھی کہ مذہبی ادارے قائم ہوتے رہیں، چندہ جمع ہوتا رہے اور لوگ مذہبی عقائد و توہمات سے چمٹے رہیں۔ اس لئے انہوں نے سائنس، آرٹ اور فن میں ہونے والی ہر نئی چیز کی مخالفت کی۔ اس کا اندازہ ان فتووں سے کیا جاسکتا ہے۔ جو فتاویٰ دارالعلوم اور "فتاویٰ رشیدیہ" میں سائنسی ایجادات اور سماجی تبدیلیوں کے خلاف درج ہیں۔ مثلاً " انگریزی ہیٹ اور ٹوپی کا استعمال مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کیونکہ یہ نصاریٰ کی نقل اتارتا ہے (۳)

تصویر کشی میں کہا گیا ہے کہ: تصویر کشی شریعت اسلامیہ میں مطلقاً حرام ہے۔ خواہ قلم سے ہو یا فوٹو گرافی۔ جو تصویر محض زیب و زینت کے لئے رکھی جائے اگر وہ جاندار کی ہے تو ناجائز ہے لیکن اگر اسے کسی ذلت کی جگہ پر ڈال دیا جائے جیسے جوتوں کے فرش پر یا ایسی ہی جگہ تو پھر جائز ہے طبی معلومات یا نقشہ جنگ کے لئے بھی مکمل تصویر رکھنا جائز نہیں۔

طبی ضرورت کے لئے ہر عضو کی علیحدہ علیحدہ تصویر رکھی جائے۔ بجز سر کے اس کی تنہا رکھنا بھی جائز نہیں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر بنانا خواہ مجسمے تصویر کی صورت میں ہو یا نقش و رنگ کی صورت میں' خواہ قلم سے بنائی جائے یا پریس میں چھپوائی جائے یا کیمرے کے ذریعے تصویر لی جائے' یہ سب گناہ کبیرہ ہے ۔ چار قسم کی تصویروں کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ سر کٹی ہوئی تصویر' وہ تصویر جو پامال اور ذلیل ہو' اتنی چھوٹی ہوں کہ اگر انہیں زمین پر رکھ کر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پوری نظر نہ آئیں اور بچوں کی گڑیاں جو مکمل نہ ہوں ۔ (۴)

ایک سوال کے جواب میں کہ کیا جغرافئے کا ایسا نقشہ بنایا جاسکتا ہے کہ جس میں حیوانات جمادات' نباتات اور دوسری معلومات کے ساتھ ساتھ ان کی تصویریں ہوں۔ تو اس کے جواب میں فتویٰ دیا گیا کہ تصویر کشی مطلقاً حرام ہے اوراگر حیوانات کی تصویر بنائی جائے تو بغیر سر اور عضو کے ہو (۵)

کھیلوں کے بارے میں فتویٰ دیا گیا کہ کھیل خواہ گیند کا ہو یا دوسرا' اگر لہو لعب کی غرض سے ہو تو مکروہ' اگر تفریح اور تھکاوٹ دور کرنے کے لئے ہو تو جائز ہے' مگر فٹ بال کھیلنا مکروہ ہے کیونکہ یہ نیکر پہن کر کھیلا جاتا ہے۔ وہ ان تمام ایسے کھیلوں کو جن میں انگریزی وضع کو اختیار کیا جاتا ہو ۔ یعنی لباس پہننا جس سے گھٹنے کھلے ہوں' اور جن کے کھیلنے سے ضروریات اسلام یعنی نماز وغیرہ میں خلل پڑتا ہو وہ جائز نہیں (۶)۔

تھیٹر اور سینما کے بارے میں جب یہ سوال کیا گیا کہ : "مسلمانوں کا تھیٹر' با سکوپ جانا تماشا دیکھنا اس میں کام کرنا یعنی گانا بجانا' ناچنا صورت' شکل' لباس کا تبدیل کرنا عورتوں کا لباس پہننا' اس میں تحریک ہونا' ملازمت کرنا ا۔ اس کی ترغیب دینا اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ تو اس کے جواب میں فتویٰ دیا گیا کہ سخت گناہ اور بہت سے کبیرہ گناہوں کا مجموعہ ہے اور جو شخص لوگوں کو اس کی طرف ترغیب دلاتا ہے وہ بہت بڑا فاسق ہے۔

کسی نے اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ سلطان اسلام کی تصاویر کو سینما میں دکھانا جائز ہے یا نہیں' تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ ان کی توہین ہے کہ ان کو آلہ لہو و لعب بنایا جائے اور مسلمان بادشاہوں کی توہین کرنا ناجائز ہے (۷) سینما کے بارے میں قطعی فیصلہ دیا گیا کہ سینما مطلقاً بہت سے معاصی و منکرات کا شرعی مجموعہ ہے۔ (۹)

ریڈیو کی ایجاد کے بعد اس کے سلسلے میں جو فتوے دیئے گئے ہیں۔ ان میں کہا گیا کہ

جس ریڈیو میں گانا بجانا ہو اس میں کسی بھی طرح نہ قرآن پڑھنا جائز ہے اور نہ سننا (۱۰) گراموفون سے تلاوت کا سننا ناجائز ہے۔ (۱۱)

مختلف ملبوسات اور فیشن کی بھی مخالفت کی گئی' مثلاً" یہ کہ عورتوں کے لئے کھڑا جوتا پہننا ناجائز ہے۔ (۱۲)

فتاویٰ رشیدیہ میں بھی نئی سماجی و معاشی تبدیلیوں کے خلاف ایک رد عمل ملتا ہے۔ مثلاً" منی آرڈر سے پیسے بھیجنے کو شریعت کے خلاف کہا گیا ہے۔ اور بینک میں پیسہ جمع کرانا چاہے سود پر ہو' یا بغیر سود کے یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ (۱۳)

ان فتووں کے علاوہ اس وقت کے علماء نے ہر اس چیز کی مخالفت کی جس سے سیاسی و سماجی اور معاشی زندگی میں کوئی تبدیلی آئی اور جس نے پرانی روایات کو توڑا' اور قدیم نظام زندگی کو بدلا' مثلاً" اسپیکر کا استعمال' ریل کا سفر' ہسپتالوں میں مریضوں کا داخلہ' نئی ادویات کا استعمال' یورپی طرز کا لباس' یورپی انداز میں کھانا اوران کی عادات اختیار کرنا وغیرہ۔

لیکن سائنسی اور فنی ایجادات جو انسانی زندگی میں سہولتیں لے کر آئی تھیں وہ ان فتووں کے باوجود لوگوں میں مقبول ہوئیں اور زمانے کی ضرورت کے تحت ان کا استعمال بڑھتا گیا اور انہیں نہ صرف معاشرے نے قبول کیا بلکہ ان علماء کے طبقے نے بھی انہیں تسلیم کرلیا جو ابتداء میں اس کے مخالف تھے۔ ابتدائی دور میں ان سائنسی و فنی ایجادات کی مخالفت اور سماجی تبدیلیوں کی مزاحمت کی وجہ یہ تھی کہ علماء کا طبقہ ذہنی طور پر تبدیلی کے عمل سے ناواقف تھا اور ان کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہی صورت آج بھی ہے کہ وہ اپنے فرسودہ نظام تعلیم کی وجہ سے نئی تبدیلیوں اور ان کی ضروریات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کے لئے ہر نئی چیز مذہب کے خلاف ہوتی ہے لیکن اس کے استعمال کے بعد وہ اس کو آگے چل کر قبول کرلیتے ہیں۔ اس سے مذہبی توہمات و عقائد پر سائنس کی فتح واضح طور پر ثابت ہوجاتی ہے۔

○

حوالہ جات

۱۔ محمد میاں: علماء حق (اول) دہلی (۹) ص ۔ ۸۵

۲۔ مشیر الحق MUSLIM POLITICS IN MODERN
مشیر الحق، ص INDIA LAHORE (P - [illegible])

۳۔ فتاویٰ دارالعلوم۔ کراچی (۲) ص ۹۷۹۰ ۔ ۹۹۱ ۔ ۹۹۲

۴۔ ایضاً ۹۹۳ ۔ ۹۹۴ ۔ ۹۹۵

۵۔ ایضاً ۔ ۹۹۹ ۔ ۱۰۰۰

۶۔ ایضاً ۱۰۰۲

۷۔ ایضاً ۱۰۰۳

۸۔ ایضاً ۱۰۰۷

۹۔ ایضاً ۱۰۰۷

۱۰۔ ایضاً ۱۰۰۸

۱۱۔ ایضاً ۱۰۱۲

۱۲۔ ایضاً ۷۴۵

۱۳۔ رشید احمد گنگوہی: فتاویٰ راشیدیہ۔ کراچی (۲) ص۔ ۴۳۰۔۴۳۱

علماء معاشرہ اور جہاد تحریک

علماء اور تاریخ نویسی

ہندوستان میں مسلمان حکمراں خاندانوں کے دور حکومت میں علماء حکومتی اداروں کی مدد سے اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ مسلمان معاشرے میں راسخ العقیدگی کی جڑیں مضبوط رہیں تاکہ اس کی مدد سے وہ اپنے اثر و رسوخ کو باقی رکھ سکیں۔ حکومتوں نے علماء کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے جہاں انہیں حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا وہاں اس کے ساتھ انہیں مدد معاش کے طور پر جاگیریں دے کر انہیں معاشی طور پر خوش حال رکھا۔ اس لئے علماء اور حکومت کے درمیان مفاہمت اور سمجھوتے کے جذبات قائم رہے اور انہوں نے اس کے عوض ان حکومتوں کو اسلامی قرار دے کر مسلمان رعیت کو وفادار رہنے کی تلقین کی۔

جب مغلوں کا زوال ہوا اوراس کے ساتھ علماء کے وظیفوں اور مدد معاش کی جاگیروں کا سلسلہ ختم ہونا شروع ہوا تو ان میں سے کچھ نے چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں میں پناہ لینی شروع کردی اور کچھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت قبول کرلی۔ مگر اکثریت کے لئے معاش کے دروازے بند ہوگئے' اس کا حل یہ نکالا گیا کہ جگہ جگہ مذہبی مدرسے قائم ہونا شروع ہوگئے اور چندوں کے ذریعے علماء نے اپنی گزر اوقات کا حل نکالا' اس صورت میں ان کا تعلق مسلمانوں کے اونچے طبقوں یعنی زمینداروں اور تعلقہ داروں سے ہوگیا۔ اور وہ چندے کے لئے ان کے محتاج ہوکر ایک طرح سے ان کے ملازم ہوگئے۔ چھوٹے شہروں اور گاؤں کی مسجدوں اور مدرسوں کا جاگیر دار کے چندے کے بغیر چلنا ناممکن تھا۔ اس لئے مولوی کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ اس طبقے کے خلاف کچھ کہیں۔

۱۸۵۷ء کے حادثے نے جہاں ہندوستان کے پورے نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا اور برطانوی تسلط کو مستحکم کردیا' وہاں اس کے ساتھ ہندوستا ں ان کے خلاف آزادی کی تحریک کی بھی ابتداء ہوئی۔ اس پس منظر میں علماء کو منظم کرنے کی کوششیں شروع

ہوئیں اور مسلمان معاشرے میں ان کا اثر و رسوخ اس وجہ سے بھی بڑھا کہ مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والے سیاسی ادارے ختم ہوچکے تھے اور سیاسی طاقت کی اس کمی کو معاشرے نے مذہبی راہنماؤں کے ذریعے پورا کرنا چاہا۔ علماء کو منظم کرنے میں دیوبند' فرنگی محل' ندوۃ العلماء اور مدرسہ مظاہر العلوم جیسے مذہبی تعلیمی ادارے قابل ذکر ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہر طبقہ فکر کے علماء نے اپنی اپنی جماعتیں بنا کر مسلمان معاشرے میں اپنے اثر و رسوخ کو پھیلانے کی کوشش کی۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں علماء کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تاریخ میں ان کے مثبت کردار کو ابھارا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ ہندوستان کی تاریخ میں علماء نے ہمیشہ شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ لکھنے کا کام بھی علماء نے کیا اور یہ تاریخ عقیدت سے بھرپور جذبات کے ساتھ لکھی گئی کہ جس کو لکھتے وقت تاریخی واقعات کی تحقیق یا تجزیئے کی ضرورت کو اہمیت نہیں دی گئی۔ بلکہ یہ کوشش کی گئی کہ علماء کی قربانیوں سے ان کے کردار اور مذہب سے ان کے لگاؤ اور شغف کو ظاہر کیا جائے' اس سلسلے میں سب سے اچھی مثال ابوالکلام آزاد کی ہے کہ جو مورخ نہیں تھے ایک اچھے ادیب اور انشاپرداز تھے' انہوں نے "تذکرہ" میں علماء کا ذکر کرتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے۔ وہ اوبانہ ہے تاریخی نہیں مگر ان کے غیر تاریخی فیصلوں کا اثر ہمارے معاشرے پر بڑا گہرا ہوا اور اس نے تاریخی گمراہی پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا' مثلاً" احمد سرہندی کی شخصیت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ :

> شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہوگیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کا وجود گرامی تن تنہا اس کاروبار میں کفیل ہوا۔(۱)

شاہ ولی اللہ کے بارے میں ان کے تاثرات ہیں کہ :

> دعوت اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے۔ اب سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا' اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے

> اور افسانے پھیل گئے' جن باتوں کو کہنے کی جرأت بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی۔ وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہو رہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کو نقوش و رودلو بنا کر صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔ (۲)

اس انداز بیان نے ہندوستان کے مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کو بڑا متاثر کیا اور تاریخ کی یہ غلط تفسیر ذہنوں میں اس طرح سے راسخ ہوئی کہ حقائق کو دریافت کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی۔ چنانچہ حکمرانوں کی سیاسی تاریخ کے متوازی علماء کی مذہبی تاریخ کی تشکیل ہوئی اور حکمرانوں کی سیاسی تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کیا گیا کہ صرف علماء نے ہندوستان کے معاشرے میں اسلامی تشخص کو برقرار رکھا۔

علماء کی تاریخ کی تشکیل میں ایک دقت جو علماء مورخوں کو پیش آئی وہ یہ کہ تاریخ میں علماء حکمرانوں کے ساتھ تعاون اور مفاہمت پر عمل کرتے نظر آئے۔ اس لئے انہوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا۔ علماء سو اور علماء حق ۔ علماء سو۔ دنیا دار' وقت کے ساتھ ساتھ چلنے والے موقع پرست اور حکمرانوں کی ضرورت کے مطابق مذہب کو بدلنے والے تھے جب کہ علماء حق نے دنیاوی فوائد سے دور رہ کر صرف حق کی بات کی' مگر اس میں مصیبت یہ ہے کہ ہر گروہ دوسرے کو علماء سو اور خود کو علماء حق کہتا ہے اور تاریخ کو اس انداز سے لکھتا ہے کہ دلائل ان کے حق میں جاتے ہیں۔

علماء مورخوں کی ایک جماعت نے جو مسلمان معاشرے میں راسخ العقیدگی کی جڑیں گہری کرنا چاہتے تھے انہوں نے برصغیر کی تاریخ کی تشکیل اس طرح سے کی کہ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان اور سید احمد شہید کی شخصیتوں کو مرکز بنا کر' تاریخ کے عمل کو ان کے گرد محدود کر دیا۔ اس تاریخ کی تشکیل میں تاریخ کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ یہ راسخ العقیدگی اور مذہبی بدعتوں کے درمیان ایک کشمکش تھی۔ کہ جس میں ایک طرف وہ قوتیں تھیں کہ ہندوستان میں مسلمان معاشرے کے تشخص کو ختم کرنے کے درپے تھیں اور دوسری طرف وہ طاقتیں تھیں جو خالص مذہب اور شریعت کے قیام کے لئے جدو جہد میں مصروف تھیں ان کے نقطہ نظر سے احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی شخصیتیں ہندوستان کی تاریخ میں وہ شخصیتیں ہیں کہ جنہوں نے اپنی تحریروں اپنے عمل اور اپنی جدو جہد سے نہ صرف راسخ العقیدگی کا دفاع کیا بلکہ احیائے دین کی تحریک کو زندہ رکھا۔ اس سلسلے میں مبالغہ آمیز روایات کے ذریعے ان کی شخصیتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔

مثلاً" احمد سرہندی کے بارے میں ان کے معتقدین نے جو باتیں پھیلائیں ان میں یہ ثابت کیا گیا کہ محض ان کی شخصیت کی وجہ سے عہد مغلیہ میں دین اسلام باقی رہا اور ان کی کوششوں سے جہاں گیر و شاہ جہاں مذہب کی طرف راغب ہوئے اور عہد عالمگیری میں شریعت کے نفاذ پر عمل ان کی تحریک کا نتیجہ تھا' جیسا کہ شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ ابوالکلام آزاد کے اس فقرے نے کہ اکبر کے الحاد کا تن تنہا مقابلہ شیخ احمد سرہندی نے کیا' اس نے لوگوں میں تاریخ کے بارے میں گمراہ کن خیالات پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔ اور اس کے بعد آنے والے علماء اور مورخوں نے اس فقرے کی روشنی میں احمد سرہندی کی شخصیت کو تاریخ کی ایک انتہائی فعال شخصیت بنانے کی کوشش کی۔ اور اس طرح سے اکبر اور احمد سرہندی کی دو متضاد شخصیتیں ابھر کر آگئیں جو ایک دوسرے سے باہم بر سرپیکار ہیں۔ اکبر ہندی قومیت کا حامی صلح کل کا پیرو کار' عقلیت کا پرستار اور اشتراک کا حامی ہے تو احمد سرہندی اسلامی تشخص' راسخ العقیدگی اور خالص اسلام و شریعت کے داعی۔ اس کشمکش میں احمد سرہندی فاتح قرار پائے ہیں کہ جن کی وجہ سے جہانگیر شاہ جہاں کے دربار میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا' داراشکوہ کو شکست ہوئی اور محی الدین اورنگ زیب بر سر اقتدار آیا۔

احمد سرہندی کی شخصیت کو ابھارنے اور فعال بنانے کی کوشش میں اکبر کے دور حکومت کو زیادہ سے زیادہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اسلام کا مخالف اور غیر شرعی و غیر اسلامی روایات کو فروغ دینے والا تھا اور اس کے عہد میں ہندوؤں کا غلبہ بڑھ گیا تھا وہ علی الاعلان اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے لگے تھے جو کہ ایک اسلامی حکومت کے لئے باعث شرم تھا۔ اور اسلام تقریباً ہندوستان سے ختم ہونے والا تھا' ایک مذہبی عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے اکبر اور احمد سرہندی کے اس مقابلے پر مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے اکبر کے عہد میں جو غیر اسلامی روایات فروغ پائی تھیں ان کی تفصیلات اس طرح سے دی ہیں - سود' جوئے اور شراب کو حلال کرنا' داڑھی رکھنے کی ممانعت۔ نکاح کے قوانین میں مضحکہ خیز ترمیمیں' غسل جنابت کی منسوخی' بے پردگی' زنا کی تنظیم' سوروں اور کتوں کا تقدس گائے و بھینس کی حرمت اور ہندی کتابوں سے شغف وغیرہ ہے ان تمام باتوں کے لئے انہوں نے دربار اکبری کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ کو اپنی بنیاد بنایا ہے۔

جس طرح سے واقعات کو توڑ موڑ کر اپنی پسند کے معنی نکالے ہیں۔ اس کا اندازہ خود بدایونی کے اصلی بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً" شراب کے بارے میں اکبر نے جو اصلاحات کی

تھیں' ان کے بارے میں بدایونی لکھتا ہے کہ :

"شراب بدن کی اصلاح کے لئے طبی طور پر استعمال کی جاسکتی ہے ' بشرطیکہ اس کے پینے سے کوئی فتنہ فساد نہ ہو۔ اس طرح شراب پینا جائز ہے۔ البتہ حد سے گزرا ہوا نشہ اور اس کی وجہ سے لوگوں کا جمع ہوکر شور و غوغا کرنا بادشاہ کو اگر اس کی خبر ہوجاتی تھی تو سخت دار و گیر کرتے تھے۔" (۳)

شادی کے سلسلے میں جن مضحکہ خیز قوانین کی بات مولانا کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

"سولہ سال سے پہلے لڑکوں اور چودہ سال سے پہلے لڑکیوں کا نکاح جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں۔(۴) اکبر نے اس پر زور دیا تھا کہ کوئی ایک سے زیادہ شادی نہیں کرے گا۔ اکبر پر جو زنا کی تنظیم کا الزام لگایا گیا ہے تو اس کے بارے میں بدایونی ہی کی تحریر ہے۔

" شہر سے باہر ایک آبادی بنائی گئی اور اس کا نام شیطان پورہ رکھا گیا وہاں با ضابطہ محافظ۔ نگران' داروغہ مقرر تھے تاکہ جو یہاں سے یا گھر سے لے جانا چاہے اپنا نام و نسب لکھوائے۔ (۵)

اس طرح اکبر کے "دین الٰہی " کو ایک نیا دین و مذہب بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے عہد کی سماجی و معاشرتی اصلاحات کو غیر اسلامی قرار دے کر احمد سرہندی کی شخصیت کو مد مقابل کے طور پر لایا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اکبر کے عہد کے علماء کی کردار کشی بھی کی گئی تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ صرف ان ہی کی تن تنہا ذات نے دین کی خدمت کے کارنامے سر انجام دیئے۔

اگرچہ معاصر تاریخوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ احمد سرہندی کی شخصیت اکبر کے عہد میں ایک گمنام شخصیت تھی۔ جہاں گیر کے دور میں ان کا اثر ان کے مریدوں کے محدود حلقہ میں تھا اور انہوں نے جہاں گیر کے امراء کو جو خطوط لکھے۔ تو کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان امراء نے ان خطوط کو کس حد تک سنجیدگی سے لیا اور یہ کہ کس حد تک وہ ان کے عقیدت مند تھے۔ کیونکہ ان خطوط کا لب ولہجہ بقول پروفیسر مجیب بعض اوقات خوشامدانہ ہے۔ ان کے معتقدین نے بعد میں مفروضوں پر اس عمارت کی تعمیر کی کہ ان کے خطوط نے ان امراء کو متاثر کیا اور انہوں نے دربار کی فضا کو بدلا۔

اس ضمن میں یہ تشریح کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں کوئی ایک فرد تن تنہا موثر نہیں ہوتا ہے اور وہ اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ حالات کو یا تاریخی عمل کو موڑ

سکے' جب تک معاشرے کے سیاسی' سماجی اور معاشی عوامل ساتھ نہ ہوں اس وقت تک تحریک معاشرے میں مقبول نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر تحریک کے پس منظر میں مختلف طبقاتی مفادات ہوتے ہیں ' جو تحریک کو موثر بناتے ہیں۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر پوپ ا چرچ کے خلاف اس وجہ سے کامیاب ہوا کہ اس کے ساتھ معاشرے کی اکثریت تھی جو چر کی لوٹ کھسوٹ سے بیزار تھی' جرمنی کے حکمراں اس کے حامی تھے کیونکہ چرچ کی وجہ سے ان کا اقتدار و طاقت محدود تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے لوتھر کا ساتھ دیا ۔ اکبر کے عہد میں اس قسم کی کسی بے چینی کا عوام میں کوئی تذکرہ نہیں آتا' بلکہ اس کے پورے عہد میں اس نے جو سماجی و سیاسی و معاشی اصلاحات کی تھیں۔ انہوں نے معاشرے کو مستحکم بنانے میں حصہ لیا تھا صرف علماء اور امراء کا ایک محدود طبقہ ضرور تھا جو اکبر کی رواداری اور صلح کل کی پالیسی کا مخالف تھا۔ مگر اس طبقے کے مفادات اس قدر محدود تھے کہ یہ ان کی بنیاد پر کوئی تحریک نہیں چلاسکے' اس لئے عہد اکبری میں احمد سرہندی کی شخصیت ایک گمنام شخصیت تھی۔ کہ جن کا اثرو رسوخ ان کے اپنے مریدوں تک محدود تھا' انہیں ایک مقبول عام عالم اور فعال شخصیت کے طور پر پیش کرنا دور جدید کے علماء اور ان کے ہم خیال مورخوں کا کام ہے۔

دوسری شخصیت جسے جدید دور میں بڑی اہمیت دی جارہی ہے وہ شاہ ولی اللہ کی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ ولی اللہ اپنے دور میں لوگوں کو ذہنی طور پر متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے؟ اس کا جواب محمود احمد برکاتی نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان (لاہور ۱۹۷۶ء) میں اس طرح سے دیا ہے کہ کہ ان کے اپنے عہد میں ان کا اثر بڑا محدود تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں چھاپہ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی تعداد محدود ہوتی تھی اور قلمی نسخے بہت کم تعداد میں لوگوں تک پہنچتے تھے' اس لئے کتابیں پڑھنے والے لوگ بہت کم ہوتے تھے' شاہ ولی اللہ کے جانشینوں میں ان کی تحریروں اور ان کے خیالات کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ دیو بند کے نصاب میں بھی ان کی کوئی کتاب شامل نہیں تھی۔

شاہ ولی اللہ کی شخصیت کو دور جدید میں اہمیت دی گئی ہے اوراس سے زیادہ حصہ مولانا عبید اللہ سندھی کا ہے جو ہندوستان سے باہر جانے کے بعد بدلتے ہوئے حالات سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ خصوصیت سے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے ان کے خیالات پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور وہ اشتراکی نظام کے زبردست حامی ہوگئے' مگر ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس نظام کو

غیر اسلامی شکل میں اختیار کرنے پر تیار نہ تھے' اس لئے انہوں نے مسلمان مفکرین میں سے ایسے مفکر کی تلاش شروع کی جسے مارکس بنا کر اس کے افکار پر وہ اسلامی سوشل ازم کی بنیاد رکھ سکیں۔ اس لئے شاہ ولی اللہ کے ہاں انہیں کچھ ایسے معاشی نظریات ملے کہ جنہیں انہوں نے جدید زبان میں پیش کر کے جدید اور انقلابی بنا دیا' شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے انہی پہلوؤں کو اجاگر کیا کہ جو ان کے نظریات سے ہم آہنگ تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک اور اپنے دوسرے مضامین میں کیا ہے۔

عبید اللہ سندھی سے متاثر ہو کر مولانا محمد میاں نے "علماء ہند کا شاندار ماضی" کہ جس میں انہوں نے نے بڑی عقیدت کے ساتھ علماء کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کی جلد دوم میں شاہ ولی اللہ کو ایک انقلابی اور ان کی تحریک کو وسیع اور جامع تحریک کے طور پر پیش کیا ہے' ان کی کتاب سے چند اقتباسات ملاحظہ ہو:

> "شاہ صاحب فوجی انقلاب کے حامی تھے' مگر وہ فوجی انقلاب جو جہاد کے اصول پر ہو..... ایسا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعے نہیں ہوسکتا ہے بلکہ ان رضاکاروں کے ذریعے ہوسکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو..... شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے یہی خدمت انجام دی۔ آپ نے اصلاحی نظریات مرتب کئے ساتھ ساتھ ٹریننگ سنٹر قائم کئے۔" (٦)

> "لہٰذا اخلاق اور مذہب دونوں کا تقاضا تھا کہ انقلاب کے لئے سب سے پہلے اس کی تربیت کی جائے جس کے اقتدار اعلیٰ پر سارا ملک اعتماد کئے ہوئے تھا اور جس کی گردن پر تمام وفاداروں کی ترقی اور فلاح و بہبود کا بوجھ لدا ہوا تھا۔" (٧)

اس کے بعد انہوں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک کے مراکز بتائے ہیں۔ جن میں دہلی' رائے بریلی' مدرسہ نجیب آباد ٹھٹھہ اور لکھنؤ ہیں انقلاب کے لئے شاہ ولی اللہ نے مسلمان حکمراں طبقوں کی تربیت کی کیونکہ !

شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات اپنے عہد میں کوئی عملی نتائج پیدا نہیں کر سکے اور ناکام ہوئے اب انہیں نظریات کو جدید دور کے مسائل کا حل بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اور جدید علوم کی روشنی میں ان کے خیالات کو جدید اصطلاحات کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو یہ اہمیت کیوں دی جارہی ہے؟ جب کہ وہ اپنے

عہد کے معاشرے کو متاثر نہیں کر سکے اور مغل زوال کے ساتھ جو معاشرتی زوال ہوا اس کو نہ روک سکے۔ اس لئے جب کہ جدید دور میں حالات بدل چکے ہیں۔ مسائل بدل چکے ہیں۔ زمانہ اور اس کے تقاضے بدل چکے ہیں' ان حالات میں وہ کس طرح ہماری مدد کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب کچھ اس طرح سے سمجھ میں آتا ہے کہ مغل زوال سے لے کر عہد برطانیہ میں مسلمان معاشرہ ذہنی طور پر اس قدر پس ماندہ ہوچکا تھا' کہ اس نے کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں کی جو جدید زمانے کو سمجھ کر آج کے مسائل کا حل تلاش کرتی' مسلمان معاشرے نے کوئی تخلیقی مفکر' سیاستدان اور فلسفی پیدا نہیں کیا۔ یہی احساس کمتری ہے کہ ہر شخص کو آج علامہ اور مفکر کے خطاب دے کر ہم اپنی کم مائیگی کو پورا کرتے ہیں۔ اس کمی نے شاہ ولی اللہ کو دوبارہ پیدا کیا۔ ان کی تصانیف کو کھنگالا گیا اور انہیں جدید قالب میں ڈھال کر مسلمان معاشرے کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے پورے خاندان کو ایک تحریک کا درجہ دیا گیا تاکہ وہ سلسلہ جو احمد سرہندی سے شروع ہوا تھا وہ ٹوٹنے نہ پائے اور اس کا تسلسل برقرار رکھا جائے۔ اس تحریک کی تشکیل مفروضوں پر ہوئی ہمارے دور کے مشہور مورخ اشتیاق حسین قریشی نے جس انداز میں اس تحریک کو پیش کیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ ایک بڑی منظم اور فعال تحریک تھی۔

> "اگر تحریک کو مقبول عام بننا تھا تو اس کی تنظیم اور منصوبہ بندی بڑی احتیاط کے ساتھ ہونی چاہئے تھی اور اسے لائق اور معتمد راہنماؤں کی قیادت میں چلنا چاہئے تھا۔ بڑی توجہ کے ساتھ زمین ہموار کرنے' لوگوں کو حمایت کے لئے تیار کرنے' روپیہ اور رضاکاروں کی فراہمی کے لئے جگہ جگہ مرکز قائم کرنے اور ممکن الحصول مقاصد معین کرنے کی ضرورت تھی اور اس کام کی تکمیل کے بعد تحریک کو علانیہ شروع کرنا تھا..... تاہم شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقائے کار نے آہستہ آہستہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ان مشکلات پر قابو پالیا۔ ان کی موقع شناسی اور ان کے طریقہ کار اپنی محتاط روش کے لئے قابل تعریف ہیں' کیونکہ انہوں نے مداخلت کا کوئی بہانہ انگریزوں کے ہاتھ نہیں آنے دیا۔" (۸)

اس طرح سے سید احمد شہید کی جہاد تحریک' شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی تحریک کا عملی حصہ قرار پایا' کیونکہ انہوں نے احمد سرہندی شاہ ولی اللہ کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

مولانا ابوالحسن ندوی اور غلام رسول مہر نے جو سید احمد شہید پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں انہوں نے اس پوری تحریک کا عقیدت سے جائزہ لیا ہے اور اشتیاق حسین قریشی نے بھی اسے شاہ ولی اللہ تحریک کا ایک سلسلہ بتایا ہے۔

"اس نئی تحریک کی قیادت کے لئے سید احمد کو تیار کرنے میں شاہ عبدالعزیز کا ایک اہم کردار تھا۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے جہاد کے مسئلے پر کافی غورو غوض کیا تھا اور اپنے ذہن میں اس کے لئے ایک منصوبہ بھی تیار کیا تھا قوی وجوہ موجود ہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ان کے ذہن کا افغانستان اور پٹھان قبائل کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔" (۹)

شاہ ولی اللہ کے نظریات کو بنیاد بنا کر اسے ایک تحریک کی صورت میں پیش کرنا جدید دور کے علماء اور چند مورخوں کا کام ہے اور یہ سب ذہن کی اختراع اور تاریخی حقائق سے دور کی بات ہے اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عہد برطانیہ میں جب انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں علماء نے بھی حصہ لینا شروع کیا' مسلمان معاشرے میں اپنی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ماضی میں اپنے کردار کو شاندار طریقے سے پیش کیا جائے تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ علماء نے ہر موقع پر ہر مرحلے پر مسلمان معاشرے کی قیادت کی ہے اور اس لئے جدید عہد میں بھی ان کی قیادت پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے علماء کی دعوت و عزیمت' ان کی قربانیاں اور ان کی بہادری و حق گوئی کی تاریخ کے ذریعے ثابت کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ علماء کے لئے متحرک اور فعال ہونا اس لئے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان معاشرے کی راہنمائی جدید تعلیم یافتہ اور سیکولر ذہن کے لوگوں کے ہاتھ میں آئے۔

اردو زبان کی یہ بدقسمتی رہی کہ تاریخ نویسی میں سائنسی طریق کار اختیار کرنے کی بجائے اس کو جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا' تاریخ لکھنے کا کام اردو میں اس طبقے نے کیا کہ جس کا تعلق علماء سے تھا۔ لہٰذا اس نے اس کو اپنے مذہبی نظریات کی تشہیر کا ایک ذریعہ بنایا۔ خوش نما الفاظ اور خوب صورت اسلوب کے ساتھ تاریخ کو بیان کیا گیا جس کی وجہ سے تاریخی واقعات اور تاریخی شخصیتیں اپنی شکل کھو بیٹھیں اور ان کی حیثیت تاریخی سے زیادہ مذہبی اور مافوق الفطرت ہوگئی۔

جن علماء نے تاریخ کو مذہبی بنانے کا کام کیا ان میں ابوالکلام آزاد' مولانا مناظر احسن

گیلانی ' مولانا محمد میاں' مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا منظور نعمانی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ حضرات مورخ نہیں تھے اور ان کا مقصد تاریخی حقائق کا کھوج لگانا یا ان کا تجزیہ کرنا نہیں تھا' بلکہ یہ تاریخ کو اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ کے لئے ایک ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی تحریروں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی تاریخی غلط فہمیوں کو پیدا کیا۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے کی ذہنی نشو نما اسی ادب پر ہوتی ہے جو کہ دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ ان تحریروں کے علاوہ اور کوئی دوسری تحریریں نہیں تھیں اس لئے ہمارے معاشرے میں تاریخ کا ایک خاص قسم کا نقطہ نظر پیدا ہو گیا اور وہ ذہن میں اس قدر راسخ ہوگیا کہ اسے دور کرنا یا اس کی اصلاح کرنا ایک مشکل کام ہوگیا ہے۔

مثلاً" بر صغیر ہندوستان کی تاریخ لکھتے ہوئے ہمارے مورخ حالات و واقعات کو صرف اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور لامحالہ طور پر اس طرح سے نقطہ نظر میں تنگی آجاتی ہے اور اپنی غلطیوں اور برائیوں کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کے صحیح ہونے کا جواز تلاش کیا جاتا ہے وہ اس بات کو قطعی طور پر نظر انداز کردیتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں دوسرے مذاہب اور فرقوں کے لوگ بھی تھے' ان کے نقطہ نظر کو بھی سمجھنا چاہئے اور تاریخ کے عمل میں ان کے جذبات کی بھی عکاسی کرنی چاہئے۔ ہمارے مورخ جب مسلمان حکمرانوں یا علماء کے مذہبی تعصب کا دفاع کرتے ہیں تو اس کے جواز میں یک طرفہ طور پر دلائل دیئے جاتے ہیں۔۔ احمد سرہندی کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ بڑا متعصبانہ تھا اس کا جواز پیش کرتے ہوئے' شیخ اکرام ' رود کوثر میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے خطوط میں غیر مسلموں کے بارے میں جس غیض و غضب کا اظہار کیا اور انہیں جا بجا ذلیل کرنے کی تلقین کی تو اس کی وجہ یہ تھی۔

> " اس وقت ہندوؤں میں احیائے مذہب کی تحریک زوروں پر تھی اور اطراف ملک میں اس کے جو مظاہر ہو رہے تھے ان سے باغیرت مسلمانوں کے دل مجروح تھے۔ حضرت کو ان واقعات کا بڑا قلق تھا اور ان کے دل میں انتقام اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی تھی "(۱۰)

یہاں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا دوسرے مذاہب کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے مذہب کا احیاء کریں؟ اس کا دفاع کریں۔ اور کیا یہ حق صرف مسلمانوں کو ہے؟ اس قسم کی دلیل تاریخ میں اکثر دی جاتی ہے کہ محمود غزنوی یا اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کو اس لئے مسمار کیا کہ وہ ہندو سازش کا گڑھ تھے۔ کیا اس کا اطلاق ہم اپنے مذہبی مراکز پر بھی

کرسکتے ہیں؟

اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج تک ہر مسئلے کو صرف یک طرفہ طور پر دیکھتے ہیں اور دوسرے کے دلائل اور خیالات کو بالکل نظرانداز کردیتے ہیں' ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمان "رام راج " کی مذمت کرتا ہے۔ اور پاکستان میں وہ احیائے اسلام کی پرزور تائید کرتا ہے' اس سے نہ صرف ہمارے تاریخی شعور کی ناپختگی ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے ہمارا ذہن بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور تعصب و تنگ نظری ہماری شخصیت میں رچ بس گئی ہے۔

انہی بنیادوں پر پاکستان میں تحریک آزادی کی تاریخ تشکیل کی گئی ہے۔ اس کی ابتدا شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ سے کی جاتی ہے کہ جن کے نظریات کی بنیادوں پر دو قومی نظریے کا جواز دیا جاتا ہے اور ہندوؤں و مسلمانوں میں فرق کو شدید طور پر قائم رکھنے کا سہرا انہیں کے سربندھتا ہے۔ راسخ العقیدگی کی تعریف کی جاتی ہے اوراکبر کو مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے کہ اس نے کیوں ہندوؤں کو حکومت میں شریک کیا' کیونکہ مسلمانوں کی حکومت میں حکومت کرنے کا حق صرف مسلمان کو ہوتا ہے دوسرے اہل مذاہب کو نہیں' ان خیالات پر جو نصابی کتابیں لکھی گئیں ان میں تاریخی واقعات کو اس طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا کہ طالب علم اور قاری ان سے گمراہ ہوتا چلا گیا' واقعات کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو ان شخصیتوں کے نظریات سے واقف ہوا اور نہ ہی ان کے اثرات سے اس تنگ نظری کی وجہ سے ہم کچھ سیکھ سکے اور موجودہ صورت حال اور اس کے مسائل بھی ہماری پہنچ سے دور رہے اور شاید یہی مقصد پاکستان کی تاریخ نویسی کا ہے۔

OO

علماء اور مسائل

سلاطین کے دور حکومت میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی اور ان میں سے بھی اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جو بحیثیت حملہ آور یہاں آئے تھے اور فاتح ہونے کی حیثیت سے ان کے تعلقات ہندوؤں سے بطور مفتوح کے تھے چونکہ ان کی حکومت کی بنیاد تلوار کی طاقت پر تھی اس لئے وہ مفتوح قوم سے ثقافتی و معاشرتی طور پر کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس دور میں ہندوؤں کی رسومات مسلمان معاشرے میں داخل نہیں ہوئیں تھیں۔ اور علماء کا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس سیاسی برتری کو کس طرح برقرار رکھا جائے جو کہ فوجی قوت کی مدد سے حاصل کی گئی تھی' اس لئے ان کا حکومت پر یہ دباؤ تھا کہ ہندوؤں کی رسومات اور مذہبی تہواروں پر پابندی عائد کی جائے اور انہیں یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ انہیں کھلے عام منائیں۔ ان کے مذہبی عقائد کی تضحیک کی جائے اور انہیں سماجی طور پر ذلیل و خوار کر کے رکھا جائے۔

صورت حال میں اس وقت تبدیلی آنا شروع ہوئی جب کہ مقامی لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے۔ تبدیلی مذہب کے ساتھ ساتھ ہی اپنی ثقافتی و سماجی رسومات کو بھی اپنے ساتھ لائے۔ سلاطین کے آخری دنوں میں جب امیر تیمور کے حملوں نے ہندوستان کے سیاسی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور یہاں سے ترکوں کا اقتدار ختم ہوا اور ان کی جگہ افغان خاندان بر سر اقتدار آئے تو انہوں نے غیر ملکی ثقافت کی جگہ ہندوستانی ثقافت کو فروغ دینا شروع کیا' اس عمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا شروع کردیا۔ اسی عہد میں بھگتی تحریک نے ہندوستان کے نچلے طبقوں پر گہرے اثر ڈالے' یہ تحریک عوامی تھی اور نچلے طبقوں سے ابھری تھی' اس کے راہنما کا تعلق بھی ان ذاتوں اور پیشوں سے تھا کہ جنہیں معاشرے نے ٹھکرایا ہوا تھا' اس لئے ان کا تعلق سلطان' دربار' اور امراء سے نہیں تھا بلکہ عوام سے تھا جن کے ذہن کو وسیع کرکے یہ مذہبی نفرت' تشدد اور اختلافات کو مٹا رہے تھے۔ مغل سلطنت کے قیام نے اس اشتراک کے عمل کو زبردست نقصان پہنچایا۔

کیونکہ انہوں نے افغانوں کی حکومت کو ختم کر کے جو کہ ہندوستانی روایات کی بنیادوں پر تھی۔ دوبارہ وسط ایشیا اور ایران کی ثقافتی برتری کو قائم کردیا۔ سلاطین دہلی اور افغان حکمرانوں کو سب سے زیادہ خطرہ شمال مغربی سرحدوں سے تھا اور اس لئے انہوں نے ان سرحدوں کو بند کر رکھا تھا اور باقاعدہ فوجیں تعینات تھیں تاکہ اس طرف سے حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے ان کا راستہ روکا جائے۔ مغلوں نے اقتدار میں آنے کے بعد ان راستوں کو کھول دیا کیونکہ کابل انکی سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور انہیں اس جانب سے کسی حملے کا خطرہ نہیں تھا' اس وجہ سے وسط ایشیا و ایران سے ان راستوں سے نئے آنے والوں کی آمد شروع ہوگئی اور جب یہ نو وارد ہندوستان میں آئے تو انہوں نے ایک بار پھر غیر ملکی ثقافت کو ہندوستان میں مضبوط کردیا۔

اس پر پہلی کاری ضرب اکبر نے لگائی کہ جس نے غیر ملکی اثرات کو دربار سے نکال کر ان کی جگہ ہندوستانی روایات کو شروع کیا۔ مغلوں کے آخری دور حکومت میں اشتراک کا عمل خصوصیت سے تیز ہوگیا اور معاشرے کے اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں میں ثقافتی ہم آہنگی بڑھ گئی' دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہونے لگے بلکہ انہوں نے بہت سے مشترک تہواروں کو بھی تخلیق کیا۔

اس لئے علماء کے سامنے اب یہ مسئلہ آیا کہ ان غیر مسلم تہواروں' تقریبوں اور روایات کو کس طرح سے مسلمان معاشرے سے نکالا جائے۔ چنانچہ اس دور میں مسلمانوں کی شناخت کے مسئلے نے ان کے لئے انتہائی اہمیت اختیار کرلی۔ اسی مسئلے کے ساتھ عہد مغلیہ میں دوسرا مسئلہ شیعوں کا پیدا ہوا عہد سلاطین میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی' اس لئے اس وقت شیعہ سنی تنازعے کی اہمیت نہ تھی' ہمایوں کی ایران سے واپسی پر شیعوں کی ہندوستان میں آمد شروع ہوئی اور اکبر کے دور میں ان کا عمل دخل انتظامیہ میں بڑھ گیا جس نے شیعہ سنی جھگڑوں کی ابتدا کی۔ آخری عہد مغلیہ میں بعض شیعہ امراء فوجی طاقت کے ذریعے اقتدار پر بھی قابض رہے اور جب اودھ میں ان کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ایک سیاسی قوت بن کر ابھرے۔ اس تمام عمل میں شیعہ سنی علماء کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن گئے' اور ہندو رسومات کے ساتھ ساتھ ان کے لئے بھی ان کے لب و لہجہ میں بڑی تلخی پیدا ہوگئی۔ روافض کے خلاف سنی علماء نے تحریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا' جس کا جواب شیعہ علماء نے دیا اس طرح اختلافات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے اور دونوں طرف کے علماء کا طبقہ ہی ان کے دفاع کے لئے تھا جو ان کے عقائد کا تحفظ کر رہا تھا۔ اس لئے دونوں طبقوں

میں علماء کی عزت و احترام کے جذبات بڑھے۔

انگریزوں کی فتح کے بعد علماء کے مسائل میں مزید اضافہ ہوا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ پیدا ہوا کہ کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارلسلام؟ اگر دارالحرب ہے تو پھر کیا اس ملک سے ہجرت کی جائے یا جہاد کیا جائے؟ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہجرت نہ کی جائے اور یہاں رہائش برقرار رکھی جائے تو کیا اس صورت میں انگریز کی ملازمت کی جائے؟ کیا انگریزی زبان کو سیکھا جائے ؟ اور کیا انگریزی طور طریق اور آداب کو اختیار کیا جائے؟ یہ وہ مسائل تھے کہ جن پر علماء نے اپنے اپنے مفادات کی روشنی میں فتوے دیئے۔ ولی اللہ خاندان کے سربراہ شاہ عبدالعزیز کا اس سلسلے میں یہ موقف تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے لیکن ہندوستان سے ہجرت ضروری نہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان پڑھنے کی بھی اجازت دے دی۔ بلکہ اپنے بھتیجے مولوی عبدالحیٔ کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرنے سے نہیں روکا اس پر عہد کے ممتاز صوفی و عالم شاہ غلام علی نے ان کی مخالفت کی تو عبدالعزیز نے انہیں یہ جواب دیا کہ قاضی و مفتی اور انتظامیہ کے وہ عہدے کہ جہاں وہ دین کی خدمت کر سکتے ہیں ملازمت کرنا چاہئے (۱۱)

اس طرح عہد سلاطین سے لے کر انگریزوں کی فتح تک علماء کے مسائل میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور جو مسائل ابتدا سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ ختم نہیں ہوئے بلکہ اسی طرح سے اپنی جگہ برقرار رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء کا کام مسئلوں کو حل کرنا نہیں بلکہ مسئلوں کو پیدا کرنا تھا' کیونکہ جیسے جیسے مسلمان معاشرے کو ان مسائل میں الجھایا جاتا رہا۔ ویسے ویسے معاشرے میں علماء کا اثرو رسوخ بڑھتا رہا اور وہ معاشرے کے رہنما بنتے رہے۔ اس لئے انہوں نے ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے نئے مسائل دریافت کرتے گئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق قائم رکھنے میں علماء نے ابتداء ہی سے تشدد اور تعصب سے کام لیا۔ اس کی مثال عہد سلاطین میں علماء کے ان بیانات سے ملتی ہے کہ جس میں انہوں نے التمش سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ یا تو ان سب کو قتل کر دیا جائے یا ذلیل و خوار کر کے رکھا جائے۔ احمد سرہندی نے بھی انہیں خیالات کا اظہار عہد مغلیہ میں کیا اور ہر اس تحریک کی مخالفت کی جس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا ہوتا اور ان میں ثقافتی ہم آہنگی پروان چڑھتی ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بار بار اس کا اظہار کیا کہ ہندوؤں کو ذلیل و خوار کرکے رکھا جائے۔ اور ان کے مذہبی تہواروں پر پابندی عائد کی

جائے۔ شیخ فرید کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"پس اسلام کی عزت و کفر اور کافروں کی خواری میں ہے' جس نے سہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اسلام کو خوار کیا۔ انہیں عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح انہیں دور کرنا چاہئے (۱۲)

اس طرح سے احمد سرہندی کے خیالات اکبر کی جدیدیت کے خلاف تھے۔ اکبر نے جس روشن خیالی کی تحریک شروع کی تھی اس میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ مسلمان فاتحین مذہب کی آڑ لے کر جو مفتوحین کو ذلیل کرتے ہیں اس سے انہیں آزاد کرایا جائے۔ یہ علماء کے لئے ایک ناپسندیدہ پالیسی تھی کیونکہ اس صورت میں معاشرے میں ان کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی۔

ہندوؤں کے ساتھ اسی تشدد کی پالیسی کو شاہ ولی اللہ نے جاری رکھا' انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا' جس کا حوالہ اطہر عباس رضوی نے اپنی کتاب "شاہ عبدالعزیز" میں دیا ہے لکھا ہے کہ:

"تمام مسلمان شہروں کو یہ حکم دینا چاہئے کہ کافر اپنے تہوار کھلے عام نہ منائیں جیسے ہولی یا گنگا میں نہانا" (۱۳)

شاہ ولی اللہ کا رویہ جو ہندوؤں سے تھا وہ ان کے ایک خواب سے ظاہر ہوتا ہے۔

"میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ میں قائم الزماں ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر کے کسی نظام کو قائم کرنا چاہتا ہے تو اس وقت مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے گویا ایک آلہ اور واسطہ بناتا ہے اور میں نے دیکھا کہ کفار کا راجہ (یا بادشاہ) مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہوگیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا' ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا' اور اجمیر شہر میں اس نے کفر کے شعائر کا اعلان کردیا۔ شعائر اسلام کو اس نے مٹادیا (خدا کی پناہ) پھر اس کے بعد یہ دیکھا کہ زمین کے باشندوں پر حق تعالیٰ غضب ناک ہوئے اور سخت غضب ناک اور میں نے حق تعالیٰ کے غصہ کی صورت کو ملاء اعلیٰ میں مکمل ہوتے ہوئے دیکھا' اور پھر وہاں سے ٹپک کر الٰہی غیض میرے اندر اترا۔ پھر میں نے اپنے کو

غضب ناک پایا' اور یہ غضب جو مجھ میں بھر گیا تھا حضرت الہیہ کی طرف سے مجھ میں دم کیا گیا .... پھر میں ایک شہر کی طرف اسے برباد کرتے ہوئے اور اس کے باشندوں کو قتل کرتے ہوئے آگے بڑھا لوگ میرے ساتھ تھے۔ یوں ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ و برباد کرتے ہوئے ہم بالآخر اجمیر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا۔ پھر میں نے کفار کے بادشاہ کو دیکھا کہ وہ اسلام کے بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ چل رہا ہے۔ اتنے میں اسلام کے بادشاہ نے کفار کے بادشاہ کے متعلق حکم دیا کہ اسے ذبح کردیا جائے۔ لوگوں نے اسے پکڑ کر دے پٹکا اور چھری سے اُسے ذبح کردیا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس کی گردن کی شہ رگوں سے خون اچھل اچھل کر نکل رہا ہے تب میں نے کہا اب رحمت نازل ہوگئی (۱۴)

اسی طرح انہوں نے اپنے خط میں ایک جگہ سلاطین سے سے مخاطب ہوکر کہا کہ:

"اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہوچکی ہے کہ تمام تلواریں کھینچ لو۔ اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم اور مشرک سے جدا نہ ہوجائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جاکر شامل نہ ہوجائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں" (۱۵)

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس فرق کو باقی رکھتے ہوئے احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ دونوں نے اشتراک اور ہم آہنگی کی سخت مخالفت کی۔ اس طرح انہوں نے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے بر عکس یہ نقطہ' نظر اختیار کیا کہ ہندو ذمی نہیں کافر ہیں' لہٰذا انہیں ذمیوں کے حقوق حاصل نہیں ہونے چاہئیں اور انہیں ہر ممکن طریقے سے ذلیل کرکے رکھنا چاہئے اس لئے شاہ ولی اللہ شناخت کے سلسلے میں اس کے قائل ہیں کہ:

"مسلمانوں کو خواہ وہ کسی ملک میں اپنی ابتدائی زندگی گزاریں لیکن بہر حال اپنی وضع قطع اور طرز بود و ماند میں ان کو اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعی جدا رہنا چاہئے اور جہاں کہیں رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات میں ڈوبے رہیں۔" (۱۶)

وہ غیر عربی ثقافت کو اختیار کرنے کے سخت مخالف ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"خبردار! بچے رہنا اس تونگر میں امیر سرکش خواہ مخواہ غیروں اور عجمیوں کے فیشن کو زبردستی اختیار کرتا ہے اور جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں' ان سے

مقابلہ اور برابری میں گھسا رہتا ہے۔" (۱۷)

علماء نے ہندوستان میں ان سوالات کو ہمیشہ زندہ رکھا کہ کیا ہندو طور طریق' رسومات زبان اور مذہب کے بارے میں سیکھنا' جاننا' ان کے ساتھ شریک ہونا ان کا کھانا کھانا ان سے کھانے کی چیزیں خریدنا یہ سب جائز ہیں؟ شناخت کا یہ مسئلہ ابتدا ہی سے مسلمان حکمراں طبقوں کے لئے اہم رہا تھا کیونکہ اس مسئلے کا تعلق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد سے تھا۔ اگر یہ تعداد ہندوستان کی ثقافتی زندگی میں گم ہوجاتی تو ان کی سیاسی حیثیت کمزور ہوجاتی دوسرے ثقافتی ہم آہنگی نفرت اور عداوت اور دشمنی کو کم کرتی ہے اور میل ملاپ کو فروغ دیتی ہے۔ اس صورت میں ان کی مہم جویانہ جنگوں کو نقصان پہنچتا جو وہ برابر ہندوؤں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس لئے یہ حکمراں طبقوں کے مفاد میں تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں علیحدگی رہے اور ان کے درمیان ثقافتی روابط پیدا نہ ہوں تاکہ ان کی فوجی قوت کمزور نہ ہو اور انہیں برابر فوجی ملتے رہیں۔ علماء کا مفاد بھی علیحدگی میں تھا کیونکہ ان کی مذہبی سربراہی کا دارو مدار مسلمانوں کی تعداد پر تھا' اگر مسلمان معاشرے میں مذہبی اثرات کم ہوجاتے تو ان کا اثر بھی گھٹ جاتا اور ان کی معاش کے ذرائع ختم ہوجاتے۔

علماء نے جن ہندووانہ اور غیر اسلامی رسم و رواج کے خلاف ابتداء سے مخالفت کی وہ دو قسم کی تھیں' اول وہ رسومات جو ثقافتی و سماجی تہواروں اور موقعوں پر ہوتی تھیں ان میں میلے' ٹھیلے اور شادی و بیاہ کی تقریبات وغیرہ تھیں' دوسری قسم کی وہ رسومات تھیں کہ جو معاشرے کے سماجی و معاشی ماحول کی نتیجے میں پیدا ہوتی تھیں جیسے چیچک کی دیوی ستیلا کی پرستش وغیرہ۔ اس لئے ان دونوں قسموں کے فروغ کی وجوہات جدا تھیں۔

انسان کی فطرت میں لطف اندوز ہونے اور خوشی و مسرت سے محظوظ ہونے کے جذبات چھپے ہوئے ہیں اور وہ رقص و موسیقی کے ذریعے اپنے ان جذبات کی تسکین کرتا ہے' کیونکہ اس کی وجہ سے زندگی میں جو غم و اندوہ اور یاس کے سائے ہیں وہ دور ہوتے ہیں اور تفریح کے لمحات اسے جسمانی اور روحانی طور پر صحت مند بناتے ہیں۔ اس لئے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر موقعہ اور تہوار کو اپنی خوشی و مسرت کے لئے استعمال کرے' اس کی زندگی کے اس پہلو کو مقبول مذہب پورا کرتا ہے' کیونکہ اس میں وہ مذہبی روایات' رسومات اور تہواروں کو رقص و موسیقی کے ذریعے رنگین بناتا ہے' اس سے ایک عام آدمی کو ثقافتی وجود ملتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں جو دکھ محرومیاں اور اداسیاں ہیں وہ دور ہوتی ہیں۔ اور اس کی کچلی ہوئی شخصیت ایسے موقعوں پر پوری طرح سے ابھرتی ہے' شور و غل' ہنگاموں

اور چیخ و پکار میں اس کی شخصیت کی چھپی ہوئی اور خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

چونکہ عرب کے تہوار ثقافتی طور پر اتنے رنگین اور دلکش نہیں تھے جتنے ایران و ہندوستان کے۔ لازمی طور پر مسلمان ان سے متاثر ہوئے' اور تبدیلی مذہب کے بعد لوگ ان روایات کو بطور ورثہ اپنے ساتھ لائے اور انہوں نے ان تہواروں اور رسومات کو جاری رکھا اس لئے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں نو روز کا تہوار بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا رہا۔ ہندوستان میں بھی مسلمان امراء اور عوام ہندو تہوار دسہرہ' ہولی' اور دیوالی منانے لگے اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان کے مقابلے میں اپنے تہواروں میں بھی وہی روایات اختیار کرلیں' جیسے شب برات میں دیوالی کی طرح روشنی ہونے لگی محرم کے موقعہ پر تعزیہ نکالنے اور جلوس نکالنے میں تلوار بازی و بنوٹ کے کرتب دکھائے جانے لگے۔ اسی طرح بہت سے ثقافتی رسومات کو اختیار کرکے زندگی میں رنگینی و جاذبیت پیدا کی گئی' مثلاً" شادی و بیاہ کے موقعوں پر ہندوستان کی بہت سے رسومات کو اختیار کیا گیا۔

طبقاتی معاشروں میں یہ رسومات طبقاتی فرق اور شان وشوکت کا اظہار بھی بن جاتی ہیں اس لئے ہندوستان کے جاگیردار معاشرے میں ان کے ذریعے وہ اپنے سماجی فرق کو ظاہر کرنے لگے اور فاتحہ' نذر نیاز' اور چڑھاووں میں اپنی طبقاتی برتری کو برقرار رکھنے لگے۔ پھر اس طبقے کی بے کاری اور دولت کی فراوانی نے مختلف تہواروں پر کھانے کی مختلف قسموں کا رواج دیا۔ اور اس طرح سے یہ تہوار اور رسومات معاشرے کے لئے ایک اقتصادی بوجھ بن گئیں۔ اس صورت حال میں خرابی معاشرے کی ناہمواری اور طبقاتی تقسیم تھی جس نے ان رسومات کو اپنے لئے استعمال کیا۔ اس لئے جب رسومات کے خلاف علماء نے تحریک شروع کی تو محض تحریک سے یہ رسومات ختم نہیں ہوئیں' کیونکہ ان کے خاتمے کے لئے ضروری تھا کہ معاشرے کی ساخت اور بناوٹ پر حملہ کیا جاتا' تاکہ ان رسومات نے جو فرق عوام و خواص میں پیدا کر دیا تھا وہ دور ہوتا اسی لئے یہ رسومات اور تہوار معاشرے میں موجود رہے اور علماء کی مخالفت کے باوجود اسی طرح برقرار رہے' کیونکہ ایک طرف ان میں سادگی اس لئے نہیں آسکتی تھی کہ جن کے پاس دولت تھی' وہ اس کا استعمال چاہتے تھے' دوسرے یہ انسانی فطرت کی ضرورت تھی کہ جو ان سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

غیر اسلامی رسومات کی تفصیل جو اسماعیل شہید نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان میں دی ہے اور اس میں جن رسومات کو شامل کیا ہے وہ یہ ہیں' شادی میں سہرا باندھنا' ڈاڑھی منڈانا' عید پر بغل گیر ہونا' شب برات میں روشنی کرنا' گدھے خچر اور اونٹ کی سواری کو معیوب

سمجھنا' تعزیہ' جھنڈے و قدم رسول کی تعظیم کرنا' لڑکے کی پیدائش پر بکرا ذبح کرنا' بندوقیں چھوڑنا' ختنے کے موقع پر تقریب کرنا' نکاح میں موتی باندھنا' آتش بازی و روشنی کی سیڑھی کا تماشہ کرنا' ناچ کرانا' سرخ کپڑے پہننا' مرد کو مہندی لگانا' شادی سے پہلے برلوری کا کھانا کرنا' چوتھی کھیلنا' محرم میں زینت ترک کردینا' محرم کی محفلیں برپا کرنا' علم چڑھانا' ربیع الاول میں میلاد کی محفل' عید پر سویاں پکانا' عید پر مصافحہ کرنا' موسیقی و راگ کا شوق' اپنے نسب پر فخر کرنا' آپس میں ایک دوسرے کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا' مہر بہت زیادہ باندھنا' شادیوں میں بے جا اسراف' خود کی زیب و زینت کرنا' مجلسی آداب میں آداب و تسلیم کا رواج اور اسلام و علیکم کا کہنا ترک کرنا وغیرہ۔ (۱۸)

دوسری قسم کی وہ رسومات تھیں جو کہ تعلیم کی کمی سیاسی و سماجی اور معاشی ٹوٹ پھوٹ اور ضعیف الاعتقادی و توہمات کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں۔ تقویۃ الایمان میں ان کی تفصیل اس طرح سے ہے' مردوں سے حاجتیں مانگنا' شگون لینا' تاریخ اور دن کو نحوست و سعادت ماننا' زچہ کی چارپائی پر تیر اور کلام اللہ رکھنا' قبروں کی زیارت کرنا' چراغ جلانا' عورتوں کا مزاروں پر جانا' چادر چڑھانا' پکی قبر بنانا' قبروں پر تاریخیں اور آیتیں لکھنا' مجاور بن جانا' ستیلا کی پرستش کرنا' بیوہ عورتوں کی شادی نہ کرنا وغیرہ (۱۹)

صراط مستقیم میں اسماعیل شہید لکھتے ہیں کہ:

> "سننا چاہئے کہ اکثر لوگ پیروں' پیغمبروں اور اماموں کو اور شہیدوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانگتے ہیں اور حاجت بر آئی کے لئے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں .... کوئی کسی کے نام پر جانور ذبح کرتا ہے کوئی مشکل کے وقت دھائی دیتا ہے۔ کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے" (۲۰)

پیروں اور مزاروں کو وسیلہ بنانا' ان سے مرادیں مانگنا اور اپنے تمام مسائل کے حل کے لئے ان پر بھروسہ کرنا' یہ برصغیر میں مسلمان حکمران خاندانوں کے سیاسی نظام کے زیر اثر پیدا ہوا' کیونکہ ایک ایسا نظام کہ جس میں طبقاتی تقسیم تھی وہاں بادشاہ اور امراء کے دربار تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی' اور وہ لوگوں کی پہنچ سے دور تھے۔ جب تک کوئی وسیلہ یا سفارش نہ ہو ان تک جایا نہیں جاسکتا تھا' اس ذہنیت نے ان عقائد کی تشکیل کی کہ خدا تک بغیر کسی وسیلے کے وہ براہ راست رسائی حاصل نہیں کرسکتا ہے' اور اس کے لئے اسے کسی وسیلے یا مدد کی ضرورت ہے۔ یہ وسیلہ اس نے پیروں' صوفیوں' اور اولیاء کی ذات میں

پایا' چونکہ اس عقیدے سے پیروں اور صوفیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا تھا اور اس سے ان کے معاشی مفادات بھی وابستہ تھے اس لئے انہوں نے اسے مستحکم کرنے میں حصہ لیا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آخری عہد مغلیہ میں صوفیوں اور پیروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا جو لمبی لمبی زلفیں بڑھائے' عطر لگائے مریدوں کے جم غفیر کے ساتھ' عوام کو کرامات دکھا کر مرعوب کرتے تھے' عوام میں ان کے لئے اعتقاد اس لئے بڑھا کہ اس عہد کی ٹوٹ پھوٹ میں بھوک' افلاس ' بیماری ' روزمرہ کے مسائل کا انبار ' پریشانیاں الجھنیں ' کم مائیگی کا احساس اور عدم تحفظ یہ سب وہ حالات تھے کہ محروم اور بے کس عوام مافوق الفطرت طاقتوں کی جانب بڑھنے لگے' ان پر بھروسہ کرنے لگے اور کرامات و معجزوں کے منتظر رہنے لگے اس لئے ایک طرف عوام معاشرے کے ظلم اور معاش و معاشرتی نا آسودگی کا حل مزاروں اور پیروں کے ہاں ڈھونڈتے تو دوسری طرف صوفیاء اور پیروں کا استحصالی طبقہ اس سے فائدہ اٹھا کر قبر پرستی کو رواج دے کر نذرو نیاز' تحفے تحائف ' اور چڑھاوے وصول کررہا تھا۔

عہد مغلیہ کے آخری دور میں علماء کو یہ شکایت تھی کہ عورتیں کثرت سے مزاروں پر جاتی ہیں اور وہاں بے پردگی و بے شرمی کے مظاہرے ہوتے ہیں' لیکن کسی نے اس کے پس منظر اور اس کی بنیادی وجہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورت کو چادر چاردیواری میں قید کرکے رکھا جائے گا' اس کی آزادی کے تمام راستے بند کردیئے جائیں گے۔ اس کی تفریح کے تمام مواقع کو حرام قرار دیا جائے گا' تو ان حالات میں اس کی یہ فطری خواہش کہ وہ کس طرح اس زنداں سے نکلے اور باہر دنیا دیکھے شدید ہوتی چلی جائے گی۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ وہ منت و مرادیں مانگنے اور چڑھاوے چڑھانے کی خاطر مزاروں پر جائے۔ ان کی تفریح کا یہ واحد ذریعہ رہ گیا تھا جسے وہ پوری طرح سے استعمال کرنا چاہتی تھی' اس عہد کی اس رسم پر مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> "شرفا کی خواتین میں پیر پرستی کی انتہا ہوگئی تھی اور اس پردے میں بد وضع لوگوں کی بن آئی تھی۔ وہ اپنی ناواجب خواہش حاصل کرنے کے لئے شریف زادیوں پر تاک جھانک کیا کرتے تھے۔ ہر سال بڑی بڑی قبروں پر شرفا کی بہو' بیٹیوں کے ہجوم رہتے تھے اور کوئی روکنے والا نہ تھا' پردے کی کچھ پرواہ نہ تھی۔" (۲۱)

ان حالات میں علماء کی یہ کوششیں تھیں کہ عورتیں پردے میں رہیں' ان میں جو

توہمات پیدا ہوگئے ہیں وہ دور ہوجائیں لیکن ان تمام خرابیوں کی جو اصل وجہ تھی اسے دور کرنے کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا ان سب باتوں کا تعلق سماج میں عورت کے مقام سے تھا۔ کیونکہ ایک ایسے سماج میں کہ جس میں عورت کی حیثیت ملکیت کی تھی اور اسے مرد سے انتہائی کم تر سمجھا جاتا تھا' تو اس صورت میں نہ تو اس کی معاشرے میں عزت تھی اور نہ اس کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا' اس لئے محض یہ کہنا کہ بیوہ عورتوں سے شادی کی جائے۔ کافی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے پس منظر میں یہ تصور تھا کہ وہ کسی اور کی ملکیت میں رہ چکی ہے اور کسی دوسرے کے تصوف میں آکر وہ فرسودہ ہوچکی ہے۔ اس لئے معاشرتی طور پر کنواری عورت کے مقابلے میں اس کی حیثیت کم تر ہوجاتی تھی۔ اور پھر وہ بیوہ ہوجانے کی ذمہ دار بھی عورت ہی تھی اور اس لحاظ سے اسے منحوس خیال کیا جاتا تھا اور کوئی اس سے سماجی تعلقات رکھنے کا روادار نہیں تھا۔ یہ تصورات اسی وقت تبدیل ہوسکتے تھے کہ معاشرے میں عورت کا درجہ بلند ہوتا اور اسے مرد کے برابر حقوق ملتے۔ مگر علماء میں کوئی عورت کو یہ مقام دینے پر تیار نہ تھا اور وہ محض معمولی اصلاحات پر توجہ دے رہے تھے اس لئے ان کی تمام کوششوں کے باوجود یہ مسائل اسی طرح سے برقرار رہے۔ عورتوں میں توہمات اس لئے باقی رہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ جہالت و محدود دنیا نے انہیں ناواقفیت اور توہم پرستی میں الجھادیا تھا۔ اس سے چھٹکارا اسی وقت مل سکتا تھا جب کہ ان میں تعلیم عام ہوتی اور ان کے لئے دنیا کھلی ہوتی۔

اسی طرح جب لوگ چیچک کی بیماری سے بچنے کے لئے ستیلا دیوی کو چڑھاوے چڑھاتے تھے یا بیماریوں کے علاج کے لئے تعویز گنڈے' پیروں کی دعاؤں اور منتوں کی طرف رجوع ہوتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرے میں ان بیماریوں کے علاج کے لئے نہ تو دوائیں تھیں نہ ہسپتال تھے' نہ حکیموں اور ویدوں کی اتنی تعداد تھی کہ وہ مریضوں کا علاج کرسکیں اور نہ غریبوں کی اتنی استطاعت تھی کہ وہ علاج کے اخراجات برداشت کرسکتے۔ ان حالات میں لوگوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ بیماری کے لئے دعاؤں اور تعویزوں کا سہارا لیں۔ اور یہ صحت یاب ہوجائیں۔ یا مرجائیں۔

معاشرتی و معاشی اصلاحات کے لئے صرف تلقین اور وعظ کافی نہیں ہوا کرتا ہے کسی چیز کو محض اچھا یا برا کہنے سے نہ تو اسے چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ اختیار کیا جاسکتا ہے علماء نے اصلاحات کے جو طریقے اختیار کئے وہ تلقین اور تشدد کے تھے۔ لوگوں کو ڈرانا دھمکانا اور آخرت کے عذاب سے ہراساں کرنا وہ طریقے تھے کہ جن کے ذریعے لوگوں کو ذہنی طور پر

تبدیل کرنا چاہتے تھے' لیکن ان طریقوں سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکی۔ کیونکہ ان کی وجوہات دوسری تھیں' مثلاً" اب جب کہ چیچک کی بیماری کی دوائیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اور مریض ان دواؤں سے صحت یاب ہو جاتے ہیں تو اب کوئی ستیلا دیوی کو چڑھاوے نہیں چڑھاتا' اس لئے جب تک لوگوں کو صحت کی سہولتیں نہیں پہنچیں گی جب تک لوگوں میں نا آسودگی اور محرومی رہے گی اس وقت تک معاشرے میں پیروں کا اثرو رسوخ باقی رہے گا۔ اور لوگ مزاروں پر جاکر اپنی مرادیں مانگتے رہیں گے۔ جن معاشروں میں لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہو گئیں ہیں۔ وہاں یہ تمام توہمات خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔

اصلاح کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ معاشرے میں سب سے پہلے تعلیم کا فروغ ہو' سائنسی و فنی ایجادات ہوں' بیماریوں کی دوائیں دریافت کی جائیں اور انہیں لوگوں تک پہنچایا جائے صرف اسی صورت میں توہمات ' ضعیف الاعتقادی اور مافوق الفطرت عقائد کا خاتمہ ہوگا۔ جب تک عام انسان کی ذہنی سطح کو بلند نہ کیا جائے اس وقت تک محض وعظ اور تشدد کے ذریعے کوئی معاشرتی یا معاشی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

برصغیر ہندوستان میں جب بھی علماء نے ان اصلاحات کی تحریک چلائی تو وہ اس لئے ناکام رہے کہ انہوں نے معاشرتی برائیوں کی وجوہات کو تلاش نہیں کیا اور انہیں محض کافرانہ و مشرکانہ کہہ کہ ان کی مخالفت کرتے رہے۔

احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید تینوں نے ہندوستان میں اپنے جس مشن کا اعلان کیا اس کے تحت وہ مذہب سے ہندووانہ روایات۔کو نکال کر اسلام کو خالص اور اور پاک کرنا چاہتے تھے اور اس کو قرون اولی کی اصلی شکل میں واپس لانا چاہتے تھے۔ اس لئے ان کی یہ کوششیں اصلاح دین اور احیائے دین کے دائرے میں آتی ہیں۔ یہ تینوں حضرات اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دین اسلام کو پاک کرنے کی ذمہ داری انہیں خدا کی جانب سے سپرد ہوئی ہے اور اسی لئے ان میں فخرو مباہات کا عنصر صاف اور واضح طور پر نظر آتا ہے کہ وہ خود کو عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے انتہائی اہم سمجھتے تھے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے مخالفین پر شدت سے حملے کرنا انہیں برا بھلا کہنا اور ان پر سخت انداز میں تنقید کرنا ان کے کردار کا حصہ تھا' احمد سرہندی اس شدت کو فخر سے "آگ فاروقی" کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کو خواب میں یہ بشارت ملی کہ:

"چنانچہ اس مجلس میں نبی علیہ الصلوۃ و السلام نے مجھے اجمال مدد سے سرفراز فرمایا اور یہ اجمال مدد عبارت تھی مقام مجددیت و صامیت اور قطبیت ارشاد

سے یعنی مجھے ان مناصب سے نوازا اور مجھے شرف قبولیت عطا فرمایا اور امامت بخشی۔ (۲۲)

سید احمد شہید نے اصلاح دین کی جو تحریک شروع کی تھی۔ وہ اسے "طریقہ محمدیہ" کے نام سے پکارتے تھے بعد میں انہوں نے بھی مہدی اور امام ہونے کے دعوے کئے۔

احمد سرہندی نے ہندوستان میں مذہبی اصلاحات اور احیاء کی جو کوششیں کیں' اس کا ذریعہ انہوں نے عوام کو نہیں بنایا بلکہ اس بات کی کوشش کی کہ بادشاہ اور اس کے امراء کو تبدیل کر کے ان کے ذریعہ شریعت کے نظام کو نافذ کیا جائے۔ اس لئے وہ سیاسی و معاشی اور سماجی نظام کو تبدیل کرنے کے خواہش مند نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی انہوں نے بادشاہت کے نظام اور امراء کے کردار کی خرابیوں کا تذکرہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مغل خاندان ہندوستان میں انتہائی مضبوط بنیادوں پر قائم تھا اور مسلمان حکمراں طبقے سیاسی و معاشی طور پر مستحکم تھے' اس لئے وہ اس سیاسی نظام کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس نظام کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر کے ایک امیر خان جہاں کو ایک خط میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

• "آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ مثل روح کے ہے اور باقی انسان بمنزلہ جسم کے اگر روح ٹھیک ہوتی ہے تو جسم بھی صحیح و سالم رہتا ہے...... پس بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا ہے دراصل تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کرنا ہے اور یہ اصلاح اس طرح ہو سکتی ہے کہ جب موقع ملے اور گنجائش نظر آئے صحیح اسلامی تعلیمات ان کے کان میں ڈالی جائیں" (۲۳)

دوسری طرف ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام میں جس قدر بھی بدعات آئی ہیں' چاہے وہ اچھی ہوں یا بری۔ انہوں نے مذہب کی روح کو بگاڑ دیا ہے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"دین میں جو نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں اور جو بدعتیں ایجاد کی گئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زمانے میں موجود نہ تھیں اگرچہ وہ روشنی میں سفیدی صبح کی طرح ہوں پھر بھی اس ناتواں کو ان سے محفوظ رکھے اور ان میں مبتلا نہ کرے" (۲۴)

یہاں احمد سرہندی دوسرے احیائے دین کے رہنماؤں کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ عرب میں جو معاشرہ اسلام کے ابتدائی دور میں قائم ہوا تھا وہ ایک مثالی معاشرہ تھا اور جیسے جیسے تاریخی عمل آگے بڑھتا گیا اس مثالی معاشرے کو مسخ کرتا گیا' اس لئے ہر بدعت نے اس کو

خراب کرنے میں حصہ لیا' اس لئے واضح راستہ یہی ہے کہ ان بدعتوں کو ختم کیا جائے اور اس مثالی معاشرے کی قدیم شکل و صورت کو واپس لایا جائے۔ اس لحاظ سے وہ اس تاریخی عمل کے سخت مخالف ہیں۔ کہ جو آگے کی جانب بڑھ رہا ہے وہ اسے واپس لوٹاکر ایک جگہ منجمد کرنا چاہتے تھے۔

ان کے بر عکس شاہ ولی اللہ کا نقطہ نظراس وجہ سے بدل گیا کہ ان کے زمانے میں مغل خاندان کا استحکام ختم ہوچکا تھا اور بادشاہت کا ادارہ اپنی خرابیوں کے بوجھ تلے دب کر شکستہ ہوچکا تھا۔ امراء عیاشیوں اور بد عنوانیوں کا شکار تھے۔ غیر مسلم فوجی طاقتیں مغل سلطنت کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی نظام پر تنقید کی۔ اور بادشاہ و امراء کی بد عنوانیوں کو ظاہر کیا۔ لیکن پھر بھی وہ اسی نظام کا استحکام اصلاحات کے بعد چاہتے تھے۔ اس لئے وہ کبھی روہیلہ سردار نجیب اللہ سے رجوع کرتے ہیں اور کبھی احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دیتے ہیں' انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ ایک محدود دائرے میں کیا' وہ سکھوں 'جاٹوں ' مرہٹوں کی قوم پرستی کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر رہے' وہ اس کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کو اس کے بنیادی حقوق ملنے چاہئیں۔ انہیں یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کا دفاع کریں اور حکومت میں شریک ہوں۔ اسی طرح وہ ہندوستان میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرو رسوخ کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے سیاسی و معاشی اصلاحات کا جو خاکہ بنا وہ ایک نامکمل خاکہ تھا جس میں مسلمان حکمراں طبقوں کو دوبارہ استحکام کے مواقع تھے۔

سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی صورت حال اور بھی مختلف تھی کیونکہ ان کے زمانہ میں انگریز اپنا اقتدار مستحکم کرچکے تھے اور انہیں شکست دینے کی تمام کوششیں ناکام ہوچکی تھیں ۱۸۰۳ء میں وہ دہلی پر قابض ہوکر مغل بادشاہ کو اپنے زیر نگیں کر چکے تھے' ہندوستان کے عوام جو طویل خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار سے تنگ آچکے تھے اب سکون اور اطمینان کا سانس لینا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان کا سیاسی نظام تو بدلا مگر انہوں نے ہندوستان کے مذاہب میں دخل نہیں دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی دے دی۔ اس لئے ان کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ انگریزی عمل داری میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے' دوسرے انگریزی فوجی قوت کے سامنے ان کی کامیابی کے امکانات بھی نہیں تھے اس لئے انہوں نے صرف مذہبی اصلاحات پر زور دیا اور سیاسی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ سرحد کے علاقوں میں بنایا۔

مذہبی اصلاحات کے ذریعے سید احمد شہید ہندوستان میں مسلمانوں کی شناخت کو ابھارنا چاہتے تھے' کیونکہ اس کے بغیر نہ تو ان کی تحریک کو مالی امداد مل سکتی تھی اور نہ ہی رضاکار۔ لہٰذا ان کی تحریک کی پہلی کوشش تو یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو شدید کردیا جائے اور جب یہ ہوجائے تو ان میں مذہبی جوش و خروش پیدا کیا جائے۔ اور انہیں اسلام کے نام پر متحد کیا جائے چونکہ انگریزی عمل داری میں اسلام خطرے میں نہیں تھا' اس لئے انہوں نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت میں اسلام کو خطرے میں بتایا۔ کہ یہاں اسلامی عقائد و قوانین کو ختم کرکے مسلمانوں کو ذلیل کیا جارہا تھا۔ اس ذریعے سے وہ لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر اپنی تحریک کو مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ اور اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

○

جہاد تحریک

سید احمد شہید ۱۷۸۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸ سال کی عمر میں ملازمت کی تلاش میں نکلے اور لکھنؤ آئے مگر انہیں ناکامی ہوئی اور ملازمت نہ مل سکی۔ اس پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے دہلی میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں تعلیم حاصل کریں گے' ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۱ء تک انہوں نے دہلی میں قیام کیا' اس کے بعد ۲۵ سال کی عمر میں امیر خاں جو کہ ایک فوجی مہم جو تھے' کے ہاں ملازمت کر لی۔ اس سلسلے میں ان کے سیرت نگار یہ کہتے ہیں کہ امیر خان کے لشکر میں ملازمت کا مقصد یہ تھا کہ آپ عملی طور پر فوجی تجربوں سے واقف ہوں تاکہ جہاد کی تیاری میں وہ کام آسکیں' لیکن حالات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور آپ ملازمت کے لئے کوشاں تھے اور عہد کے نوجوانوں کی طرح آپ بھی امیر خاں کے لشکر میں اس امید میں شامل ہوئے کہ اس طرح سے مال غنیمت حاصل کرنے کے مواقع تھے۔ چونکہ یہ عہد فوجی مہم جوؤں کا تھا کہ جس میں وہ اپنی فوجی طاقت و قوت کے بل بوتے پر علاقوں پر قبضہ کرکے اپنا اقتدار قائم کرلیتے تھے اس لئے ہوسکتا ہے کہ آپ نے یہ منصوبہ بنایا ہو کہ اپنی ایک جماعت تیار کرکے مذہبی بنیادوں پر کسی علاقے پر قابض ہوکر وہاں اپنا اقتدار قائم کریں۔ انہوں نے امیر خاں کی ملازمت میں سات سال گزارے اور یہ وقت امیر خاں کو سمجھنے کے لئے کافی تھا' کیونکہ وہ محض لوٹ مار کی غرض سے جنگیں کرتا تھا اور اس کے سامنے کوئی بڑا اور واضح مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے امیر خاں کی ملازمت کو اس وقت چھوڑا۔ جب ۱۸۱۷ء میں اس کی برطانوی حکومت سے صلح ہوگئی۔ اس کی ملازمت میں اس وقت تیس ہزار سپاہی ملازم تھے وہ صلح کے بعد بے روزگار ہوگئے' انہیں بے روزگاروں میں سید احمد شہید بھی شامل تھے ملازمت کے خاتمے کے بعد دہلی آئے اور یہاں سے انہوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا اس میں ان کے ساتھ ولی اللہ خاندان کے دو اراکین بھی شامل ہوئے ۔ اسماعیل شہید (۱۷۷۹ء-۱۸۳۱ء) اور مولوی عبدالحئی (وفات ۱۸۲۸ء)

اس تحریک کی ابتداء اس سے ہوئی کہ توحید کا تصور جو مسخ ہوگیا ہے' اسے دوبارہ مسلمانوں میں خالص اور اصل شکل میں رائج کیا جائے' اور جن عوامل نے اسلام کو کمزور کر دیا ہے انہیں دور کیا جائے ان میں ہندو رسومات اور جھوٹے صوفی اور شیعہ عقائد خصوصیت سے قابل ذکر تھے اپنی تحریک کو روشناس کرانے کی غرض سے آپ نے ۱۸۱۸ء اور ۱۸۱۹ء میں دو آبہ کے علاقوں کا دورہ کیا اور غازی آباد' مراد نگر' میرٹھ' سدھانہ' کاندھیلہ' پھولت' مظفر نگر' دیوبند' گنگوہ' نانوتہ' تھانہ بھون' سہارنپور' روھیل' کھنڈ' لکھنؤ اور بریلی گئے ۱۸۲۱ء میں انہوں نے ایک جمعیت کے ساتھ حج کیا' اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ ہندوستان میں اس اہم رکن کا احیاء کیا جائے۔ کیونکہ سمندروں پر یورپی اقوام کے قبضے اور بحری سفر کی مشکلات کی وجہ سے بہت کم ہندوستانی مسلمان حج پر جایا کرتے تھے اور ان حالات کے پیش نظر کچھ علماء نے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ ان حالات میں حج فرض نہیں ہے۔ اس لئے سید احمد شہید نے حج کے اہم رکن کو دوبارہ نافذ کرکے مسلمانوں کی شناخت کو اجاگر کیا۔ ۱۸۲۳ء میں حج سے واپسی کے بعد آپ نے ایک بار پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور جیسا کہ آپ کی سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگ جوق در جوق بیعت کرکے آپ کی تحریک میں شامل ہوئے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تحریک کے وہ کون سے مقاصد تھے کہ جن سے لوگ متاثر ہوئے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا ہندوستان سیاسی و معاشی اور معاشرتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہوچکی تھی۔ صوبائی طاقتیں خود مختار ہوکر خانہ جنگیوں میں مصروف تھیں۔ انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان میں اپنے قدم جمارہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں امراء اور علماء اپنی مراعات کو کھونے کے بعد عدم تحفظ کا شکار تھے۔ اگرچہ ایک مسلمان کے لئے ان حالات نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی' وہ پہلے ہی سے سماجی طور پر پس ماندہ تھا اور اس کے پاس بگڑتے ہوئے حالات میں کھونے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس لئے امراء اور علماء مغل حکومت کے سیاسی استحکام کے خاتمے کے بعد ذہنی طور پر انتشار کا شکار تھے جس کا اثر ہندوستان کے پورے مسلمان معاشرے پر پڑ رہا تھا اور اس احساس کو پیدا کیا جارہا تھا کہ مسلمان زوال پذیر ہوکر ختم ہورہے ہیں۔ اس احساس کو اور زیادہ بڑھانے میں وہ حالات تھے جن میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ سیاسی طاقت کے زوال کے ساتھ ختم ہوچکے تھے اور اگر تھے تو آمدنی کے ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے تنخواہوں کی ادائیگی نہیں ہوتی تھی۔ ان حالات میں مسلمان ان فوجی مہم جوؤں کے جتھوں میں شامل ہوگئے کہ جو

ہندوستان بھر میں لوٹ مار کرنے کی غرض سے پھرا کرتے تھے۔ یا معاوضے پر حکمرانوں کی جانب سے ان کے دشمنوں سے جنگ لڑتے تھے۔ لیکن جب انگریزی اقتدار بڑھا تو انہوں نے ان جتھوں کو بھی ختم کرنا شروع کردیا۔ ان ہی میں سے ایک جتھہ امیر خاں (وفات ۱۸۳۴ء) کا تھا کہ جس نے انگریزوں سے صلح کر کے ٹونک کی ریاست لے لی۔ لہٰذا اس صورت حال نے مسلمان فوجیوں میں بے روزگاری کو پیدا کیا ان فوجیوں کے ساتھ ان مولویوں اور علماء کا طبقہ تھا جو مدرسوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکل رہے تھے اور جن کے لئے ملازمتوں کے مواقع محدود تھے۔

ان حالات میں کہ جب معاشرے کو سدھارنے کے تمام مادی وسائل ختم ہوچکے تھے حکومت ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ جاگیروں پر قبضہ کمزور پڑ چکا تھا' اس وقت عدم تحفظ کا احساس دل میں جاگزیں تھا' ذہن کھوکھلا اور خیالات پراگندہ تھے' مستقبل سے مایوسی تھی' اس لئے اگر اس زوال اور مایوسی کے دور میں کوئی ایسی تحریک اٹھے کہ جس میں مستقبل کی امید ہو' اور جس میں حالات کو سدھارنے کی خوش خبری ہو تو یہ مایوس دلوں میں ایک نیا ولولہ' جذبہ اور جوش پیدا کر دیتی ہے۔ ماضی کا شاندار تصور ہمیشہ انسان کے ذہن میں زندہ و تابندہ رہتا ہے اور یہ قصہ کہانیوں کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ وہی جذبات احیاء کی تحریکوں کو تقویت دیتے ہیں۔

اس لئے سید احمد شہید کی تحریک نے اس بے مقصدیت کے ماحول میں لوگوں کو ایک مقصد دیا اور متوسط طبقے کی زندگی میں جو ایک خلا تھا اسے پر کیا۔ ان کے معتقدین کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقے سے جو شہروں اور قصبوں میں رہتے تھے۔ انہوں نے جگہ جگہ سید احمد شہید کا استقبال کیا اور ان کی دعوتیں کیں' اور ان موقعوں پر سید احمد اور اسماعیل شہید نے وعظوں کے ذریعے لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ لوگوں کی زندگی اور روز مرہ کے معمولات سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ اس تحریک نے اس جمود کو توڑا اور اس میں شمولیت کے ذریعے انہوں نے خود کو عملی طور پر ایک بڑے مقصد کے لئے تیار پایا۔ اس تحریک نے ان میں دوبارہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کی آرزو کو پیدا کیا۔ علماء اور متوسط طبقے کے لوگ اس امید پر اس میں اس لئے شامل ہوئے تاکہ وہ اپنی ماضی کی حیثیت کو دوبارہ بحال کر سکیں۔

ہر تحریک کا سربراہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے پیروکاروں کی ایک برادری تشکیل دے اور ان میں رسومات و نظریات کے ذریعے ایسا جذبہ پیدا کرے کہ وہ ایک

دوسرے کے ساتھ متحد ہوجائیں۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی شناخت کو اس طرح سے ابھار کیا جائے کہ ان سے نہ صرف ہندو رسومات خارج ہوں بلکہ شیعہ عقائد اور صوفیانہ اثرات کا بھی خاتمہ ہو' تاکہ وہ متحد ہوکر جدو جہد کرسکیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ جدو جہد کس کے خلاف ہو؟ اس مرحلے پر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہندوستان انگریزی قیام کے بعد دارالحرب ہے یا دارالاسلام! اگرچہ اس وقت مغل بادشاہ ہندوستان کا سربراہ تھا' لیکن عملی طور پر اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کا تھا' انتظامیہ اس کے تحت تھی اور اسی کے احکامات کا نفاذ ہوتا تھا اگرچہ کمپنی کی حکومت میں مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی تھی۔ مگر اس مذہبی آزادی کے باوجود کچھ علماء کے نزدیک ہندوستان دارالحرب بن گیا تھا' کیونکہ دارالحرب بننے میں یہ تھا کہ کافرانہ رسومات کو بغیر خوف اور جھجک کے نافذ کیا جائے اور ایسی صورت حال پیدا ہوجائے کہ کوئی مسلمان اور ذی امن و امان کے ساتھ نہ رہ سکے۔ اور مسلمان اگر زمیوں کے حقوق کی حفاظت نہ کر سکے تو اس صورت میں وہ علاقہ دارالسلام رہے گا۔ جب تک کہ مسلمان مغلوب نہ ہوجائے اور کافر فتح یاب نہ ہوجائے' اس کے بعد اگر کافر مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے دیں اور انہیں امن و امان سے رہنے دیں' تب بھی وہ علاقہ دارالحرب رہے گا' اس لئے ہندوستان دارالحرب تو تھا' مگر چونکہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی تھی اس لئے ان کے علاقے سے ہجرت ضروری نہیں تھی۔

اس کے برعکس کچھ علماء کا یہ خیال تھا کہ جب تک کوئی اسلامی قانون اور رواج باقی رہتا ہے اس وقت تک علاقہ دارالسلام ہے' یہ دارالحرب اس وقت بنتا ہے جب کہ اسلام کو اس علاقے سے بالکل مٹا دیا جائے۔

اس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی علاقہ دارالحرب ہے تو اس میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس علاقے میں ہجرت کر جائے جو کہ دارلسلام ہے یا وہ جہاد کریں اور اس کے ذریعے دارالحرب کو دارالسلام بنائیں۔ شاہ ولی اللہ کی دلیل تھی کہ دارالحرب سے دارالسلام ہجرت کرنا لازمی ہے جو ایسا نہیں کرے گا۔ وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ جب جاٹوں' سکھوں اور مرہٹوں نے مغل علاقوں پر قبضہ کرلیا تو انہیں باغی سمجھا گیا اور مقبوضہ علاقے دارالسلام رہے' اس طرح شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر سے ہندوستان میں مسلمانوں کی جنگیں جہاد تھیں اور خود مختار ہندو ریاستیں باغی تھیں' انہوں نے ان باغی ریاستوں کے ساتھ جنگ کو جہاد کہنا چھوڑ دیا تو اس کا مطلب ہے کہ مسلمان گائے کی دموں کے پیچھے چلے گئے یعنی ہندوؤں کے ساتھ تعاون کیا۔ (۲۵)

سید احمد شہید کے زمانے میں صورت حال یہ تھی کہ ہندوستان میں برطانوی راج تھا' مسلمان ریاستوں کے حکمراں برطانوی حکومت کے وفادار تھے' اور مسلمانوں کا کوئی امام اور خلیفہ نہیں تھا کہ جو جہاد کا اعلان کرتا۔ اس لئے فیصلے کا اختیار مسلمان معاشرے کے مختلف طبقوں کو تھا' اس لئے جنہیں برطانوی اقتدار سے فائدہ تھا انہوں نے اسے دارالسلام قرار دیا اور جنہیں نقصان ہوا تھا انہوں نے دارالحرب۔ سید احمد اور فرائضی تحریک کے پیرو کاروں کے لئے ہندوستان دارالحرب تھا اور اس لئے مسلمانوں کے لئے جہاد لازمی تھا (۲۶) صراط مستقیم میں کہا گیا ہے کہ:

"موجودہ ہندوستان کا بڑا حصہ دارالحرب بن چکا ہے' اس کا مقابلہ دو سو تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا۔" (۲۷)

اس بیان میں ان کا اشارہ عہد سلاطین اور مغل دور حکومت کی جانب تھا' کہ جو ہندوستان میں مسلمان حکومت سیاسی و فوجی لحاظ سے طاقت ور تھی اور ہندوؤں کے مقابلے میں وہ برابر کامیاب ہو رہی تھی۔ خراج کی آمدنی اور ٹیکسوں کی بہتات تھی' ارباب اقتدار خوش حال اور فارغ البال تھے۔ لیکن کیا اس عروج کے زمانے میں مسلمان عوام جن میں کسان کاشت کار اور دست کار شامل تھے' بھی خوش حال تھے؟ اس سوال کا جواب اس کتاب میں نہیں ملتا ہے کیونکہ اس کے مخاطب مسلمان امراء اور جاگیر دار تھے جو کہ مرہٹوں' سکھوں' جاٹوں اور انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد مراعات و فوائد سے محروم ہو گئے تھے اس لئے ان میں جہاد کے فوائد بیان کر کے انہیں متحرک کرنے کی کوشش کی گئی اور لکھا کہ:

"آسمانی برکتوں کے سلسلے میں روم اور ترکی سے ہندوستان کا مقابلہ کر کے دیکھ لو" (۲۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی دنیا کی تاریخ و جغرافیہ اور خود اسلامی ممالک کے بارے میں معلومات محدود تھیں' ترکی اور روم دو ملک نہیں' ایک ہی ملک تھا جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کہلاتا تھا' انیسویں صدی میں ترکی ایک زوال پذیر سلطنت تھی جو خود اپنے گناہوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی' لیکن ہندوستان کا مسلمان جو سلطنت عثمانیہ سے ناواقف تھا۔ اس کے لئے وہاں خدا کی رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا۔

چونکہ سید احمد کی تحریک کی بنیاد جہاد پر تھی اس لئے صراط مستقیم میں اس پر تفصیل سے لکھا گیا ہے تاکہ لوگوں میں جذبہ پیدا ہو۔

"باقی رہے خصوصی فوائد تو شہدائے مومنین' مسلمان مجاہدین ' صاحب اقتدار سلاطین اور میدان کارزار کے جواں مردوں کو فوائد پہنچتے ہیں۔ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں" (۲۹)

جب جہاد کے لئے عمل کا وقت آیا تو اس وقت مسلمان والیان ریاست اور جاگیر دار طبقے نے ان کی مالی امداد تو کی مگر جہاد کے لئے ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ ان کے ساتھ جو ۷ ہزار مجاہدین کی تعداد تھی ان میں اکثریت علماء کی تھی یا پھر متوسط طبقے کے لوگ تھے جو اس امید میں شامل ہوئے تھے کہ انہیں ثواب اور مادی فوائد دونوں حاصل ہوں گے۔ ان کی تحریک کی کچھ والیان ریاست نے ضرور مدد کی جن میں ٹونک' رامپور' اور گوالیار کی ریاستیں قابل ذکر ہیں اور یہ امداد انہوں نے یقیناً اس وجہ سے کی کہ انہیں انگریزی حکومت کی ناراضگی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ورنہ ان میں سے کوئی بھی انگریز کی مرضی کے بغیر انہیں مالی مدد نہ دیتا۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہوں نے سکھوں سے جہاد کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کے پس منظر میں کئی وجوہات تھیں' انگریزی عمل داری میں وہ جہاد اس لئے نہیں کر سکتے تھے کہ انگریز سیاسی لحاظ سے طاقت ور تھے اور ان کے خلاف کامیابی کے کوئی امکانات نہیں تھے اور نہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں انہیں کسی قسم کی مالی امداد مل سکتی تھی۔

سکھوں کے خلاف جنگ کے لئے انہوں نے سرحد کے علاقے کو اس لئے اختیار کیا کہ شمالی ہندوستان میں پٹھانوں کے بارے میں عام تاثر ہے کہ وہ بڑے مذہبی جنگ جو' اور مذہب کی خاطر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے سید احمد اور ان کے پیروکاروں کا شاید یہ خیال ہو کہ چونکہ ان کی تحریک خالص مذہبی ہے۔ اس لئے جیسے ہی وہ اپنا منصوبہ ان کے سامنے رکھیں گے پٹھان فوراً" ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوجائیں گے اور ان کی مدد سے وہ سکھوں کے خلاف موثر طور پر لڑ سکیں گے۔ چونکہ یہ جنگ مذہب کے لئے ہوگی اس لئے پنجاب کے مسلمان بھی ان کا ساتھ دیں گے۔

جہاد تحریک میں جو لوگ شامل تھے ان میں جوش ' ولولہ ' اور سادگی تھی اور انہیں یہ امید تھی کہ جس طرح قرون اولی کے مسلمانوں نے اپنی قلیل تعداد کے باوجود عراق و ایران کو فتح کر لیا تھا اسی جذبے کے تحت وہ بھی سکھوں کو شکست دے دیں گے اور جس طرح بکھرے ہوئے عرب قبائل مذہبی طور پر متحد ہوگئے تھے اسی طرح پٹھان قبائل بھی ایک جگہ جمع ہوجائیں گے۔

اس لئے سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف جہاد کو ایک مرکز بنایا تاکہ اپنے پیرو کاروں کو اس پر جمع کر سکیں' انہوں نے سکھوں سے جنگ کو ایک الہی حکم قرار دیا جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح سے کیا ہے۔

"اس فقیر کو پردہ غیب سے کفار یعنی لانبے بالوں والے سکھوں کے استیصال کے لئے مامور کیا گیا ہے جس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں' رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے لہذا جو شخص آج اپنی جان و مال عزت اور وجاہت کو اس پاک پروردگار کے کلمے اور سنت رسول کو زندہ کرنے میں بطیب خاطر خرچ نہیں کرے گا اس سے کل ضرور جبرا" مواخذہ کیا جائے گا اور اس کو سوائے حسرت ندامت کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ (۳۰)

سکھوں سے جہاد کا جواز فراہم کرنے کے لئے جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ اس قسم کی تھیں کہ وہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہیں' مساجد میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں' مساجد میں اذانیں بند ہیں قرآن شریف کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور سکھوں نے مسلمان عورتوں کو زبردستی اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے۔ ان میں سے کچھ باتیں صحیح تھیں اور متعصب سکھوں کی جانب سے مذہبی تعصب کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی رنجیت سنگھ کی حکومت میں رواداری کا جذبہ تھا اس کی انتظامیہ اور فوج میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تھی' ان کے مذہبی معاملات میں حکومت دخل نہیں دیتی تھی اور ان کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے تھے۔ اس لئے پنجاب کے مسلمانوں نے سید احمد شہید کا ساتھ نہیں دیا' اس کے برعکس سکھوں کی فوج میں مسلمان بڑی تعداد میں تھے جو ان سے جنگ لڑے' بلکہ ساتویں جنگ میں درانی پٹھان زیادہ تھے اور سکھ بہت کم تھے۔ (۳۱)

سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۲۵ء میں اپنا سفر شروع کیا' اور راجپوتانہ' مارواڑ' سندھ' بلوچستان اور افغانستان سے ہوتے ہوئے سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے اور یہاں سے انہوں نے رنجیت سنگھ کو یہ پیغام بھیجا کہ یا تو مسلمان ہوجاؤ' جزیہ دو۔ یا جنگ کرو اور یہ یاد رکھو کہ جنگ کی صورت میں یاغستان ہندوستان کے ساتھ ہے۔

سید احمد کی پہلی جنگ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو بمقام اکوڑہ ہوئی اور اس میں نہ صرف انہیں کامیابی ہوئی بلکہ مال غنیمت بھی ہاتھ آیا' اس کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھادیئے اور سرحد کے قبائل میں اس فتح نے ان کے اثر و رسوخ کو بڑھادیا۔ اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ انتظامات

اور دوسرے امور کے لئے باقاعدہ تنظیم ہو تاکہ شریعت کے مطابق باقاعدہ فیصلے کئے جائیں۔ اس کی روشنی میں ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو آپ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور آپ کو امیر المومنین منتخب کر کے خلیفہ کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔

احیاء کی تحریکوں میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ماضی کے قدیم ڈھانچہ کو دوبارہ تشکیل دیا جائے اور قدیم الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ اس لئے امیر المومنین خلیفہ، امام، مجلس شوریٰ، اور بیت المال کی اصطلاحات کا استعمال ہوا سید احمد نے اپنے پیرو کاروں میں حوصلہ پیدا کرنے کی غرض سے اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو قدیم اسلامی تاریخ سے تشبیہ دی۔ مثلاً" ونثورا سے ایک جنگ کے موقع پر انہوں نے دفاع کے لئے ایک دیوار تعمیر کرائی اور اس معرکے کو غزوہ خندق سے تشبیہ دی۔

سید احمد کے دعویٰ، امامت نے نہ صرف سرحد میں ان کی مخالفت کو ابھارا بلکہ ہندوستان میں بھی ان کے اس دعوے کو شک و شبہ سے دیکھا گیا۔ جب خطبے میں ان کا نام بحیثیت خلیفہ اور امام پڑھا گیا تو سرحد کے سرداروں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ان کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر کے انہیں اقتدار اور سرداری سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خطوط میں جو انہوں نے ہندوستان اور دوسرے مسلمان حکمرانوں کو لکھے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ انکا مقصد دنیاوی حکومت نہیں بلکہ کافروں سے جہاد کے لئے امام بننے پر تیار ہوئے ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> "اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اس مالک حقیقی اور بادشاہ حقیقی نے اس گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے ذریعے جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی تالیف قلوب کے لئے مرتبہ امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا" (۳۲)

سید اسماعیل شہید نے مخالفوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "لہٰذا جناب والا کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازمی ہے، جو شخص جناب والا کی امامت کو ابتداء میں قبول نہ کرے یا قبول کرنے کے بعد اس سے انکار کرے تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ باغی، مکار، فریبی اور اس کا قتل کرنا کافروں کے قتل کی طرح عین جہاد ہے .... پس معترضین کے جوابات اس خصوص میں اس عاجز کے پاس تو ان کو تلوار کے گھاٹ اتارنا ہے نہ کی تحریر و تقریر

سے (انہیں جواب دینا ہے) (۴۳)

اپنی امامت کے بارے میں سید احمد نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کو لکھا کہ:

"آپ اس کو بالکل یقین جانیں' جو شخص دل سے میرے اس منصب کا اقرار کرتا ہے وہ مقبول بارگاہ لم یزل ہے اور جو شخص انکار کرتا ہے وہ بے شک اس حق جل شانہ کے پاس مردود ہے..... میرے مخالفین کو جو میرے اس عہدے سے انکار کرتے ہیں' ان کو ذلت و رسوائی ہوگی۔" (۴۴)

سید احمد کے سیاسی اور مذہبی اقتدار نے سرحد میں ان کی زبردست مخالفت پیدا کردی۔ کیونکہ انہوں نے اچانک سرحد آکر وہاں کے پورے سیاسی ڈھانچے کو بدل ڈالا جس کے لئے سردار بالکل تیار نہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ پٹھان سردار اور عوام شمالی ہندوستان سے آنے والے غیروں اور اجنبیوں کو اپنا حکمراں تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے' اس لئے اگرچہ ان کے معرکے سکھوں سے رہے' لیکن بہت جلد وہ سکھوں سے زیادہ پٹھان سرداروں سے مصروف جنگ ہوگئے۔ اور جب ان میں سے کچھ نے ان کی اطاعت نہیں کی تو انہیں منافق' ضعیف الاعتقاد اور ملعون کہنا شروع کردیا سرحد کے سرداروں کا اپنا یہ نقطہ نظر تھا کہ وہ سید احمد کی مدد سے سکھوں کو نکال کر اپنی خود مختاری بحال کرلیں گے۔ مگر جب انہوں نے خود کو امام اور خلیفہ منتخب کرلیا تو ان کے لئے ان میں اور سکھوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ اگرچہ سید احمد شہید خود کو ایک برتر مذہبی مقام پر فائز سمجھتے ہوئے انہیں فتح کی خوش خبری' مال غنیمت کے حصول اور رحمت الٰہی کی برکتوں کا ذکر کرتے تھے' مگر سرداروں کے لئے اس سے زیادہ اقتدار عزیز تھا جو وہ اس طرح سے ان کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے' پٹھان سردار مولویوں کو کسی بھی صورت میں برتر سماجی حیثیت دینے پر تیار نہیں تھے' خادی خان' ایک پٹھان سردار کے مطابق ریاست کی دیکھ بھال کرنا سرداروں کا کام ہے' ملا زکوۃ اور خیرات کے کھانے والے ہیں اور انہیں ریاست کے معاملات کا شعور نہیں۔ (۴۵)

اس مخالفت کے بعد سید احمد کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ پہلے وہ اپنی بنیادوں کو محفوظ کریں اور جب ان کا تمام علاقے پر تسلط ہوجائے تو وہاں اسلامی نظام نافذ کر کے شریعت کو قائم کریں اس طرح ان کی پوری جہاد تحریک' خانہ جنگی میں بدل گئی چنانچہ جب سرحد کے سرداروں کے خلاف معرکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے ان کے علاقوں پر حملے کو اس لئے جائز کہا کہ وہاں فسق و فجور تھا لوگ شرع سے ہٹے ہوئے تھے اور ان میں جاہلیت کی رسومات تھیں۔ ان حالات میں امام کے لئے یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ ایسے ملک پر لشکر کشی

کرکے ان کافرانہ رسومات کا خاتمہ کرے۔ اس کے ثبوت میں امیر تیمور کا وہ فتویٰ دیا گیا کہ جس میں اس وقت کے علماء نے ہندوستان پر اس کے حملے کو جائز قرار دیا تھا۔ اس فتوے کے تحت ایسے ملک پر حملہ کرنا کہ جہاں کافرانہ رسومات ہوں جائز ہے۔ چاہے وہاں کا حکمراں مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ملک میں فوج کا لوگوں کا قتل عام کرنا اور مال غنیمت و دولت لوٹنا بھی جائز ہے۔ (۳۶)

اس سلسلے میں پہلی لڑائی یار محمد خاں حاکم یاغستان سے ہوئی جو لڑائی میں مارا گیا اور ۱۸۳۰ء میں پشاور پر سید احمد کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد رئیس پنجتار اور پلال قوم کا سردار ان کے مرید ہوگئے۔ لیکن سردار پاںندہ خاں نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اس لئے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اس کے خلاف جہاد کیا گیا جس میں اسے شکست ہوئی۔ خادی خان' رئیس ہند کے خلاف اس لئے اعلان جنگ کیا گیا کہ اس نے بیعت کے بعد ان کے خلاف بغاوت کی تھی' اس لئے وہ واجب القتل ہوا قتل کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے بھی انکار کردیا' جس پر پٹھان مولویوں نے اس کی نماز پڑھائی۔

پشاور کی فتح کے بعد انہوں نے شریعت کے نفاذ کے لئے ایک پر تشدد پالیسی کا آغاز کیا اور وہ تمام قبائلی رسومات جو ان کے نزدیک غیر شرعی تھیں ان کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ان رسومات میں اہم یہ تھیں کہ: شادی کے لئے بیوی کی باقاعدہ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ مرنے والے کی بیویاں اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی تھیں۔ چار سے زیادہ شادیوں کا رواج تھا' عورت جائداد کی وارث نہیں ہوسکتی تھی' آپس کی جنگیں جہاد تصور کی جاتی تھیں اور لوٹ کا مال' مال غنیمت میں شامل ہوتا تھا لہٰذا پشاور کی فتح کے بعد یہ احکامات ہوئے کہ جن لوگوں نے اپنی بیویوں کی آدھی رقم بھی دے دی ہے وہ انہیں لے جائیں' جو عورتیں شادی کے قابل ہیں ان کی فوری شادی کر دی جائے' شرعی احکام کے نفاذ کے لئے انہوں نے امام قطب الدین کو محتسب مقرر کیا جن کے ساتھ ۳۰ مسلح سپاہی رہا کرتے تھے وہ ان کے ہمراہ قرب و جوار کے دیہاتوں میں جاکر ان افغان نوجوانوں کو مارا پیٹا کرتے تھے جنہوں نے نماز ترک کر دی تھی۔ مارنے پیٹنے اور کوڑے مارنے کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ اگر کوئی ہندوستانی دیہات میں چلا جاتا تو وہاں افراتفری اور بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ سزا دینے کے معاملے میں انتہائی تشدد سے کام لیا گیا اور یہاں تک ہوا کہ لوگوں کو درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ عورتوں میں بھی جو نماز چھوڑ دیتی تھیں انہیں زنان خانے میں سزائیں دی جاتی تھیں' اس لئے بہت جلد لوگ ان سے تنگ آگئے کیونکہ یہ قاضی و محتسب حد سے زیادہ لوگوں کو تنگ کرنے لگے۔

اور ان کی استطاعت سے زیادہ ان پر جرمانے عائد کرنے لگے۔ (۳۷)

جس چیز نے سرحد کے علماء کو ناراض کیا وہ سید احمد اور مجاہدین کا عشر وصول کرنا تھا کیونکہ اس کے حق دار اب تک سرحد کے علماء تھے۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ اس کا حق دار امام ہوتا ہے اور وہ اسے بیت المال میں جمع کرکے مستحقین میں تقسیم کرتا ہے چونکہ اس سے سرحد کے علماء کی روزی پر اثر پڑا۔ اس لئے وہ ان کے زبردست مخالف ہوگئے۔ یہ مخالفت بعد میں ان کے عقائد کی وجہ سے اور بڑھ گئی چونکہ آمین ا بلجہر (زور سے آمین کہنا) اور رفع یدین (نماز میں ہاتھ اٹھانا) ان کے عقائد میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ان کے مخالف علماء نے ان کے پاس یہ محضر نامہ بھیجا کہ سید احمد انگریزوں کے ایجنٹ ہیں اس لئے ان سے ہوشیار رہا جائے' ان تمام باتوں نے ان کی حیثیت کو بڑا کمزور کردیا۔ (۳۸)

علماء سرداروں اور عام لوگوں میں اس وقت بے چینی پھیلنا شروع ہوئی کہ جب مجاہدین نے کہ جن کی اکثریت اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لاتی تھی پٹھانوں میں زبردست شادیاں کرنا شروع کردیں۔ یہاں تک ہوا کہ کوئی لڑکی جارہی ہے اور کسی مجاہد نے اسے پکڑ لیا اور مسجد لے جاکر زبردستی نکاح کرلیا۔ ایک ہندوستانی نے جب اس طرح سے ایک خو شگی سردار کی لڑکی سے شادی کی تو اس نے اپنے مخالف خٹک قبیلے کے سرداز سے درخواست کی کہ اس کی مدد کرے' اس پر خٹک سردار نے قبیلے کے سامنے اپنی لڑکی کا دوپٹہ اتار کر یہ عہد کیا کہ وہ جب تک پٹھان عزت کا بدلہ نہیں لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ (۳۹)

ستم بالائے ستم یہ کہ جن خاندانوں کی لڑکیوں کی شادیاں ان ہندوستانیوں میں ہوئی تھیں انہیں دوسرے پٹھان طعنے دیتے تھے کہ تم نے کالے کلوٹے ہندوستانیوں میں شادی کردی' اس پر ان طعنہ دینے والوں کو مجاہدین نے سزائیں دیں۔ (۴۰)

یہ وہ وجوہات تھیں کہ سرحد کے علماء سردار اور عوام ان کے مخالف ہوئے اور انہوں نے ایک منصوبے کے تحت تمام مجاہدین کو جو پشاور اور اس کے گردو نواح میں انتظامی امور پر فائز تھے قتل کردیا۔

اس واقعہ کے بعد سید احمد کشمیر جانا چاہتے تھے۔ مگر اس سے پہلے ان کا آخری معرکہ سکھوں سے ہوا اور ۱۸۳۱ء میں وہ ان کے ساتھی بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔

سید احمد کی تحریک جہاد کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اس کی بنیادی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سرحد کے علاقے کو اپنا مرکز بنانے سے پہلے نہ تو سید احمد نے اور نہ ان کے پیرو کاروں نے اس علاقے کے جغرافیہ کو سمجھا نہ اس کی تاریخ کو' اور نہ قبائل کی تشکیل'

ان کی روایات و رسومات اور ذہن کو' نہ انہوں نے ان کی زبان سیکھی اور نہ ان کے طور طریق۔ نہ انہوں نے اس بات کا ادراک کیا کہ مذہب سے زیادہ لسانی اور قبائلی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ اور وہ شمالی ہندوستان سے آنے والوں کو کسی بھی صورت میں اپنا حکمران نہیں بنائیں گے۔ کیونکہ مذہب ایک سہی۔ مگر ثقافتی اختلافات ان کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں رکاوٹ بنے رہے۔ ان کے ساتھ جو مجاہدین اور رضا کار آئے تھے۔ ان کی مدد سے قبائل کو شکست دے کر وہاں بزور طاقت حکومت قائم کرنا مشکل تھا اس لئے ان کی سرگرمیوں کو پٹھانوں نے شروع ہی سے شک و شبہ سے دیکھا اور ان کے لئے یہ سمجھنا یقیناً" مشکل ہو گا کہ یہ لوگ ہندوستان سے جہاد کرنے یہاں کیوں آئے ہیں! اس کا احساس اسماعیل شہید کو ہوا جس کا اظہار انہوں نے اس طرح سے کیا:

> "اس علاقے میں آکر ایسا معلوم ہوا کہ اگرچہ طویل مدت میں خدا کی مہربانی مقصود کا حصول متوقع ہے۔ لیکن ابھی اس نواح میں لشکر کے آنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی تو اس کی ضرورت تھی کہ فدوی چند خدمت گزاروں کے ساتھ اس نواح میں آتا اور دیہاتوں اور بستیوں کا خفیہ اور علانیہ دورہ کرتا۔ جب اس علاقے کے روساء تیار ہوجاتے اور لشکر کے قیام کے لئے کوئی جگہ معین ہوتی تو اس وقت لشکر اسلام رونق افروز ہوتا۔ یا ابتداء ہی میں ایک بڑا لشکر جرار یہاں کا رخ کرتا اور یہاں کے باشندوں کی موافقت یا مخالفت کے قطع نظر کرتے ہوئے علم جہاد بلند کرتا اور بغیر کسی تردد اور دغدغہ کے کفار و منافقین پر دست اندازی کرتا' پھر جو مخالفت کرتا سزا پاتا۔ (۴۱)

اس کے علاوہ انکے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ سب دین کی خاطر جہاد کرنے والے نہیں تھے ان میں ایسی تعداد بھی تھی جو محض لوٹ مار کی غرض سے آئی تھی۔ کیونکہ ان میں وہ فوجی بھی شامل تھے جو امیر خان کی فوج کا ایک حصہ تھے' جنگ کرنا ان کا پیشہ تھا اور اس کے ذریعہ وہ دولت اکٹھی کرتے تھے۔ جب ہندوستان میں مہم جوئی کے مواقع ختم ہوگئے تو وہ اس امید میں آئے کہ دین کی خدمت بھی ہوگی اور مال و دولت بھی ملے گا۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ جہاد میں حصہ لینے والوں کی کوئی فوجی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی ان میں نظم وضبط تھا۔ فوجی اخراجات اور اسلحہ کے لئے انہیں ہندوستان کے چندوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ابتداء میں لوگوں نے خوب چندہ دیا مگر جب کامیابی کے امکانات کم ہوئے تو اسی طرح سے چندے میں کمی آتی گئی۔

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک محض مذہبی جوش کے سہارے شروع ہوئی تھی اور اسے مفروضوں پر تشکیل دیا گیا تھا جو حقیقتیں تھیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا تھا تحریکیں محض جوش اور تشدد اور تعصب و سختی سے کامیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں معاشرے کی قوت و توانائی ضائع ہوتی ہے۔

سید احمد شہید کی تحریک نہ تو سکھوں کے خلاف کوئی کامیابی حاصل کر سکی اور نہ سرحد میں اسلامی معاشرے کا قیام ممکن ہوسکا' جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے سختی سے اس تحریک کو ختم کردیا اور ان پر ۱۸۷۰ء تک وہابی مقدمات چلائے گئے جن میں ملوث علماء کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ آخر میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اس کو اہلحدیث کا نام دے کر انگریزی حکومت سے مصالحت کرلی' اور جہاد کی مخالفت میں ایک رسالہ بھی لکھا۔

سید احمد کی تحریک کی چند خصوصیات یہ تھیں کہ یہ مکمل طور پر ایک ہندوستانی تحریک تھی۔ اور اس کا تعلق باہر سے نہیں تھااور نہ یہ بیرونی امداد پر چلی' اس تحریک کے لئے تمام چندہ ہندوستان ہی سے جمع ہوا کرتا تھا' اس تحریک نے ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی شناخت کے لئے مذہبی عناصر کو ابھارا اس کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں علیحدگی کے جذبات پیدا ہوئے اور مغل ثقافت جو ایک سیکولر ثقافت کے طور پر ابھر رہی تھی' اس تحریک نے اس کے پھیلاؤ اور اس کی ترقی کو روکا۔

اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد علماء نے جہاد کی بجائے تبلیغی مشن شروع کئے اور اپنے اثر و رسوخ کے لئے مدرسے اور درس گاہیں قائم کیں اس تحریک نے ہندوستان کے علماء کے طبقے میں بھی گہرے اختلافات کو پیدا کیا' اور یہ اختلافات مناظروں اور وعظوں کی صورت میں اور زیادہ شدید ہوتے چلے گئے' اس لئے علماء اور ان کے پیروکاروں کی جماعتوں نے اس تحریک سے قطعی لا تعلقی کا اظہار کیا اور یہاں تک ہوا کہ ان کی شکست پر خوشیاں منائی گئیں اور اس تحریک کا انجام بھی وہی ہوا جو اکثر احیاء کی تحریکوں کا ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی بجائے ان میں تفرقہ ڈال کر خود کو ایک نئے فرقے کی حیثیت سے تشکیل دے دیتی ہیں' چنانچہ ان مذہبی تنازعوں اور اختلافات کی چھاپ اب تک مذہبی جماعتوں اور گروہوں میں موجود ہے۔

OO

حوالہ جات

(۱) ابو الکلام آزاد: تذکرہ، لاہور ۱۹۸۱ء ص۔ ۲۳۸

(۲) ایضاً ص۔ ۲۴۵

(۳) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ۔ (اردو ترجمہ) لاہور۔ ۱۹۶۳ء۔ ص۔ ۴۹۷

(۴) ایضاً ص۔ ۴۹۹

(۵) ایضاً ص۔ ۴۹۷

(۶) محمد میاں: علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد دوم، دہلی۔ ۱۹۵۷ء ص۔ ۷۔ ۸

(۷) ایضاً ص۔ ۴۰

(۸) اشتیاق حسین قریشی: بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ کراچی۔ ۱۹۶۷ء۔ ص۔ ۲۵۱۔۲۵۲

(۹) ایضاً ص۔ ۲۵۳۔۲۵۴

(۱۰) شیخ محمد اکرام: رود کوثر، لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ص۔ ۳۱۹

(۱۱) اطہر عباس رضوی: شاہ عبدالعزیز (انگریزی) کینبرا ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۳۳۹

(۱۲) رود کوثر: ص۔ ۳۲۰

(۱۳) شاہ عبدلاعزیز: ص۔ ۴

(۱۴) شاہ ولی اللہ: فیوض الحرمین، لاہور۔ ۱۹۴۷ء ص۔ ۲۹۷۔۲۹۹

(۱۵) مناظر احسن گیلانی: تذکرہ شاہ ولی اللہ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔ ص۔ ۹۰

(۱۶) ایضاً ص۔ ۱۱۹

(۱۷) ایضاً ص۔ ۱۲۲

(۱۸) اسماعیل شہید: تقویۃ الایمان کراچی، (؟) ص۔ ۷۹، ۸۱، ۸۲

(۱۹) ایضاً ص۔ ۲۰۰۔۲۰۱

(۲۰) اسماعیل شہید: صراط مستقیم، کراچی (؟) ص۔ ۳۹

(۲۱) مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ' لاہور - ۱۹۷۶ء - ص- ۳۴
(۲۲) فیوض الحرمین: ص- ۲۷
(۲۳) مولانا منظور نعمانی: تذکرہ مجدد الف ثانی' کراچی-۱۹۷۸ء - ص- ۱۳۴
(۲۴) ایضاً ص- ۱۵۷
(۲۵) شاہ ولی اللہ: حجتہ البالغہ' کراچی- ۱۹۶۳ء- ص- ۴۸
(۲۶) پیٹر ہارڈی: ہندوستانی مسلمان کیمبرج- ۱۹۸۲ء ص- ۱۰۹
(۲۷) صراط مستقیم: ص-۴۹
(۲۸) ایضاً ص- ۵۰
(۲۹) ایضاً ص- ۵۱
(۳۰) جعفر تھانیسری: مکتوبات سید احمد شہید' کراچی- ۱۹۳۹ء - ص- ۴۴
(۳۱) حیات طیبہ: ص- ۳۶۱
(۳۲) مکتوبات سید احمد: ص- ۱۱۹
(۳۳) ایضاً ص- ۱۷۵
(۳۴) ایضاً ص-۲۹۵
(۳۵) ابو الحسن ندوی: سیرت سید احمد شہید' کراچی - ۱۹۷۵ء- ص- ۱۱۴- ۱۱۵
(۳۶) حیات طیبہ: ص- ۳۸۳-۳۸۴
(۳۷) مکتوبات سید احمد: ص- ۲۷۷' ۲۸۰
(۳۸) ابوالحسن ندوی: ص- ۲۲۳' ۳۱۴
(۳۹) عبید اللہ سندھی: شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک' لاہور - ۱۹۵۱ء - ص- ۹۶- ۱۰۲
(۴۰) ابوالحسن ندوی: ص- ۲۱۲
(۴۱) ایضاً ۴۶
(۴۲) حیات طیبہ: ص- ۲۶۰

○○

معاشرہ' ذات پات' اور مرزا نامہ

طبقاتی معاشرے میں مراعات یافتہ طبقہ اپنے سماجی مرتبے' اعلیٰ حیثیت وقار اور عظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے طبقے کو تنگ دائرے میں محدود کر دیتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی زبان ' لباس،' غذا' بول چال ' حرکات و سکنات اور اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں میں انفرادیت ہو اور وہ خود کو دوسرے طبقوں سے علیحدہ رکھ سکے اس علیحدگی کے رجحان کی وجہ سے وہ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں تاکہ ان کی نسل اور خون میں ملاوٹ نہ ہو یہ اپنے خاندان کے شجروں کو محفوظ رکھتے ہیں تاکہ خاندان کی اصلیت کا ثبوت رہے اور اپنی ثقافت و روایات کو اعلیٰ معیار پر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ کوئی دوسرے طبقہ ان تک نہ پہنچ سکے۔

نسلی برتری کو برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے طبقوں میں ملاوٹ ثابت کی جائے ان کی زبان کو غیر فصیح کہا جائے اور ان کی رسوم و رواج کو بازاری کا نام دیا جائے تاکہ اس فرق سے ان میں برتری ثابت ہوسکے۔

لیکن مراعات یافتہ طبقہ اپنی نسلی برتری اور اپنی مراعات کو ہمیشہ برقرار نہیں رکھ سکتا ہے کیونکہ خود کو تنگ سے تنگ دائرے میں محدود کرکے اور دوسرے طبقوں سے اپنا رشتہ توڑ کر اور اپنی قدروں اور روایات کو افضل سمجھ کر یہ اس دائرے میں منجمد ہوجاتے ہیں اور تاریخ کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی طاقت و قوت اور توانائی اس دائرے میں رہ کر خستہ اور پژمردہ ہوجاتی ہے ان کا ذہن اس تنگی میں سمٹ کر چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ باہر کے ماحول اور تبدیلیوں کا اندازہ لگا سکے چونکہ یہ دروازے بند کرلیتے ہیں اس لئے دوسرے توانا اور شگفتہ ذہن اس میں داخل نہیں ہوپاتے اور یہ خود اس گھٹے ہوئے ماحول میں خستگی کے ساتھ دم توڑ دیتے ہیں ان کی جگہ دوسرا طبقہ ابھرتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتا ہے اور بہت جلد اپنی حیثیت کو ایک مراعات یافتہ طبقے کی حیثیت سے قائم کرلیتا ہے ایک مرتبہ مراعات پانے کے بعد وہ بھی اپنے گرد حصار کو

قائم کرلیتا ہے تاکہ ان مراعات سے صرف وہ فائدہ اٹھاسکے۔ اور دوسرے اس سے محروم رہیں۔ اس کا یہی ذہن اس کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔

دوسرے محروم طبقے ہمیشہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ وہ کسی طرح اپنے سماجی مرتبے کو بڑھا کر مراعات یافتہ طبقے میں شامل ہوجائیں اس مقصد کے لئے وہ ان کے طور طریق زبان' لباس اور رسوم و رواج کو بھی اختیار کرلیتے ہیں مگر مراعات یافتہ طبقے میں ان کوششوں کو ہمیشہ حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کے باوجود انہیں شامل نہیں کیا جاتا اس وجہ سے مراعات یافتہ طبقہ ختم ہوتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا طبقہ ختم ہوتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا طبقہ ابھرتا ہے جو آہستہ آہستہ ان کھنڈرات پر اپنی عمارت بناتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی ذات پات اور نسل کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ایک نامعلوم مصنف کی کتاب "مرزا نامہ" ہے یہ کتاب برٹش میوزم میں نسخہ نمبر N°1817AD میں درج ہے اور اندازا" یہ ۱۶۶۰ء میں لکھی گئی تھی اس کتاب کا انگریزی میں خلاصہ عزیز احمد نے کیا تھا اور اسی سے اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جارہا ہے اگرچہ "مرزا نامہ" کے عنوان سے اور کتابوں کا بھی پتہ چلتا ہے مگر اس میں جو تفصیل ہے وہ دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔

مصنف اس کتاب میں سترھویں صدی کے ایک طبقے کا ذکر کرتا ہے جو مرزا کہلاتے ہیں کتاب کا مقصد یہ ہے کہ صحیح اور جھوٹے مرزا کا فرق بتائے تاکہ جو لوگ مرزا نہ ہوتے ہوئے خود کو مرزا کہلواتے ہیں ان کی اصل حقیقت معلوم ہوسکے۔

اس کتاب سے مغل عہد کے مسلمان معاشرے کی طبقاتی تقسیم ابھر کر سامنے آتی ہے اور ساتھ ہی امراء اور طبقہ اعلیٰ کی ثقافت اور اس کی خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ذات پات' خاندان اور نسلی برتری کو کن کن طریقوں سے باقی رکھا جاتا تھا۔

مصنف کی تعریف کے مطابق مرزا وہ لوگ کہلواسکتے ہیں جن میں چند بنیادی خصوصیات ہوں: مثلا" سب سے پہلے ضروری چیز یہ ہے کہ اس کا تعلق خالص اعلیٰ اور پاکیزہ نسل سے ہو اور اس کا شجرہ سب لوگوں کو معلوم ہو دوسرے یہ کہ لوگوں کی نظر میں اس کا وقار ہو تیسرے اس کا منصب بڑا ہو اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات پورے کرسکتا ہو اگر وہ منصب دار نہ ہو تو مالدار تاجر ہو یہ تین بنیادی خصوصیات مرزا ہونے کے لئے ضروری ہیں۔

مرزا کو دن اور رات کا ایک حصہ اخلاقیات کے مطالعے میں صرف کرنا چاہئے اس کو

فقہ اور تفسیر سے بھی واقفیت ہونی چاہئے کیونکہ مذہب سے ناواقف مرزا کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی اس کے علاوہ تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے علم عروض کے قواعد یاد کرنے چاہئیں تاکہ شاعری کو سمجھ سکے اسے نشست و برخاست کے آداب سے واقفیت ہونی چاہئے اور گھوڑوں اور شکاری پرندوں کے بارے میں اس کی وسیع معلومات ہونی چاہئیں۔

اسے خط شکستہ دنیاوی کاموں' خط نسخ قرآن نقل کرنے اور مذہبی تحریریں لکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے خط نستعلیق کو استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ کم تر درجے میں آتا ہے۔

گفتگو کرتے وقت زیادہ نہ بولے بلکہ اختصار سے کام لے۔ جہاں تک ہتھیاروں کی معلومات کا تعلق ہے تو اسے تلوار کی خوبیوں کے بارے میں علم ہونا چاہئے نیزہ بازی میں اسے مہارت حاصل کرلینی چاہئے۔ اسے بندوق کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے تاکہ بارود کی بو اس کے دماغ میں نہ بس جائے کھیلوں میں اسے چوگان کھیلنی چاہئے۔ میدان جنگ میں اسے بہادری کے جوہر دکھانے چاہئیں کیونکہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔

موسیقی کی محفل میں اسے قانون' چنگ' دائرہ اور طنبور کو ترجیح دینی چاہئے ہندوستانی موسیقی کے آلات میں رباب اور بین کو پسند کرے پکھاوج کا ساز شادی بیاہ کے موقعوں کے لئے مناسب ہے جبکہ ڈھولکی اور کھنجری بیواؤں کی محفلوں کے لئے ٹھیک ہے۔

ہندوستانی راگوں میں سے تان سین کے دھرپد اور امیر خسرو کے خیال کو پسند کرنا چاہئے' شیخ شیر محمد ہندی کے خیال شیخ حسین فقیر کے چٹکلے اور شاہ حسین جونپوری کے چٹکلے سے پرہیز کرے کیونکہ ان کے گانے والے بہت کم رہ گئے ہیں ایسے لوگوں سے دور رہنا بہتر ہے جو خیر آبادی خیال' چٹکلے' ڈھولک اور کھنجری سنتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ سطحی ہوتے ہیں۔

مرزا کو بھانڈوں اور مسخروں کی محفلوں سے بھی دور رہنا چاہئے کبھی کبھی بھوبیہ کو سن لینا چاہئے کیونکہ یہ حقیقت کے انداز میں لوگوں کی برائیوں کو مزاح میں بیان کرتا ہے اسے خود نہیں گانا چاہئے اور نہ ہی اپنی محفل کی گانے والیوں کا گانا دوستوں کو سنانا چاہئے۔

اگر مرزا کو شراب کی عادت ہے تو صرف گھر پر پیئے اور وہ بھی اپنی خاص محبوباؤں کے ساتھ اگر دوستوں کے ساتھ پینا پڑے تو اپنی شراب کی بوتل علیحدہ رکھے شراب اچھی اور خوشبو دار ہونی چاہئے خیال رکھے کہ روز شراب نہ پیئے کیونکہ یہ بازاری لوگوں کی عادت ہے اسے صرف ایسے موسم میں پینا چاہئے جب کہ بادل آئے ہوئے ہوں اور ہلکی ہلکی بارش ہورہی ہو شراب کی محفلوں میں ساقی نوجوان لڑکا نہ ہو بلکہ داڑھی والا ہو محفل میں ہر شخص

کے سامنے بوتل اور گلاس ہو اور انہیں اپنی مرضی سے شراب پینے کی آزادی ہو۔ یہ آداب کے خلاف ہے کہ اپنی شراب کی تعریف کرے۔ شراب کے ساتھ کباب نہیں کھانے چاہئیں کیونکہ یہ پیٹو لوگوں کی عادت ہے مزید یہ کہ اس سے ہاتھ بھی خراب ہوجاتے ہیں ایسے موقع پر نمکین پستوں سے شوق کرنا چاہیے۔

مرزا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کی محفلوں میں خوشبو ہو اور موسم کے لحاظ سے گلدانوں میں پھول سجے ہوں تاکہ اس کی محفل میں شریک ہونے والے کو یاد رہے کہ اس نے کسی مرزا کی دعوت میں شرکت کی ہے۔

اگر مرزا کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ روپیہ ہندو مہاجن سے قرض لے کسی مسلمان تاجر سے نہیں چاہے وہ اسے بغیر سود کے یہ قرض کیوں نہ دے' نہ ہی اسے کسی مغل دوکاندار کے ہاں سے سودا سلف خریدنا چاہئے ہندو مہاجن سود بھی کم کر دیتا ہے اگر اسے تھوڑا بہت واپس کیا جائے تو وہ مطمئن ہوجاتا ہے اور اپنا قرض ادب آداب اور لجاحت سے مانگتا ہے جب کہ مسلمان تاجر اپنا قرضہ صرف اسلام علیکم کہہ کر اور برابر کا سمجھ کر وصول کرتا ہے۔

کھانے کے آداب میں ضروری ہے کہ دستر خان باغ میں فوارے کے کنارے بچھایا جائے ضروری تو یہ ہے کہ دستر خوان پر سونے کا کام ہو ورنہ چھینٹ کے ڈیزائن والے دستر خوان استعمال کئے جاسکتے ہیں دستر خوان پر چکنائی کے دھبے نہ ہوں کھانا کھلانے والا ملازم نوجوان ہو اور صاف ستھرا ہو لیکن کسی خوبصورت نوجوان کو ملازم نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اس سے انسان گمراہی کی طرف جا سکتا ہے۔ دستر خوان پر تمام پلیٹیں ایک ہی قسم کی ہونی چاہئیں کھانے کے برتنوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن استعمال نہیں کرنے چاہئیں لیکن مٹی کے خوبصورت برتن ضرور استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

موسم کے لحاظ سے دستر خوان پر کھٹی چیزیں ہونی چاہئیں جیسے اچار' انار ' اور نارنگی کے رس۔ لیکن کھانا پکانے اور شراب ہلانے کے لئے رنگین چمچہ استعمال میں نہ لایا جائے بلکہ اس مقصد کے لئے سفید چمچہ استعمال کرنا چاہئے مرزا کو کھانے میں ابلے ہوئے چاول استعمال کرنا چاہئیں وہ دو پیازہ نہ کھائے کیونکہ یہ پیٹو لوگوں کی غذا ہے اس کی بجائے وہ قلیہ کھائے ابلے چاول اور کباب مرزا کی غذا ہونی چاہئے صحت مند بھیڑ کے گوشت کی یخنی سے تیار کیا ہوا پلاؤ پسند کرے جو مٹر کے ساتھ تیار ہوتی ہے وہ بھی کھا سکتا ہے ایسے پلاؤ سے پرہیز کرنا چاہئے جس سے ہاتھ چکنے ہوں۔

مزیدار ذائقے والا شوربہ پسند کرے جو کا شوربہ جس میں لیمو کا رس' شکر اور عرق گلاب ہو ایسے پسند کرے سردیوں میں شلجم کا استعمال کرے۔ لیکن پکا ہو شلجم کم کھائے چقندر کو اپنی غذا کو حصہ سمجھے کیونکہ یہ مرزا کی غذاء کے لئے مناسب ہے۔ سردیوں میں اس کے دستر خوان پر سری پائے' ہریسہ' جو کا شوربہ اور شب پخت ہوں لیکن خود وہ پائے کھائے کیونکہ ہریسہ اور جو کا شوربہ اس کے مرتبے کے لائق نہیں ہے۔

بازار کے کھانوں سے قطعی پرہیز کرے ہندوستانی اچاروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ فالودہ کے دو تین چمچ کھائے لیکن اسے برف کے بغیر استعمال نہ کرے اگر برف نہ ہو تو کم از کم اسے شورہ میں ٹھنڈہ کرے اگر یہ نہ ہوسکے تو اسے فالودہ قطعی استعمال نہیں کرنا چاہئے' بلکہ اس صورت میں اس کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔

روٹی' پنیر' اور خربوزہ مرزا کی غذا کے لئے مناسب ہیں۔ دہی ملا ہوا دودھ مرزا کے پینے کے لئے مناسب ہے اسے چاہئے کہ کھیر کو ہاتھ نہ لگائے اور پھٹو لوگوں کے لئے چھوڑ دے پانی کو بغیر مشک کے نہ پئے حلووں میں ان حلووں کو پسند کرے جو گری دار میووں سے تیار کئے گئے ہوں اور جن میں عنبر' صندل اور لیموں کی خوشبو ہو۔

کھانا انگلیوں کے پوروں سے کھائے اور پیٹ بھرنے سے پہلے کھانا کھانا بند کردے چاہے وہ بھوکا ہی کیوں نہ رہ جائے کیونکہ مرزا بننا آسان کام نہیں ہے اگر وہ بھوکا رہ جائے تو گھر کے اندرونی حصہ میں جا کر کھائے لیکن اس سے مرزا کی شہرت کو خطرہ ہوسکتا ہے اس لئے بھوکا رہنا ہی بہتر ہے۔

پھلوں میں خربوزہ' اور انگور کے بعد آم کھائے اکبر آباد اور بہار کا گنا مرزا کے لئے بہتر ہے لیکن اسے کھاتے ہوئے اپنے سامنے ان کا ڈھیر نہ کرے سبزی میں پودینہ اور سلاد پسند کرے اور مولی کو غذا کا دشمن تصور کرے کیونکہ ان کے کھانے سے جو ڈکار آتی ہے وہ دماغ کے لئے مضر ہے اور اسکی آواز بندوق کی آواز سے زیادہ گرجدار اور بدبو بارود سے زیادہ خراب ہوتی ہے۔

ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھانا چاہئے جو کھانے کے آداب سے واقف نہ ہوں اور پھٹو ہوں کیونکہ لوگ ڈکاریں بہت لیتے ہیں ایسے لوگوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جو کھانا کھانے کے بعد خلال کرتے ہیں۔

کھانے کے بعد ہاتھ خوشبو دار پانی سے دھونا چاہئے' پان چبانے کے بعد منہ کو صاف کر لینا چاہئے ایسے لوگوں سے دور رہنا چاہئے جو پان کھا کر بہت بولتے ہیں اور ان کے منہ سے

پانی کی چھینٹیں اڑ کر سامنے والے پر پڑتی ہیں۔
سردیوں میں انگیٹھی جلائے رکھنی چاہئے اور اس میں برابر خوشبو ڈالتے رہنا چاہئے گرمیوں میں خس خانہ استعمال کرے اور اسے سبیل پانی سے آراستہ کرے گلدانوں میں ہر موسم کے پھل رکھے گرمیوں میں سفید چاندنی بچھائے اور خوشبو کے لئے جہاں گیری اور ارگجہ استعمال کرے مون سون کے موسم میں موسم کا لطف اٹھانے کے لئے لکڑی کے تخت پر بیٹھنا چاہئے جس پر قالین پڑا ہو قالین کرمان کے استعمال کرے ورنہ کشمیری بھی مناسب رہتے ہیں۔
مکان میں اگر پردے نہ ہوں تو اس کی مثال بازار کی دوکان کی طرح ہوتی ہے اس لئے اسے پردوں سے آراستہ کرنا چاہئے ہر موسم میں اسے مگس خانے میں کھانا کھانا چاہئے ورنہ ایسا محسوس ہوگا کہ وہ بازار میں کھانا کھارہا ہے۔
مکان میں فوارہ ضرور ہونا چاہئے جس کے اردگرد پھولوں کے گملے ہوں۔ مکان میں باغ اور باغ میں پرندوں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ مرزا کوئی ناخوشگوار آواز نہ سنے۔
جانوروں کی لڑائیوں میں وہ ہرنوں اور اونٹوں کی لڑائی دیکھے مگر ان کے رکھوالوں سے دوستی نہ کرے بیلوں اور دنبوں کی لڑائی نہ دیکھے کیونکہ یہ بازاری لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

سردیوں میں اس کا لباس دو تاہی ہو بٹن کی جگہ موتی ہوں' سردیوں میں شال کا استعمال کرے سونے کے تاروں سے کشیدہ کی ہوئی پگڑی گرمیوں میں جب وہ تخت پر بیٹھے تو چاندی کے تاروں سے مزین ٹوپی اوڑھے۔ مرزا کو کبھی بھی بروکیڈ اور سنہری کپڑا استعمال نہیں کرنا چاہئے سنہری کپڑا صرف پردوں اور تکیوں کے غلاف کے لئے استعمال کرے۔
سواری میں پالکی سب سے بہتر ہے بارش کے موسم میں ہاتھی کی سواری اچھی ہے تاکہ کیچڑ اور بارش سے لباس خراب نہ ہو باغ کی سیر کو جاتے ہوئے اسے ابلق گھوڑے کی اور شکار کے وقت کالے یا سفید گھوڑے کی سواری کرنی چاہئے۔
شکاری پرندوں میں اسے باشہ (باز) کو ترجیح دینی چاہئے وہ اپنے شکار کے پرندوں کو اس طرح رکھے جس سے اس کی شان ظاہر ہو شکار کے وقت گھوڑے کو بھگانا نہیں چاہئے بلکہ آرام سے آہستہ آہستہ چلنا چاہئے شکار میں صرف ایک پہر گزارنا چاہئے اگر وہ بندوق سے شکار کرے تو صرف دو مرتبہ اسے چلائے شکار سے واپسی پر کسی چشمے پر نہائے۔
شکار اپنے ساتھیوں میں تقسیم کرے اگر اس نے ہرن شکار کیا ہے تو اس کے کباب تیار

کرائے۔ اس نے جو تیتر' بٹیر اور تلیر وغیرہ شکار کئے ہیں ان کی نمائش کرائے۔

اگر اسے پھول پسند ہوں تو خود انہیں پودوں سے توڑے مالی کے ہاتھوں پھول لینا پسند نہ کرے اپنی پگڑی میں پھول نہ لگائے کیونکہ یہ زنانہ پن ہے۔

نہاتے وقت جسم کو ملنے کے لئے برش استعمال نہ کرے' جسم ملنے کے لئے کسی داڑھی والے کو ملازم نہیں رکھے کیوں کہ اس کے بالوں سے جو پسینہ گرے گا وہ بدبو دار ہوگا۔

پاجی لوگوں کو اپنی ملازمت میں نہ رکھے ملازموں کو ہدایت دے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے نہ ہوں محفل میں اسے کوئی خراب بات زبان سے نہیں نکالنی چاہئے نیچ اور کمین ذات کے لوگوں سے اسے کوئی بات نہیں کرنی چاہئے بلکہ صرف اشاروں سے ان پر مطلب واضح کردینا چاہئے۔

بیماری کے وقت حکیم کو اچھی فیس دینی چاہئے کیونکہ زندگی پیسے سے زیادہ قیمتی ہے۔

ایسے محبوب سے دور رہنا چاہئے جس کے کئی عاشق ہوں غریب لوگوں کی دوستی سے پرہیز کرنا چاہئے وہ خان یا سلطان ہی کیوں نہ ہوں ایسے لوگ صرف قرضہ مانگتے ہیں۔

نامعلوم مصنف کا یہ مرزا نامہ اسی نمونہ پر لکھے گئے دوسرے مرزا نامے ہندوستان کے مسلمان معاشرے کے طبقاتی ذہنیت کے ساتھ ساتھ اس کی ثقافت کی بھی عکاسی کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معاشرے میں ذات' پات' نسل اور خاندان کے تعصبات کی جڑیں بڑی گہری تھیں اور مراعات یافتہ طبقے اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کے لئے معاشرے کے دوسرے طبقوں سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

○○

چند تاریخی غلط فہمیاں

تاریخ اور تاریخی واقعات کو بیان کرتے وقت مورخ اپنے ذاتی خیالات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رجحانات کو بھی عکاسی کرتا ہے اگر تاریخی واقعات میں کئی اختلاف ہوں یا ان کا بنیادی اخلاقیات سے تصادم ہو تو ایسے موقعوں پر وہ اپنے نقطہ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مختلف تاویلیں پیش کرتا ہے خصوصیت سے مذہبی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی تاریخوں میں ایسی دلیلیں اکثر ملتی ہیں جنگ ' لوٹ مار ' قتل عام اور کسی دوسرے ملک پر حملے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دور از کار دلیلوں کے ذریعے ان کو حق بجانب قرار دیا جائے۔

معاشرے کی اکثریت اس بات کی خواہش مند ہوتی ہے کہ تاریخ کے نتائج ان کی خواہشات کے مطابق ہوں اس لئے جو مورخ اس قسم کی تاریخیں لکھتے ہیں وہ صرف اس وقت تک مقبول رہتی ہیں جب تک ان سے معاشرے کی ذہنی تسکین ہو لیکن حالات کے بدلنے کے بعد ان تاریخوں کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے ان تاریخوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ یہ معاشرے کی خواہشات کے مطابق واقعات کو پیش کرتے ہوئے تاریخ میں بہت سی غلط فہمیاں اور مفروضے پیدا کردیتی ہیں اور یہ غلط فہمیاں معاشرے میں اسی طرح سے پیوستہ ہوجاتی ہیں اصل حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اس المیہ سے دوچار ہے ان تاریخی غلط فہمیوں کی وجہ سے پوری تاریخ کی تعبیر و تفسیر متاثر ہوتی ہے وقت کی تبدیلی' تاریخی مواد کی نئی دریافت نئی تحقیق اور نئے مسودوں کی اشاعت کے باوجود یہ تاریخی غلط فہمیاں اسی طرح موجود ہیں۔

یہاں ان چند تاریخی غلط فہمیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ہماری تاریخ میں عام ہیں۔

کیا ہندوؤں کو مسلمان کیا جاسکتا ہے؟

ہمارے ہاں اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں مسلمان اس وقت

جن حالات اور مسائل سے دوچار ہیں یہ حالات پیدا نہیں ہوتے اگر ہندوستان کے مسلمان حکمران بزور تلوار یا دوسرے ذرائع سے انہیں مسلمان کر لیتے اس سلسلے میں ایک مورخ نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے۔

> " ایسی حالت اور اس ذہنی تشتت و انتشار کے زمانے میں اگر مسلمان ذرا بھی تبلیغ اسلام کی طرف متوجہ ہوتے اور ہندوستان والوں کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرتے تو صرف چند سال میں تمام ہندوستان کا دائرہ اسلام داخل ہوجانا معمولی بات تھی لیکن مسلمان فرماں رواؤں نے اپنی مذہبی رواداری کو اس سختی کے ساتھ استعمال کیا کہ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے مذہب کو باقی رکھنا اور ہندوؤں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنا اپنے مقاصد میں داخل کرلیا تھا۔ ورنہ آج ہندوستان میں ایک ہی مذہب یعنی اسلام ہوتا۔" (۱)

اس رائے کے بعد ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں: کیا بزور تلوار یا طاقت و قوت کے پوری آبادی کا مذہب تبدیل کرایا جاسکتا تھا مسلمان حکمران لوگوں کو مسلمان کرنا چاہتے تھے بھی یا نہیں کیا مسلمان حکمرانوں اور مبلغین نے اسلام کو پھیلانے کی کوشش کی اور اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی یا انہوں نے اپنے مفادات کے تحت اس قسم کی کوئی کوشش ہی نہیں کی؟ اور کیا برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل ہندوستان کی آبادی کو مسلمان کرنے سے حل ہوجاتے؟

ہندوستان کو جن مسلمان حکمرانوں نے فتح کیا' ان کے دائرہ عمل میں لوگوں کو مسلمان کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا ان کی فتوحات خالصتاً" سیاسی مقاصد کے لئے تھیں یعنی سلطنت کی حدود بڑھانا اور ذرائع آمدنی میں اضافہ کرنا۔ اگر مفتوح قوم میں سے کچھ نے اسلام قبول کرلیا تو ان کی ہمت افزائی ضرور کی گئی لیکن انہوں نے اس پالیسی کو اختیار نہیں کہ مفتوحین کو تبلیغ کے ذریعے یا جبر کے ذریعے مسلمان کیا جائے اس عمل میں کئی دقتیں تھیں: یہ ناممکن تھا کہ تمام مفتوحہ علاقے کے لوگوں کو جبراً" مسلمان بنایا جاتا اور انکار کی صورت میں تمام آبادی کو قتل کردیا جاتا مذہب کی تبدیلی ویسے بھی اچانک نہیں ہوتی اس کے لئے ذہن کو آہستہ آہستہ تیار کرنا پڑتا ہے اپنے آبائی عقائد اور روایات کو ترک کرنے کے اذیت ناک عمل سے گزرنا پڑتا ہے دوسرا مذہب اسی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے کہ جب ذہن اس پر تیار ہو کہ اسے اپنے آبائی مذہب کے مقابلے میں نئے مذہب میں زیادہ سکون ملے گا۔ ایسا

ضرور ہوا کہ لالچ طمع اور موقع پرستی کی وجہ سے کچھ لوگ مسلمان ہوئے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ذہنی طور پر لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مبلغین اور علماء لوگوں پر اسلام کی برتری ثابت کرتے لیکن جب بھی اس سلسلے میں ذرا بھی کوششیں ہوئی تو ہندو مفکرین اور ان کے مذہبی طبقوں نے ہندو مذہب کی برتری ثابت کرکے اسلام کی تبلیغ کو زیادہ نہیں پھیلنے دیا بھگتی تحریک اسی سلسلے کی کڑی ہے جس نے ہندو معاشرے میں سماجی و معاشرتی تبدیلیاں لاکر اسلام کی تبلیغ کا مقابلہ کیا۔

اسلام کی برتری کو ثابت کرنے کی دوسری صورت یہ تھی کہ اسلام کے مقلدین اپنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرکے لوگوں کو متاثر کرتے لیکن نہ تو حکمران طبقے نے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی علماء نے۔ مذہبی رواداری کے لحاظ سے علماء نے تنگ نظری اور تعصب کا اظہار کیا مثلاً" شاہ ولی اللہ کافروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> "کفار" یہ سخت منکر اور سرکش لوگ ہوتے ہیں ان کی عقلیں درست نہیں ان تک دعوت بھی پہنچ چکی ہے مگر انہوں نے پھر بھی لا الہ الا اللہ سے انکار کردیا..... چنانچہ یہ لوگ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ان پر ہمیشہ کے لئے لعنت رہے گی اور یہ لوگ دائمی قیدو بند میں رہیں گے۔"(۲)

جو لوگ مسلمان ہوئے انہیں نو مسلم ہونے کی حیثیت سے معاشرے میں اعلیٰ سماجی مرتبہ نہیں ملا کیونکہ ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں ایران وسط ایشیا اور افغانستان سے آنے والوں کو اعلیٰ اور ممتاز مقام ملتا تھا اور مقامی لوگ جو مسلمان ہوئے تو انہیں نچلے درجہ کا مسلمان سمجھا گیا سماجی رشتوں میں شادی بیاہ میں ان کو برابر کا نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی حکومت میں ان کو اعلیٰ عہدے ملتے تھے اس طبقاتی تقسیم اور سوچ نے اسلامی مساوات کے سارے تصور پاش پاش کردیئے۔

حکمرانوں اور علماء کی یہ خواہش ضرور تھی کہ ہندوؤں کا اعلیٰ طبقہ مسلمان ہوجائے کیونکہ اس صورت میں حکومت کے اداروں اور حکمران طبقہ کو زیادہ طاقت ملتی یہ ان کے مفاد میں نہیں تھا کہ ہندوستان کے عوام کو مسلمان کیا جائے وہ فاتح کی حیثیت سے خود میں اور رعایا میں فرق رکھنا چاہتے تھے اس لئے اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کا وجود ان کے مفاد میں تھا تاکہ مفتوحین و محکومین کا طبقہ جو سماجی و معاشرتی اور معاشی لحاظ سے ان سے کمتر ہو اور جس کی محنت و مشقت اور ذرائع آمدنی سے یہ آرام و آسائش حاصل کرسکیں۔

برہمن اور راجپوتوں کے علاوہ ہندوؤں کی دوسری ذاتیں جو سماجی اعتبار سے نچلی ذاتیں

تھیں مسلمان حکمران طبقے انہیں اسی حیثیت سے دیکھتے تھے اور یہ گوارا کرنے پر تیار نہیں تھے کہ شودر مسلمان کو مسلمان معاشرے میں برابر کا درجہ ملے اس لئے وہ ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتوں کو برابر کا سمجھ کر صرف ان کے مذہب کو تبدیل کرنا چاہتے تھے اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کے افکار بڑے اہم ہیں جن سے ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقے کی سوچ ظاہر ہوتی ہے: وہ دین اسلام کے غلبے کے لئے مندرجہ ذیل باتیں ضروری سمجھتے ہیں:

(۱) دوسر مذاہب کے طریقوں پر اپنے مذہب کے شعار اور طریقوں کو غالب کردے تاکہ مذہب اسلام ماننے والے دوسروں سے اعلیٰ و برتر نظر آئیں۔

(۲) دوسرے مذاہب والوں کو پابند کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے مذہبی شعار کا کھلم کھلا اظہار و اعلان نہ کریں۔

(۳) قصاص و دیت میں مسلمانوں اور کافروں کو برابر کا درجہ نہیں دیا جائے اس طرح شادی بیاہ اور انتظام سلطنت میں کافروں کو مسلمانوں کے برابر درجہ نہ دیا جائے تاکہ یہ پابندیاں انہیں ایمان لانے پر مجبور نہ کریں۔

(۴) لوگوں کو نیکی اور بدی کے ظاہری اعمال کا پابند بنایا جائے۔

(۵) مسلمان حکمران اسلام کو دوسرے مذاہب پر غالب کردے اور کسی کو دین کے غلبہ سے باہر نہ رہنے دے چاہے عزت کے ساتھ یا ذلت کے' اس طرح تین جماعتیں بن جائیں گی۔

(۱) ظاہر و باطن میں دین کے حامی

(۲) مجبور ہو کر دین کی اطاعت کرنے والے

(۳) ذلیل کافر جن کو کھیتی کاٹنے' اناج پیدا کرنے اور اس قسم کی دوسری مزدوریوں کے کام میں لایا جائے ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے جو بوجھ اٹھانے والے چوپایوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ کافروں پر ذلت کے قانون نافذ کرے اور انہیں مغلوب کر کے ان سے جزیہ لے۔ (۳)

شاہ ولی اللہ امت کے طبقات تقسیم کرتے ہوئے کسانوں اور کاشت کاروں کو بچوں اور دیوانوں میں شمار کرتے ہیں اور انہیں ناقص العقل قرار دیتے ہیں وہ ان میں صرف اس قدر ایمان کافی سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے مشابہت رکھ سکیں۔

اس ضمن میں اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہندو مذہب تبلیغی مذہب نہیں۔ اس کا ارتقاء برصغیر میں ہوا اور یہیں اس کی نشو نما ہوئی اور اس نے اپنی جڑیں اس

سر زمین کی گہرائیوں میں پیوست کردیں۔ یہاں تک کہ یہ مذہب محض عقائد کا مجموعہ ہی نہیں رہا بلکہ اس میں ثقافتی و تہذیبی اور تمدنی روایات رچ بس گئیں کہ کسی ہندو کا اس سے باہر نکلنا مشکل تھا تہواروں ' رسومات اور مختلف رواجوں نے ان کی زندگی کو اس طرح سے جکڑ دیا تھا کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیتے تو ان کی زندگی میں خلا ہی خلا رہ جاتا۔ جو جاذبیت' رنگینی دلکشی اور موسیقیت اس میں تھی' اس کا نعم البدل ان کے لئے اور کوئی نہ تھا۔ انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے کہا ہے کہ جو معاشرے کئی دیوتاؤں اور خداؤں کو مانتے ہیں وہ زیادہ روادار اور قوت برداشت رکھتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں کو بھی اپنے مذہب میں داخل کر لیتے ہیں۔ اس لئے ہندو مذہب نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے دوسرے مذاہب کو خود میں ضم کرلیا۔

ہندو مذہب کا تعلق ہندوستان سے تھا اور اس کا مزاج اسی سر زمین سے تعلق رکھتا تھا اس لئے ان کے لئے دوسرے مذاہب میں وہ ثقافتی دلکشی نہ تھی جو اپنے مذہب میں تھی یہی وجہ تھی کہ اکثریت ہندو رہی اور جو ہندو مسلمان ہوبھی گئے تو وہ ہندو تہذیبی اور ثقافتی روایات اور رسوم سے چھٹکارا نہیں پاسکے اور ان کی سماجی و معاشرتی زندگی میں یہ تہذیبی قدریں اسی طرح موجود رہیں اسی وجہ سے ہمارے علماء ان مشرکانہ اور ہندووانہ رسومات کے خلاف برابر آواز اٹھاتے رہے۔

اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نہ تو مسلمان حکمران طبقے کے لوگوں کو مسلمان بنانا چاہتے تھے اور نہ ہی ہندو مذہب اتنا کمزور مذہب تھا کہ وہ شکست کھا جاتا اور یہ کہ ایک ہی مذہب میں داخل ہونے سے معاشرے کے مسائل کبھی بھی حل نہیں ہوتے ہیں۔

کیا ہندو حکمرانوں سے جنگیں جہاد تھیں؟

ہندوستان میں مسلمان اور ہندو حکمرانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کو ہم عصر مورخین اور جدید مسلمان تاریخ دانوں نے جہاد کہا ہے اسلام میں جہاد کا ایک خاص تصور ہے جب تک وہ حالات نہ ہوں کسی بھی جنگ کو جہاد نہیں کہا جاسکتا۔ امیہ اور عباسی خالص سیاسی حکومتیں تھی اور انہوں نے جو بھی فتوحات کیں ان کا مقصد توسیع سلطنت تھا ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات خالص سیاسی و معاشی مقاصد کے لئے تھیں اس نے اپنی جنگوں کا ٹائم ٹیبل موسموں کے لحاظ سے ترتیب دیا تھا مثلاً" وہ موسم گرما میں وسط ایشیا کے مسلمان حکمرانوں سے جنگیں کرتا تھا اور موسم سرما میں ہندو حکمرانوں سے جہاد کرتا تھا۔

جب معزالدین غوری کی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو سلاطین دہلی نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور اپنی طاقت و اقتدار کو مستحکم رکھنے کے لئے ہندوستان کے حکمرانوں سے مسلسل جنگیں لڑیں اقتدار کی یہ جنگیں صرف مسلمانوں اور ہندو حکمرانوں کے درمیان ہی نہیں رہیں بلکہ مسلمان حکمران آپس میں لڑنے لگے اور بعض حالات میں ایک مسلمان حکمران نے ہندو حکمران سے اتحاد کیا تاکہ وہ مخالف مسلمان حکمرانوں سے جنگ کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے جو جنگیں لڑیں وہ اپنے اقتدار اور سیاسی مقاصد کے لئے تھیں جن کا مقصد توسیع سلطنت اور مال و دولت کا حصول تھا اگر ہم اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اپنی تاریخ کا تجزیہ کریں تو اس صورت میں تاریخ کو بہتر سمجھ سکیں گے۔

کیا ہندوستان پر انگریزوں نے چالاکی سے قبضہ کیا؟

ہندوستان میں انگریزوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بحیثیت تاجر آئے اور اپنی شاطرانہ چالوں دھوکہ و فریب اور چالاکی سے ہندوستان پر قبضہ کر لیا جس معصومانہ انداز میں یہ دلیل دی جاتی ہے اسی سادگی سے اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور ذہن تاریخ کی ان پیچیدگیوں میں نہیں الجھتا کہ جس کے نتیجے میں یہ تغیر و تبدل ہوا اور ایک معاشرے نے دوسرے معاشرے اور ایک تہذیب نے دوسری تہذیب سے شکست کھائی انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ اتنا آسان نہیں تھا کہ محض چالاکی اور دھوکے سے وہ اقتدار حاصل کر لیتے ہندوستان شکست اور انگریزوں کی کامیابی میں دونوں معاشروں کی ذہنی اور فکری رجحانات تھے۔

جب ہندوستان میں مغل اقتدار روبہ زوال تھا اور اپنی عظمت کے بوجھ تلے اس کی کمر ٹوٹ رہی تھی تو اسی وقت یورپ میں ذہنی و فکری تبدیلیاں رونما ہو رہی تھی جغرافیائی معلومات بحری راستوں کی دریافت ' نئی سر زمینوں کی تلاش اور نئی تجارتی منڈیوں کے حصول نے یورپی معاشرے کو دور جاگیرداری سے نکل کر دور سرمایہ داری میں داخل کر دیا۔ تاجر طبقہ اپنی تجارت کو بڑھانے کی خواہش میں نئی سائنسی و فنی ایجادات میں دلچسپی لے رہا تھا جس کی وجہ سے صنعت و حرفت میں انقلابی تبدیلیاں آرہیں تھیں بادشاہ و امراء کے اقتدار میں تاجر طبقہ بھی شریک ہو گیا تھا اور سیاست کا دائرہ کار وسیع ہو گیا تھا۔

جب کہ اسی وقت ہندوستان میں مغل حکمران کی مرکزی طاقت و قوت کے خاتمہ کے

بعد جگہ جگہ خود مختار گورنر اور حکمران وجود میں آرہے تھے قومی بنیادوں پر اٹھنے والی مرہٹہ ' سکھ ' اور جاٹ تحریکیں لوٹ مار اور جنگ و جدل کے ذریعے سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ ہندوستان معاشرے کی تمام صلاحتیں جنگ و جدل اور تحفظ کی تلاش میں صرف ہو رہی تھیں ہندوستانی معاشرہ اسی طرح جاگیر دارانہ روایات میں مقید یورپ کی فکری تبدیلیوں سے بے خبر تھا جب کہ مغلوں کے عہد سے یورپی سیاح ہندوستان آرہے تھے اور اہل یورپ کو ہندوستان کے بارے میں معلومات فراہم کررہے تھے جو معاشرہ دنیا سے کٹ جاتا ہے وہ تاریخ کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہندوستانی معاشرہ بھی دنیا میں ہونے والی ترقی کی رفتار سے علیحدہ ہوکر پیچھے رہ گیا اس لئے جب انگریز یہاں آئے اور انہوں نے اپنے اقتدار کی راہیں ہموار کیں تو انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ یہ ملک ہندوستانیوں نے فتح کرکے انگریزوں کے حوالے کیا کیونکہ انگریزوں کی فوج میں اکثریت ہندوستانی سپاہیوں کی تھی۔

کیا انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا؟

یہ غلط فہمی بھی بڑی عام ہے کہ انگریزوں نے حکومت و اقتدار اور طاقت مسلمانوں سے چھینی اور ان کی سلطنت پر قابض ہوئے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد سے مسلمان سلطنت تیزی سے زوال پزیر ہوگئی تھی اور جگہ جگہ آزاد اور خود مختار ریاستیں و سلطنتیں وجود میں آگئی تھیں اس دور انتشار میں مرہٹہ طاقت انتہائی مضبوط بن کر ابھری اور انہوں نے دکن و شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرلیا یہاں تک کہ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی برائے نام حکمراں تھا اور مرہٹہ فوج جنرل پیرون کی سربراہی میں حکومت کر رہی تھی جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کیا تو اس نے مغلوں کو نہیں بلکہ مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا اور مغل بادشاہ مرہٹوں کی قید سے نکل کر انگریزوں کی غلامی میں آگیا۔

○○

حوالہ جات

(۱) اکبر شاہ خان نجیب آبادی : آئینہ حقیقت نما، کراچی ۔ ۱۹۵۸ء ص۔ ۹۱

(۲) شاہ ولی اللہ : حجتہ البالغہ جلد اول، کراچی ۔ لاہور ۱۹۷۹ء۔ ص۔ ۲۸۹

(۳) ایضاً ص۔ ۲۹۳

(۴) ایضاً ص ۔ ۲۸۸

ہندوستانی معاشرہ اور انگریزی اقتدار

اگر کوئی معاشرہ دنیا سے الگ تھلگ رہے تو وہ اپنی روایات اور اقدار کو جامد بنا دیتا ہے اگر اس کا رابطہ اور تعلق دنیا کے دوسرے معاشروں سے رہے اور وہ ان کی تہذیبی اقدار سے متاثر ہو تو اس میں ہمیشہ تغیر و تبدل رہتا ہے اور اس کی فکری ترقی کی راہیں کشادہ رہتی ہیں۔

دو معاشروں کے باہمی روابط میں ان کے نقطہ نظر اور رجحانات کا بھی اثر ہوتا ہے قدامت پرست معاشرے کے اثرات ہمیشہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں اور یہ تاریخی رفتار کو ٹھہرانے کی اور تبدیلی کے جذبات کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ترقی شدہ معاشرے سے روابط جمود کو توڑتے ہیں اور ذہن کو فرسودگی و مردنی سے باہر نکال کر اس میں تازگی و شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔

ہندوستان نے تاریخ میں خود کو دنیا سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی اگرچہ تنہا الگ تھلگ رہ کر یہاں کے سماج نے اعلیٰ اور گہری فکری روایات کو جنم دیا مگر اس نے اسے تاریخ کے دھارے سے جدا کردیا انہوں نے جو روایات تخلیق کیں اور انہیں پروان چڑھایا وہ تنہا ماحول میں خوب پھلیں پھولیں مگر جب ان کی تر و تازگی ختم ہوئی تو ان کو نئی زندگی دینے کے لئے نہ تو تازہ آب و ہوا رہی اور نہ زرخیز زمین۔ اس لئے یہ ایک جگہ جامد ہو کر رہ گئیں۔ جب مسلمان حملہ آور یہاں آئے تو ہندوستانی معاشرہ اپنے زنگ آلود اور فرسودہ روایات و عقائد سے ان کا مقابلہ نہ کرسکا۔ یہی عمل اس وقت دہرایا گیا جب مسلمان معاشرہ اپنے تنگ خول میں بند ہوگیا اور انگریزوں اور یورپی روایات و رجحانات سے شکست کھاگیا۔

ہندوستان کا مسلمان معاشرہ اپنے مذہبی تعلق اور لگاؤ کی وجہ سے سرزمین عرب سے متاثر رہا خصوصیت سے مکہ اور مدینہ سے نہ صرف ان کا جذباتی تعلق رہا ہے بلکہ وہاں کے علماء اور ان کے خیالات و افکار سے بھی متاثر رہا ہے۔

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کا تعلق وسط ایشیا اور ایران

سے بھی رہا سیاسی و ثقافتی اثرات انہوں نے وسط ایشیااور اور ایران سے قبول کئے جب کہ مذہبی معاملات میں وہ حجاز کے علماء سے متاثر تھے حجاز کی مذہبی درس گاہیں اسلام کی کلاسیکی تعلیمات کا مرکز تھیں اور زمانے کی تبدیلیوں سے دور اسلام کی تاویل و تفسیر قدیم رجحانات کے ساتھ کرتی تھیں ہندوستان کے جو علماء ان درسگاہوں میں تربیت پاتے تھے وہ واپس ہندوستان آکر انہیں مغربی رجحانات کو پھیلاتے تھے اس کی وجہ سے ہمارے علماء اور مذہبی جماعتیں متشدد اور بنیاد پرست ہوگئیں اور ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کو نہیں سمجھ سکیں سب سے زیادہ اہمیت اس مسئلے کی تھی کہ ہندوستان میں مسلمان حکمراں اقلیت کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ ہندو اکثریت سے بہتر تعلقات کے لئے ضروری تھا کہ رواداری اور صلح کی پالیسی کو اختیار کیا جاتا مگر اس کے مقابلے میں عدم مفاہمت کا نظریہ اختیار کیا گیا اور ہندوستان کے عام مسلمانوں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کو سمجھے بغیر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ اسلامی تعلیمات سے دور رہیں اور انہوں نے مشرکانہ رسومات کو اختیار کر رکھا ہے چنانچہ ہندوستانی علماء نے ہندوستان میں اسلام کو پاکیزہ کرنے کی جدو جہد کر کے اپنے حلقے اور فکر کو تنگ کر لیا۔

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد ہندوستانی معاشرے میں سیاسی و معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ آئیں جنہوں نے قدیم روایات و اقدار کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگرچہ قدیم نظام کے حامیوں نے اس بات کی پوری پوری کوششیں کیں کہ وہ معاشرے کے سماجی و معاشی ڈھانچے کو اسی طرح قدیم بنیادوں پر رہنے دیں مگر نئے چیلنج اور تبدیلیاں اس قدر موثر اور طاقت ور تھیں کہ وہ ان کے آگے نہیں ٹھہر سکے اور جس طرح انہوں نے انگریزوں سے فوجی میدانوں میں شکست کھائی تھی اسی طرح وہ ثقافتی اور تہذیبی میدانوں میں بھی ان کے آگے پسپا ہوگئے۔

انگریزی اقتدار جب ایک مرتبہ قائم ہوگیا تو انہوں نے سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرے میں معاشرتی و معاشی تبدیلیوں کی جانب بھی توجہ دی ان تبدیلیوں نے ہندوستانی روایات اور معاشرے میں توڑ پھوڑ شروع کردی اور یہ جامد اور ٹھہرا ہوا معاشرہ ایک طوفان اور انقلاب سے دو چار ہوا نئی اصلاحات کا اثر ہماری مذہبی روایات اور عقائد پر بھی ہوا اور اس سے بحث کا آغاز ہوا کہ کیا مذہبی تعبیر و تفسیر کو منجمد رہنا چاہئے یا اسے زمانے کی رفتار اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہئے۔

ہندوستان کا جدید نوجوان طبقہ جو مغربی تعلیم حاصل کررہا تھا اس بات کا خواہش مند تھا کہ مذہب کی نئی تاویلات سے جدید اصلاحات کو صحیح ثابت کیا جائے تاکہ وہ مغربی روایات

اور اقتدار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے پہلو بہ پہلو چل سکیں۔

برطانوی اقتدار ہندوستان کی صنعت و حرفت' تجارت اور زراعت میں بھی تبدیلیاں لایا اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انہوں نے یہاں کے پرانے قانون اور عدالتی نظام کو بھی تبدیل کیا جس کی وجہ سے ہمارے طبقاتی معاشرے پر زبردست اثر پڑا۔ صنعت و حرفت میں برطانوی اور مقامی تاجروں کے درمیان رابطے کے لئے دلالوں کا طبقہ پیدا ہوا جس کے مفادات برطانوی حکومت اور اس کے استحکام سے وابستہ ہوگئے۔ اور ان کے ساتھ شریک ہوکر منافع میں حصہ دار ہوگئے۔ زراعتی اصلاحات اور وقف کے قانون میں تبدیلی کی وجہ سے قدیم زمینداروں کی مراعات ختم ہوگئیں اور ان کی بجائے انگریزی حکومت نے اپنے وفادار زمینداروں کی ایک علیحدہ کلاس پیدا کی۔

برطانیہ کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی منڈیوں کو برطانوی مصنوعات سے بھر دیا جس کے نتیجے میں گاؤں اور چھوٹے شہروں کی گھریلو صنعتیں تباہ ہوگئیں اور بے روزگاروں کی کھیپ کی کھیپ دیہاتوں اور قصبوں کی پرسکون فضا اور ماحول کو چھوڑ کر شہر کی پر رونق مگر گندی فضاؤں میں آکر آباد ہونے لگی قصبوں اور شہروں کی آبادی کے تناسب نے معاشرے کی سماجی و ثقافتی زندگی کو متاثر کیا' اور خاندان کے روایتی ڈھانچے کو بدلا۔ اس کے ساتھ ہی نئے تعلیمی ادارے مغربی تعلیم کے ذریعے نئی نسل کو پرانی اقدار کی مخالفت میں تیار کررہے تھے اور ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر علمی و فکری حملے ہورہے تھے تاکہ مغربی تہذیب کی برتری کو ثابت کیا جائے۔

ان حالات میں ہندوستان کا اسلامی معاشرہ بھی متاثر ہوا' سیاسی تبدیلیوں نے قدیم مسلمان امراء اور زمینداروں کی حیثیت کو بدل ڈالا' عہدے و منصبوں کی محرومی اور جاگیروں کی تبدیلی نے ان مراعات کو ختم کردیا یا گھٹادیا۔ نئی صنعتی تبدیلیوں نے صنعتی طبقے کے افراد کو روزی سے محروم کردیا اور علماء کا طبقہ نئی تعلیم کے آگے جاہل بن کر رہ گیا اور ملازمتوں کے دروازے بند ہونے کی صورت میں معاش سے بھی محروم ہوگیا یورپی مفکرین کی جانب سے مسلمانوں اور اسلام پر جو اعتراضات کئے جارہے تھے اور ان کی ثقافتی و تہذیبی علامتوں کو جس طرح توڑا جارہا تھا وہ بھی پورے معاشرے کے لئے باعث اذیت تھا اس لئے ہندوستان کے مسلمان معاشرے کی یہ انتہائی اہم تاریخ ہے کیونکہ اس اہم موڑ پر ان کے منجمد معاشرے میں پہلی مرتبہ حرکت ہوئی اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ مغربی چیلنجوں کا جواب دیا جائے اور اپنی تہذیب و ثقافت کا عقلی بنیادوں پر دفاع کیا جائے۔

ابتداء میں جدیدیت کے نام پر جو تحریک اٹھی اس کے پس منظر میں مسلمان زمینداروں اور امراء کا نوجوان طبقہ تھا جو انگریزی حکومت سے مفاہمت کا خواہشمند تھا اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ وہ انگریزی زبان سیکھے، مغربی تعلیم حاصل کرے اور مغربی تہذیب کے طور طریقے اختیار کرے تاکہ وہ حکمران طبقے کے قریب آسکے ان کی ملازمت اختیار کرسکے اور اس طرح اپنے مفادات کا تحفظ کرسکے اس مقصد کے لئے اسے مذہبی جواز کی ضرورت تھی تاکہ معاشرے میں ان اقدام سے اس کی عزت و وقار میں کمی نہ آئے اس لئے اس بات پر زور دیا گیا کہ اسلام اور جدیدیت میں کوئی فرق نہیں، کرامت علی جون پوری(وفات ۱۸۷۷ء) نے بنگال میں اس کی تبلیغ کی کہ مسلمانوں جو جدید علوم سیکھنا چاہئیں کیونکہ جدیدیت کا اسلام سے کوئی تصادم نہیں دہلی میں "دہلی کالج" کا قیام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا جس نے قدیم و جدید کے امتزاج کے ساتھ روشن خیال تعلیم یافتہ مسلمانوں کا طبقہ پیدا کیا۔

مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کی بہترین نمائندگی سرسید احمد خان نے کی انہوں نے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں نے غیر ملکی طاقت کے خلاف قدامت پرست اور رجعت پرست ہتھیاروں سے جنگ میں شکست کھائی اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی بقاء اور خوش حالی کے لئے وہ انگریزی حکومت کے ساتھ وفادار رہیں۔ اور خود کو جدید مغربی علوم سے آراستہ کریں حکومت کی بدگمانیاں دور کرنے کے لئے انہوں نے مسلمانوں کو سیاست، پان اسلام ازم اور ہر اس چیز سے دور رکھنے کی کوشش کی جس سے انگریزی حکومت کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم پر زور دیا تاکہ مسلمان امراء اعلیٰ عہدے حاصل کرکے حکومت میں شریک ہوجائیں۔ لیکن ہندوستان میں جدید تعلیم اور برطانوی تسلط کے نتیجے میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں وہ ان کی علیحدگی پسندی کی پالیسی کے باوجود نہیں رک سکیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان اس علیحدگی کی وجہ سے دوسری قوموں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے اور ہندوستان کے سیاسی دھارے کا ساتھ نہیں دے سکے۔

ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو ابتدائی مرحلے پر جو مسئلہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ جدید خیالات و افکار اور نئے سائنسی انکشافات جن سے مذہبی و سماجی اور معاشی افکار پر زد پڑ رہی تھی اور جن کی وجہ سے ان کے عقائد متزلزل ہورہے تھے۔ اس چیلنج کا جواب کیسے دیا جائے؟ سرسید اس بحران پر قابو پانے کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ اسلام اور جدید

خیالات و افکار' سائنسی ایجادات اور ترقی کی رفتار کو باہم ملایا جائے اس مقصد کے لئے انہوں نے قرآن کی عقلی تفسیر کی اور روائتی اصطلاحوں کے نئے انداز سے تشریح کی تاکہ جدید ذہن اسے سمجھ سکے اگر چہ ان کا یہ قدم بغاوت کے مترادف تھا کیونکہ اس سے قدیم اور جدید روایات پسند علماء کی عقل و فہم پر شبہ ہوتا تھا۔

انہوں نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا جو مغربی مستشرقین اسلام اور اسلامی تاریخ پر اعتراضات اور تنقید کر رہے تھے۔ اہم اعتراضات جو اس وقت کئے جا رہے تھے وہ جہاد اور غلامی اور ایک سے زیادہ شادیوں پر تھے انہوں نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد خاص حالات میں فرض ہے غلامی کو کوئی تصور اسلام میں نہیں اور نہ ہی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے معاشرے میں نئے معاشی ڈھانچے کے قائم ہونے کو بھی انہوں نے اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ بنک کی رقم پر سود جائز ہے۔

انہوں نے مذہب کے فروعی عقائد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اسلامی قانون کی وسعت دی اور زمانے کی تبدیلیوں کے زیر اثر اسلامی قانون میں ترمیم کو ضروری سمجھا اسلام کے چاروں مسلکوں کے درمیان فرق کم کرنے کی کوشش کی اور اجتہاد پر زور دیا۔

مولوی چراغ علی نے سرسید کے افکار کو مزید وسعت دی کیونکہ یہ یورپی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور یورپ میں اسلام پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان سے واقف تھے اس لئے انہوں نے بھی ایک سے زیادہ شادیوں اور جہاد اور غلامی پر جدید اقدار کی روشنی میں لکھا انہوں نے اجتہاد پر زور دیا اور علماء کے اجماع کی مخالفت کی اسلامی قانون کے مطابق تمام ماخذوں کی مخالفت کرکے صرف قرآن کو صحیح ماخذ ثابت کیا انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قدیم اسلامی قانون صرف ایک خاص عہد اور زمانے کے لئے تھا اور یہ ۹ ویں اور ۱۰ ویں صدی کے تاریخی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اس لئے جدید دور میں اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور اب اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ سرسید اور چراغ علی کے ان مذہبی افکار کے خلاف قدامت پرستوں میں زبردست رد عمل ہوا جس کا اظہار ان کے خلاف کفر کے فتوؤں میں ملتا ہے سرسید کے ساتھی اور رفیق نواب محسن الملک نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے قدیم اور بنیاد پرستی پر زور دیا' اور کوشش کی کہ جدید اور قدیم کی انتہا پسندی سے نکل کر درمیانی راستہ اختیار کیا جائے تاکہ علی گڑھ تحریک جو قدیم خیالات کے حلقوں میں نامقبول رہی ہے اسے روکا جائے۔

مغربی تہذیب کے اثرات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں عورت کو اس کا صحیح اور جائز مقام دیا جائے اس کے پس منظر میں بھی نئے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کی امنگیں تھیں جو جدید تعلیم کے بعد انگریزوں سے میل جول کے لئے ان کی عادات و اطوار اور طور طریق اختیار کرنا چاہتا تھا کیونکہ انگریزی معاشرے میں عورت و مرد ساتھ ساتھ پارٹیوں میں شرکت کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے محرم و غیر محرم کی تفریق کے بغیر ملتے تھے اس لئے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خواہشمند تھا کہ وہ خیالات کو بھی دور کرے کہ مسلمان معاشرے میں عورت کا غلام بنا کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں اعلیٰ اونچے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں حقوق نسواں کی تحریک شروع ہوئی تاکہ عورت کو معاشرے میں برابر کا درجہ دیا جائے۔

شبلی اور امیر علی کے ذہنی اور فکری رجحانات میں تبدیلی آئی دونوں نے اسلامی تاریخ کی مدد سے اسلامی معاشرے میں مدافعت کرنے کی کوشش کی شبلی کے ہاں ماضی کی شان و شوکت اور تاریخی شخصیتوں کے کارناموں کو ابھارنے کی کوشش ہے تو امیر علی کے ہاں مدافعانہ انداز کے بجائے جارحانہ انداز ملتا ہے وہ آگے بڑھ کر عیسائیت کی تاریخ اور انکے مذہب پر حملے کرتے ہیں اور ان سے مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک تاریخی فکر ہو' لہٰذا ان کے ہاں سنی و شیعہ تاریخی نظریات کو ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

اقبال کے ہاں مغرب کی مخالفت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ وہ ان مغربی مفکرین سے متاثر ہوکر جو اپنی تہذیبی برائیوں سے پردہ اٹھارہے تھے اور ان کے دلائل کے ذریعے مغربی تہذیب پر حملہ آور ہوئے ان کے ہاں جمہوریت' مادیت' مغربی صنعت و حرفت کی ترقی و فنی و سائنسی ایجادات کی مذمت ہے اس سے غلام اور پسماندہ مسلمان معاشرے کو ذہنی خوشی و مسرت ضرور ہوئی لیکن یہ وقتی مسرت افیون ثابت ہوئی جس نے انہیں با عمل بنانے کی بجائے سلا دیا کیونکہ ان کے اشعار میں یہ پیغام ہے کہ مغربی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کررہی ہے۔ اور مشرق بیدار ہورہا ہے۔

قدیم و جدید روایات کے درمیان یہ تصادم ہمیں فرنگی محل' خیر آبادی اسکول' دیو بند' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز کی تحریکوں میں ملتا ہے پاکستان بننے کے بعد یہ تصادم اور زیادہ شدید ہوگیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنیاد پرست قومیں زیادہ طاقت ور ثابت ہورہی ہیں اور معاشرہ آہستہ آہستہ رجعت پرستی کا شکار ہورہا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر دو قوتوں کے اس تصادم میں رجعت پرست قوتیں کیوں غالب آرہی ہیں۔ ؟ اور اگر اس وقت ان کا غلبہ ہے تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں روشن خیال طاقتیں فتح مند ہوں گی۔

جہاں تک تاریخی عمل کا تعلق ہے کسی بھی معاشرے میں ترقی بغیر کسی رکاوٹ کے نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ معاشرہ بغیر مزاحمت کے آگے کی جانب بڑھتا چلا جائے' ترقی ہمیشہ تصادم کے نتیجے میں ہوتی ہے اس کو قدیم و جدید کشمکش کہا جائے یا خیرو شر اور نیکی و بدی کی جنگ کہا جائے اس تصادم کی وجہ سے معاشرے کی ترقی خمدار اور پیچ در پیچ لائنوں کے درمیان سے گزر کر ہوتی ہے اس کی مثال یورپ کی تاریخ سے دی جاسکتی ہے جہاں تحریک نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح مذہب کے جواب میں جیسوئٹ (JESUITS) تحریک ابھری۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں لبرل ازم اور سوشلزم کی تحریکیں اٹھیں معاشرے میں ایک عمل کا رد عمل ہوتا ہے اور روایات اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد پھر سے تعمیر ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر کسی مرحلے پر رجعت پسند طاقتیں کامیاب ہوجاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وقت کا دھارا ان کے ساتھ ہے یہ تاریخ کا ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے کیونکہ بہت جلد ان کو ترقی پسند طاقتوں کے آگے پسپا ہونا پڑتا ہے۔

پس ماندہ ممالک جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں غربت' مفلسی' جہالت اور علم سے دوری اہم مسائل ہیں جو معاشرے کی اکثریت کو شعور و آگہی سے روکتے ہیں اس لئے یہ حکمران طبقے کے مفاد میں ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کو اس طرح کے سخت پتھر میں بدلنے کے لئے جو حربے اختیار کریں وہ یہ ہیں کہ انہیں بیرونی دنیا اس کی ترقی اور اس کی رفتار سے بے خبر رکھا جائے تاکہ معاشرے میں وقت کی تیزی کو روکا جاسکے بیرونی رابطے کے کٹ جانے سے وہ تنگ و تاریک خول میں بند ہوجاتے ہیں اور انہیں دنیا کی تبدیلی کی کوئی خبر نہیں ہوتی اگر ان تبدیلیوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو اپنے نقطہ نظر سے مثلاً" مغرب کے بارے میں ہمارے ہاں صرف منفی باتیں زیادہ بتائی جاتی ہیں اور ان کی خوبیوں کے تذکرے بہت کم ہوتے ہیں ذہن کو منجمند کرنے کے لئے نظام تعلیم کو اس طرح تشکیل دیا جاتا ہے کہ جس سے صرف اپنے معاشرے کی خوبیاں اجاگر ہوں تاکہ اپنا مقابلہ دوسرے معاشروں سے نہ کریں اور اس پر فخر کریں کہ ان کی روایات و اقدار دوسرے سے برتر و اعلیٰ ہیں۔ پھر فرسودہ روایات کو برقرار رکھنے کے لئے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ ان سے ہمارا تشخص قائم ہے اور اگر انہیں توڑا گیا تو ہمارا تشخص بھی ختم ہوجائے گا ان افکار و خیالات کے ذریعے باطل نظام

اور اس کی مردہ روایات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ معاشرے کو ترقی کی رفتار سے دور رکھا جائے۔

لیکن تاریخ کی رفتار اور اس کا بہاؤ بڑا تیز ہوتا ہے اور اس طوفان کے آگے مضبوط اور طاقت ور بند ٹوٹ جاتے ہیں ذہن ایک جگہ منجمند رہنا نہیں چاہتا بلکہ تبدیلی چاہتا ہے ذہن کی یہی خواہش اور عزم معاشرے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نئی اقدار تخلیق کرے اور پرانی زنجیروں کو توڑ کر آگے بڑھے۔

○○

سرسید اور اقبال

تعارف

سرسید احمد خان' جو سرسید کے نام سے مشہور ہیں' اپنے عہد کی اہم شخصیت تھے جن کے خیالات و افکار نے نہ صرف ان کے اپنے زمانے کی نسل کو متاثر کیا بلکہ آگے چل کر انہوں نے آنے والی نسلوں کے شعور کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔

سرسید کے نظریات و افکار مسلمانوں کے نئے تعلیم یافتہ ابھرتے ہوئے زمینداروں اور جاگیرداروں کے طبقے کے لئے انتہائی سود مند تھے اس لئے انہوں نے بہت جلد سرسید کی شخصیت کے گرد عظمت و بزرگی کا حصار کھینچا اور ان کی ذات و شخصیت کو مقدس بنا دیا ہمارے ہاں اب تک سرسید کی شخصیت اور ان کے سیاسی' سماجی و تعلیمی افکار کا مطالعہ بنے بنائے خاکے کے تحت کیا جاتا ہے اور اس سے ہٹ کر اس کا تجزیہ کرنے کی بہت کم کوششیں کی گئی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید کی شخصیت اور افکار کو جدید تحقیق کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے اور اس بات کا تجزیہ کیا جائے کہ سرسید نے ہمیں کیا مثبت چیزیں دیں اور کیا منفی۔ اور ان کے منفی نظریات کا ہماری نسل پر کیا اثر پڑا۔

سرسید کے بارے میں ہمارے ہاں پہلی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر بڑی جرات و ہمت کا ثبوت دیا۔ لیکن واقعات کا تجزیہ ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے۔

۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار رہا جبکہ انگلستان میں پارلیمنٹ کمپنی کے اقتدار کو پسند نہیں کرتی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ کس طرح کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے براہ راست پارلیمنٹ کے اقتدار کو ہندوستان میں قائم کرے اس سلسلے میں پارلیمنٹ نے مختلف اوقات میں اپنے اثر کو بڑھانے کے لئے مختلف طریقوں سے کمپنی کے معاملات میں دخل دیا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا تو پارلیمنٹ کو اس بات کا موقع مل گیا

کہ وہ یہ ثابت کرے کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت ناکام ہوچکی ہے اس لئے ہندوستان سے کمپنی کی حکومت ختم کرکے ملک کو براہ راست پارلیمنٹ اور ملکہ برطانیہ کے تحت لایا جائے۔

اس موقع پر سرسید کا رسالہ اسباب بغاوت ہند' پارلیمنٹ کے لئے ایک بہترین دستاویزی ثبوت ثابت ہوا' جس میں کمپنی کی پالیسیوں پر تنقید کی گئی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا ذمہ دار انہیں کو قرار دیا گیا اس لئے یہ رسالہ ممبران پارلیمنٹ کے لئے جو کمپنی کے خلاف تھے ایک نعمت سے کم نہ تھا جس کے ذریعے انہوں نے کمپنی کی حکومت کے خلاف دلائل دیئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے کمپنی کا اقتدار ختم ہوا اور یہاں پر پارلیمنٹ اور تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی اس پس منظر میں اس بات کو مسترد کیا جاسکتا کہ یہ رسالہ سرسید سے لکھوایا گیا' کیونکہ فوراً" اس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور اس کی کاپیاں ممبران پارلیمنٹ میں تقسیم ہوئیں اور وہاں اس کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔

سرسید کے بارے میں دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ذلت و پستی سے نکالا اور ان میں تعلیم عام کی ان کے اس کارنامے کو بھی مبالغے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے دراصل مسلمانوں کی پستی کا تصور' ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نے دیا اس میں بنگال کے مسلمانوں کی پستی اور جہالت کا ذکر ہے لیکن بعد میں اس کو یوپی کے مسلمانوں پر بھی لاگو کردیا۔ جب کہ یوپی کے مسلمان پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر خوشحال تھے اور تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے بھی آگے تھے یہی حال سرکاری ملازمتوں کا تھا۔ جس میں ان کا تناسب ہندوؤں سے زیادہ تھا ایس ایم ۔ جین کے حکومت کے ریکارڈ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۸۴ء تک مسلمانوں نے ہندوؤں سے زیادہ تعلیم کا فائدہ اٹھایا۔ اور ان کی تعداد پرائیویٹ سکنڈری اسکول میں زیادہ تھی۔ (۱)

سرسید کے بارے میں تیسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلائی۔ اس میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے کیونکہ سرسید سے بہت پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوچکا تھا اور مسلمان طلبہ حکومت کے قائم کردہ اسکولوں میں انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ سرسید کے قائم کردہ اینگلو محمڈن کالج نے اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کی تعلیم میں کوئی زیادہ حصہ نہیں لیا۔ مثلاً" ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء تک ایم ۔ او ۔ کالج سے ۲۲۰ مسلمان گریجویٹ نکلے جبکہ الہ آباد یونیورسٹی نے اس دور میں ۴۲۰

مسلمان کریجویٹ پیدا کئے۔ (۲)

اس لئے سرسید کی مخالفت ان کے تعلیمی نظریات کی وجہ سے نہیں ہوئی یہ مخالفت ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے تھی۔ ورنہ مسلمان زمینداروں اور امراء کا طبقہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کمپنی کے ابتدائی دور سے ' مسلمان علماء تک انگریزی ملازمتوں میں آچکے تھے۔

سرسید کے اصلاحی پروگرام میں شہر کے رہنے والے زمیندار اور جاگیردار تھے وہ اس طبقے کو مسلمانوں کے نمائندہ طبقے کی حیثیت سے آگے لانا چاہتے تھے۔ اسی لئے جب ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں آئیں اور جدید تعلیم نے جمہوری اقدار کو فروغ دیا تو سرسید نے اسے مسلمان امراء کے طبقے کے مفاد کے خلاف سمجھا اور جمہوریت کی سخت مخالفت کی' انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ مغربی طریقہ نمائندگی اختیار نہ کریں کیونکہ اس طریقے میں مسلمان جو اقلیت میں ہیں اپنے حقوق سے محروم ہوجائیں گے۔ جمہوریت کی مخالفت اس وقت مسلمان امراء کے مفاد میں تھی لیکن یہ تاثر دیا گیا کہ یہ تمام مسلمان قوم کے خلاف ہے اور جمہوریت کے قیام سے وہ ہمیشہ جاہل رہیں گے اور انہیں معاشرے میں باعزت مقام نہیں ملے گا۔ کیونکہ وہ اس طرح ہندوؤں کے غلام ہوکر مستقل اقلیت میں تبدیل ہوکر ختم ہوجائیں گے۔ اس لئے انہوں نے جداگانہ انتخاب اور کوٹہ سسٹم کا مطالبہ کیا جس سے اس طبقے کو فائدہ ہوا لیکن ہندوستان کے مسلمان عوام ان فوائد سے محروم رہے۔

فکر اقبال کی بنیادوں میں اس کا تجزیہ کیا گیا کہ اقبال نے اپنی فکر کی راہیں کس طرح متعین کیں بدقسمتی سے یہ افکار مسلمان معاشرے کی تشکیل میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرسکے اقبال کی شاعری اور افکار پر یہ مطالعہ بہت مختصر اور احتیاط سے لکھا گیا ہے' شاید یہ ہمارے سوچنے کی راہوں کو مزید وسیع کرسکے۔

○

حوالہ جات

1 - S.M. Jain:

The Aligarh Movements, its Origin and Development, 1858-1906

2 - Paul R.Brass:

Langugae, Religion and Politics in North India Cambridge 1974 p.p. 165-166

سرسید اور مفاہمت کی پالیسی

ابتدائیہ

تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ جب کوئی فاتح قوم کسی ملک کو فتح کرکے اس پر حکومت کرتی ہے تو اسے شکست خوردہ قوم کی جانب سے دو رجحانات سے سابقہ پڑتا ہے اول قوم کا ایک طبقہ جو شکست کے باوجود فاتح قوم کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے ساتھ مزاحمت کی پالیسی اختیار کرتا ہے دوم اس کے مقابلے میں ایک ایسا طبقہ بھی ہوتا ہے جو اپنی جائیداد' دولت اور جان و مال کی حفاظت کے لئے فاتح قوم سے مفاہمت اور تعاون کی پالیسی اختیار کرتا ہے اور یہ طبقہ فاتح کی حکومت' ان کی روایات ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کے قوانین کو قبول کرلیتا ہے اسکے نتیجے میں انہیں حکومت کے انتظام میں شریک کیا جاتا ہے اور نہ صرف ان کی جائیدادیں محفوظ رہتی ہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

تاریخ میں یہ سوال ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے کہ فاتح قوم کے ساتھ مفاہمت کرنے والے کیا ملک و قوم کے غدار ہوتے ہیں یا نجات دہندہ ؟ بعض اوقات شکست مفتوح قوم کو اس قدر کچل دیتی ہے کہ اس میں مزاحمت کے تمام جذبات ختم ہوجاتے ہیں اور اس میں اس قدر حوصلہ' ہمت اور جرات نہیں رہتی کہ وہ دوبارہ فاتح قوم سے مزاحمت کر سکے ایسے موقعوں پر وقتی مصالحت اور مفاہمت قوم کو سہارا دینے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ شکست کے آثار آہستہ آہستہ ختم ہوجائیں لیکن اگر مفاہمت کی پالیسی کی جڑیں گہری ہوجائیں تو قوم اس کے اثر سے غلام بن کر رہ جاتی ہے اس لئے اگر مفاہمت کی پالیسی کی حد بندی کا تعین نہ کیا جائے تو اس کے اثرات قوم کے لئے بڑے مضر ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور انگریز

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج ہندوستان کی سیاست میں انتشار اور ناانصافی کی

وجہ سے تھا کمپنی نے اس سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ اپنے اقتدار کو یہاں تک بڑھایا کہ مغل بادشاہ بھی اس کا وظیفہ خوار ہوگیا۔ اس پورے عرصے میں ہندوستان کے حکمران طبقے نے خود کو انتہائی نااہل اور نالائق ثابت کیا ان میں نہ تو اتنی فراست تھی کہ وہ کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر سیاسی نشیب و فراز کا اندازہ لگا لیتے اور نہ ہی ان میں اتنی دانش مندی تھی کہ وہ آپس کے جھگڑوں کو ختم کرکے اپنی سیاسی حیثیت کو مضبوط کرلیتے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے عوام کی حیثیت محض شطرنج کے مہروں کی طرح تھی وہ اپنی معاشی تنگ و دو میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں حکمرانوں کے جھگڑے اور کمپنی کی سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اس کا مقصد حصول معاش اور پرسکون زندگی تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جسے اب جنگ آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی ابتداء جاگیردار طبقے کی جانب سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے شروع کرنے والے فوجی اور سپاہی تھے اور جاگیردار طبقہ ان کے دباؤ سے اس میں شریک ہوا ورنہ وہ اپنی پنشنوں اور وظیفوں سے خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی اکثریت اس ہنگامے سے دور رہی اور اپنی جائیدادوں اور ریاستوں کی خاطر انہوں نے انگریزوں سے تعاون کیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی میں بھی جاگیردار طبقہ کا ہاتھ تھا جس نے مزاحمت کی بجائے مفاہمت پر عمل کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہوگیا انہوں نے اپنی مخالف قوتوں کو اس قدر سختی سے کچلا کہ ان کے خلاف مخالفت کے تمام امکانات ختم ہوگئے۔

سرسید: امراء کے نمائندے

ان سیاسی حالات میں سرسید نے اپنی مفاہمت کی پالیسی کو عملی تشکیل دینے کا ارادہ کیا وہ ہندوستان کے جاگیردار طبقہ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ کہ وہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکے انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ اس طبقے نے آخری عہد مغلیہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اس طبقے کی ذہنی پس ماندگی کی دلیل ہے کیونکہ نہ تو ان میں تعلیم تھی' نہ فن و ہنر اور نہ انتظامی صلاحیتیں اور نہ ہی ان میں اتنی قوت و طاقت تھی کہ وہ انگریزوں سے مزاحمت کرسکیں۔ سرسید اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ انگریزوں میں یہ لیاقت موجود ہے کہ وہ ہندوستان پر حکومت کریں اس سے بہتر ہندوستانیوں کو اور کوئی دوسرا حاکم نہیں مل سکتا۔

سرسید نے مفاہمت' تعاون اور وفاداری کی جو تعلیم دی اس کے ذریعے وہ مسلمانوں کے

ایک خاص طبقے کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے اور یہ طبقہ مسلمان امراء اور جاگیرداروں کا تھا جب وہ لفظ مسلمان قوم استعمال کرتے تو ان کے سامنے اسی محدود طبقے کے مفادات ہوتے تھے' مسلمان عوام کے نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت کے قیام و استحکام اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے طبقے کو بری طرح متاثر کیا تھا ان کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں اور ان کی دولت لٹی تھی ان کی مراعات ختم ہوئی تھیں ان کا اقتدار جاتا رہا تھا ان کی قوت و طاقت ٹوٹی تھی جس کی وجہ سے یہ طبقہ بے حس اور بے جان تھا اس طبقے نے نہ تو کبھی زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کیا تھا اور نہ ہی ان میں مقابلہ کرنے کی جرات و ہمت تھی۔ اس لئے اس طبقے کو مزاحمت کی پالیسی اختیار کرنے پر زور دینا ایک ناممکن بات تھی اس کے برعکس اپنے اثر و رسوخ کو باقی رکھنے کی ایک ہی صورت تھی کہ انگریزی حکومت سے مفاہمت کی جائے جو سرسید نے ان کے نمائندے کی حیثیت سے اس کی تبلیغ کی تو یہ جوق در جوق اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ جہاں تک ہندوستانی عوام کا تعلق تھا وہ استحصالی طبقوں کا شکار تھے اس لئے ملک کی حکمرانی کا تبدیل ہونا ان کے لئے زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا سرسید کا تعلق مغل امراء کے خاندان سے تھا انہوں نے جس گھرانے میں پرورش پائی تھی اور جس ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی وہ امراء کے طبقے سے مخصوص تھا اس لئے ان کی سوچ غور و فکر اور رجحانات میں اس طبقے کی ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے وہ ایک مخصوص جاگیردارانہ ذہن رکھتے تھے اور اس سے ہٹ کر نہ سوچ سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ اس طبقے پر بیتی وہ اس سے بڑے متاثر تھے۔ اس طبقے کے بچاؤ اور تحفظ کا جو راستہ انہیں نظر آیا اس کا اظہار وہ اس طرح سے کرتے ہیں:

> "مگر آج جب کہ ہماری شان و شوکت ختم ہو چکی ہے ہمارے اشراف ذلیل ہوگئے ہیں ہمارے معزز خاندان تباہ ہوگئے ہیں اور برابر ہوتے چلے جارہے ہیں اس وقت ہماری خواہش یہی ہے کہ انگریز قوم کو ہندوستان میں امن و سکون کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملے۔" (۱)

ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں مسلمان امراء اور جاگیرداروں کا طبقہ باقی رہے اور وہ تدابیر اختیار کی جائیں کہ ان کی جائیداد اور مراعات کا تحفظ ہوسکے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان قوم کی عظمت کا دارو مدار امراء اور روساء پر ہے۔ جس قدر یہ طبقہ مالدار ہوگا اور جس قدر شان و شوکت والا ہوگا اسی قدر مسلمانوں کی عزت ہوگی۔

> "چونکہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اور جو

امیر اور ذی مقدرور خاندان تھے ان کی اولاد غریب اور مفلس ہوگئی ہے اس لئے مجھ کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ جس سے مسلمانوں کی ریاستیں قائم رہی اور مسلمانوں میں رئیس و ذی مقدور لوگ دکھائی دیں" (۲)

مذہب اور مفاہمت

سرسید نے مذہبی نقطہ نظر سے مفاہمت کی پالیسی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی اور مذہبی دلائل کے ذریعے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریزی حکومت کو تسلیم کرلینا عین اسلام ہے چونکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مذہبی لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہیں دونوں ایک جیسے عقائد رکھتے ہیں اس لئے ان سے تعاون کرنا مذہبی فرائض میں سے ہے۔

وہ مسلمانوں کے طبقہ امراء کو اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ ان کا دور حکومت ختم ہوگیا لہٰذا وہ خود کو ذہنی طور پر محکوم بننے پر تیار کریں " ہم کو اب محکوم بن کر رہنا ہے اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہیں" (۳)

اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ "جب تم میں حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے کی کوشش کرو" (۴) سرسید نے مذہب کے ذریعے اس بات کو ثابت کیا کہ چونکہ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی ہے اس لئے ان کی حکومت کے خلاف آواز اٹھانا' بغاوت کرنا اور جہاد کا نعرہ بلند کرنا مذہبی تعلیمات کے خلاف ہے۔

" اگر مسلمان انگریزی گورنمنٹ میں پر امن زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ شریعت اسلام کی رو سے انگریزوں سے جہاد نہیں کرسکتے ان کو ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرماں برداری سے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اول میں مسلمان حبش میں عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے" (۵)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے پیشوا نے کیا کہا تھا اس نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ حاکم وقت اور بادشاہ وقت کی اطاعت کرو' **ولوکان عبداحبشا** پس آپ خیال کیجئے کہ جب ہم کو ایک

کالے منہ کے غلام بادشاہ کی اطاعت کی ہدایت کی گئی ہے تو ہم گورے منہ
والے حاکموں کی اطاعت سے منہ کیوں پھیر دیں" (۶)

انہوں نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا کہ اگر ہم پر کوئی ایسی قوم حکومت قائم کرے جو ہمیں مذہبی آزادی دے انصاف سے حکومت کرے ملک میں امن و امان قائم رکھے جیسا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں پر یہ مذہبی فرض عائد ہو گا کہ وہ تابع اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں (۷) وہ مسلمانوں کو اس بات سے متاثر ہونے کی تلقین کرتے ہیں کہ خدا نے ان پر انگریزوں کو حاکم بنادیا ہے(۸) مزید وہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ :

" تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالتخصیص مسلمانوں کی خیرو عافیت اسی
میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی
بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے۔ کہ جن کی
ہم رعیت ہو کر اور مائن ہو کر رہتے ہیں ان کے ساتھ وفادار رہیں" (۹)

یہاں سر سید ان حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں جو ایک سامراجی طاقت مفتوح ملک کی معیشت کے ساتھ کرتی ہے اگر وہ معاشرے میں مذہبی آزادی برقرار رکھے تو اس کا اس کے سامراجی عزائم پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کا اصل مقصد معاشی لوٹ کھسوٹ ہوتا ہے۔

مفاہمت کے سلسلے میں انہوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں میں مذہبی بنیاد پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بائبل کی تفسیر لکھی تاکہ دنوں مذاہب کے عقائد میں مفاہمت پیدا کی جائے۔ (۱۰) مسلمان امراء جو تعصب اور تنگ نظری کی دنیا میں رہتے تھے اس سے انہیں نکالنے کے لئے انہوں نے مذہب کا سہارا لیا مثلاً" مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے اس پر انہوں نے "رسالہ احکام طعام اہل کتاب" لکھا اور یہ ثابت کیا کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا ازروئے اسلام جائز ہے۔(۱۱)

سر سید نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں باہمی تعاون پر زور دیا:

" البتہ میری خواہش رہی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو
کیونکہ قرآن مجید کے مطابق کوئی فرقہ اگر ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی
ہیں" (۱۲)

انگریزی طرز معاشرت اور مفاہمت

مفاہمت کی پالیسی کو انگریزی طرز معاشرت اختیار کرنے سے مزید تقویت ملتی اس لئے سرسید نے کہا کہ: فتح مند قوموں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فاتح قوم کے اخلاق و عادات اختیار کریں' ان کے طور طریق کو دیکھیں (۱۳) سرسید نے خود بھی اس کا عملی مظاہرہ کیا اور اپنی روز مرہ زندگی میں انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کیا سرسید کے اس عمل سے یہ ضرور ہوا کہ مسلمان جاگیرداروں کا طبقہ جو اپنی چھوٹی سی دنیا میں محدود تھا اس سے اس کی روایات اور قدروں کی دنیا ٹوٹی اس میں دوسروں کے طور طریق اختیار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

بد قسمتی سے اس کے کوئی مثبت نتائج بر آمد نہیں ہوئے اس طبقے نے انگریزی معاشرت کو محض حکمرانوں کو خوش کرنے کے لئے اختیار کیا جس کی وجہ سے ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے اپنی تہذیب و ثقافت کا مذاق اڑایا اور اپنے ملک و عوام سے کٹ کر یہ حکمران اور عوام کے درمیان استحصالی طبقہ بن گئے۔ یہی وہ طبقہ تھا جس نے آزادی کے بعد انگریزوں کی جگہ لی۔

تعلیم اور مفاہمت

سرسید کی مفاہمت کی پالیسی کو آگے بڑھانے میں تعلیم سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔ سرسید مغربی تعلیم کے ذریعے قدیم روایات اور قدروں کا خاتمہ چاہتے تھے انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جب تک امراء کے طبقے کا قدیم روایات سے تعلق رہے گا اس وقت تک وہ مفاہمت کے میدان میں کامیاب نہیں ہوسکتے اس کا اظہار وہ اس طرح سے کرتے ہیں

> " جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہیں پھیلے گی اور جب تک انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست اور میل جول پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے" (۱۴)

حالی نے بھی سرسید کی ان خدمات کو سراہا ہے جو انہوں نے تعلیم کے میدان میں کیں جس کی وجہ سے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا ہوا (۱۵) سر آکلینڈ نے سرسید کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ کا طالب علم ہندوستانیوں کے اس فرقے کا ایک نمونہ ہے۔ جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے " (۱۶) سرسید کو امید تھی کہ وہ انگریزی تعلیم کے ذریعے ایک ایسی نسل تیار کر سکیں

گے جو انگریزی گورنمنٹ کی بہتر رعایا بن سکے گی۔ (۱۷)

انگریزی تعلیم کے بارے میں انہوں نے جو دلائل دیئے اس سے، ان کی مفاہمت کی پالیسی کی مزید وضاحت ہوتی ہے وہ مفتوح قوم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے حکمران قوم کی زبان اختیار کرنا چاہئے جیسے امیہ اور عباسی دور میں عربی فاتح قوم کی زبان رہی اور اسے مفتوح قوموں نے سیکھا۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں فارسی حکومت کی زبان رہی' اس طرح اب انگریز عملداری میں انگریزی زبان کی یہی حیثیت ہے جو عربی و فارسی کی تھی۔ (۱۸)

سر سید اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کسی ملک نے اس وقت تک علم و فنون میں ترقی نہیں کی جب تک اس نے حکمران قوم کے علوم کو حاصل نہیں کیا تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ایسی زبان کے ذریعے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو' کسی قوم نے ترقی کی ہو۔ (۱۹) اس کی مثال وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے دیتے ہیں اس عہد میں انہی لوگوں کو سرکاری ملازمتیں ملیں جنہوں نے مسلمان قوم کے علوم' ان کی زبان' ان کے خیالات' ان کا تمدن' ان کا لب و لہجہ اور ان کی روش اختیار کی۔ لہذا اس وقت یہ سوچنا کہ وہ دیسی و مشرقی علوم و زبان کے ذریعے ترقی کرسکتے ہیں ایسا ہی ہے جیسے امریکہ کے ریڈ انڈین یہ خیال کریں کہ وہ اپنے علوم کے ذریعے اپنے حکمرانوں پر فوقیت پالیں گے۔ (۲۰) قومی ترقی اسی میں ممکن ہے کہ فتح مند قوم کے علوم سیکھے جائیں۔ اگر ان کے اور ہمارے علوم جدا رہے تو دوستی کیسے ہوگی؟ (۲۱) وہ حکومت کی اس پالیسی کو سراہتے ہیں کہ: "تمام اعلیٰ عہدے بجز جیسا کہ لائق انگریزی دانوں کے کسی کو نہ دیئے جائیں" (۲۲) انہوں نے لارڈ میکالے کی اس اسکیم کو پسند کیا کہ اس نے ہندوستانیوں کے لئے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کو ملازمت کے لئے لازمی قرار دیا۔

> "ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے اس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو ڈھلوایا تھا"

وہ بڑی سچائی کے ساتھ اس کے قائل تھے کہ "ہمارے ملک کو اگر در حقیقت ترقی کرنی ہے اور فی الواقع ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کا سچا خیر خواہ اور وفادار رعیت بننا ہے تو اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں کہ وہ مغربی علوم اور مغربی زبان میں اعلیٰ درجے کی ترقی حاصل

کرے" (۲۴)

تعلیمی میدان میں بھی سرسید کا دائرہ صرف امراء اور روساء اور شرفاء، زمینداروں اور جاگیرداروں کے طبقے تک محدود تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حسب سابق یہ طبقہ حکمران جماعت میں شامل ہو جائے اور انہی مراعات کو پھر سے حاصل کرلے۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کا مقصد یہی تھا کہ اس کے ذریعے وہ اعلیٰ عہدے حاصل کرسکیں اور حکمران طبقے سے اپنے روابط بڑھا سکیں سرسید اور ان کے لڑکے سید محمود نے جو تعلیمی اسکیم تیار کی اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) امراء کے لڑکوں کے لئے کالج کی تجویز جس کے ذریعے وہ مغربی علوم حاصل کرکے حکومت کے اعلیٰ عہدے حاصل کرسکیں یہ کالج آکسفورڈ اور کیمرج کی طرز پر بنایا جائے۔

(۲) ہر شہر اور قصبے میں مدارس کھولے جائیں جو کالج کے لئے طالب علموں کو تیار کریں۔

(۳) ہر گاؤں میں مکاتب کھولے جائیں جن میں مذہبی تعلیم کا بندوبست ہو اور کسی قدر فارسی و انگریزی پڑھائی جائے۔

(۴) حفظ قرآن کے مکاتب۔ (۲۵)

اس اسکیم سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سرسید تعلیم کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اعلیٰ مغربی تعلیم صرف امراء کے لڑکوں کے لئے ضروری سمجھتے تھے جبکہ عوام کو وہ صرف مذہبی تعلیم میں الجھائے رکھنا چاہتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے ایک اجلاس میں اعلیٰ تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

> "تعلیم دو قسم کی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی جو ایک محدود گروہ کو نصیب ہوگی دوسری عام تعلیم جس سے عوام اور غرباء بھی فائدہ اٹھا سکیں گے بالعموم مسلمان پچھلی قسم کی تعلیم کے خواہش مند ہیں مگر اس سے قوم آسمان کے تاروں کی طرح بلند نہیں ہوگی۔" (۲۶)

سرسید نے عوامی اور سستے اسکولوں کی مخالفت کی اور ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا معیار یہ تھا کہ وہاں استاد اور پرنسپل یورپین ہو اگر کوئی اسکول مقامی استادوں کے ذریعے تعلیم دلانا چاہتا ہے تو اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اس سلسلے میں ایک جگہ افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔:

" افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہی پرانے خیالات ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے لوگوں سے بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مردوں کی فاتحہ کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں افسوس کہ ان کو تعلیم کی ابھی قدر نہیں" (۲۷)

اساتذہ کی تنخواہوں کے بارے میں کہتے ہیں :

" تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ٹیچر اور پروفیسر کیا تعلیم دے سکتے ہیں انہوں نے کبھی چار روپیہ سے زیادہ تنخواہ کا میانجی دیکھا ہی نہیں بلا شبہ ایک میانجی کو پانچ سو اور سات سو روپیہ ملنا ان کو متعجب کرتا ہوگا۔ اگر ہمارے بعد مدرستہ العلوم کلیہ حال ہوتا ہے کہ جس کی دور اندیشی ہمارے دوست کرتے ہیں تو ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ مدرستہ العلوم کا یہ حال ہو ایک شدید بھونچال آوے اور ہمارا پیارا مدرستہ العلوم زمین میں دھنس جاوے آمین" (۲۸)

سرسید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت خود ان کے زمانے میں ہوئی کیونکہ ایک طبقہ چاہتا تھا کہ صرف امراء اور جاگیرداروں کے بچے ہی نہیں بلکہ عام مسلمان بھی تعلیم حاصل کریں اگر امراء کو ان کی دولت کی وجہ سے قیمتی اور بہترین تعلیم مل سکتی ہے تو کم از کم غریب عوام کو ان کی استطاعت کے مطابق ہی کچھ تعلیم مل جائے۔ اس لئے سرسید پر تنقید کرتے ہوئے ان کے ایک دوست نثار حسین نے کہا کہ ایک طرف تو سرسید چھوٹے اسکول قائم کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں تو دوسری طرف غریب مسلمانوں کے لئے محمڈن کالج کی بیش بہا تعلیم کے لئے جیب میں پیسہ نہیں۔

سرسید اس خیال کے حامی تھے کہ پہلے ملک میں اعلیٰ تعلیم پھیلے اس کے بعد ادنیٰ تعلیم خود بخود پھیل جائے گی۔ کیونکہ قدرت کا یہ قاعدہ ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کی پیروی کرتا ہے کبھی اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی نہیں کرتا اس لئے قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ادنیٰ درجے کی تعلیم غریبوں میں خود بخود پھیل جائے گی۔(۲۹) ۱۸۹۴ء میں تھیوڈور مارسن ' پرنسپل علی گڑھ کالج' محسن الملک اور سرسید کی کوششوں سے مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں یہ ریزولوشن پاس ہوا کہ ادنیٰ اسکول نہ کھولے جائیں۔ بقول مولوی طفیل منم وری کے اس سے مسلمانوں میں جو جگہ جگہ اسکول کھولنے کا شوق پیدا ہوا تھا وہ ختم ہوگیا۔ (۳۰)

سرسید کے اس ریزولوشن کے دو مقاصد تھے: اول یہ کہ اگر جگہ جگہ چھوٹے اسکول کھل گئے تو اس کی وجہ سے مدرستہ العلوم کو چندہ نہیں ملے گا کیونکہ مسلمان اپنے علاقے کے سکول کو چندہ دیں گے دوسرے اس سے تعلیم عام ہوگی سرسید صرف علی گڑھ کو اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور اسے آکسفورڈ کیمرج کی طرز پر ڈھال کر وہاں مفاہمت کی فضا میں تعلیم دینا چاہتے تھے اس مقصد کے لئے سرسید نے مدرستہ العلوم کے لئے جو قوانین بنائے وہ یہ تھے:

طالب علم ہاسٹلوں میں رہیں گے ان کے کام کے لئے ملازم ہوں گے انہیں گھڑ سواری اور کرکٹ سکھائی جائے گی اور ان کی تعلیم کے لئے یورپی اساتذہ کی تقرری پر انہوں نے اس لئے زور دیا کہ ایک ایسے ادارے میں جہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد تعلیم پائے ان کی نگرانی کے لئے یورپی اساتذہ کا ہونا ضروری تھا تاکہ حکومت کو اس ادارے کی جانب سے اطمینان رہے۔ (۳۱) ان کی وجہ سے حکام اس کالج کے بارے میں اچھے خیالات رکھتے تھے اور اس وجہ سے نواب، زمینداروں اور جاگیردار اپنے لڑکوں کو اس کالج میں تعلیم کے لئے بھیجتے تھے کہ یہ کالج حکومت کی نگاہوں میں مشتبہ نہیں تھا یہاں کے طالب علموں کو آسانی سے حکومت کی ملازمتیں بھی مل جاتی تھیں۔ (۳۲) اس کے علاوہ کالج میں انگریز افسروں اور عہدے داروں کو وقتاً فوقتاً بلایا جاتا تھا، اس سے جلسوں کی صدارت کرائی جاتی تھی اور ان کے ذریعے طلباء میں انعامات تقسیم کرائے جاتے تھے۔ تاکہ اس کے ذریعے سے طلباء کے دلوں میں ان کا احترام پیدا ہو۔ ضلع کے انگریز حکام اور ان کی بیگمات کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں اس کے علاوہ یہ کھیلوں میں شریک ہوتے اور ڈنر میں شرکت کرتے، اسی طرح سے دونوں طبقوں میں میل جول بڑھا۔ (۳۳)

تعلیم کے سلسلے میں سرسید صرف اس تعلیم کے حامی تھے جو طالب علموں کو اعلیٰ انتظامی عہدوں کے لئے تیار کرے۔ ان کے ذہن میں اس سے زیادہ تعلیم کا اور کوئی مقصد نہیں تھا اس لئے انہوں نے سائنس کی مخالفت کی کیونکہ اس سے اعلیٰ تربیت اور شائستگی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح صنعتی و فنی تعلیم کے بارے میں بھی ان کی جاگیردارانہ ذہنیت آڑے آئی جس کو وہ امراء کے لڑکوں کے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ (۳۴)

انہوں نے تعلیم نسواں کی بھی مخالفت کی، ان کی دلیل یہ تھی کہ امراء اور رؤساء کے لڑکے نالائق ہوتے ہیں اس لئے پہلے انہیں مہذب بنایا جائے۔ کیونکہ جاہل عورت اپنے حقوق سے ناواقف ہوتی ہے اس لئے وہ مطمئن رہتی ہے اگر وہ تعلیم یافتہ ہوکر اپنے حقوق

سے واقف ہو گئی تو اس کی زندگی عذاب ہو جائے گی۔ (۳۵)

"میری خواہش نہیں کہ تم مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں' اس زمانے کی نامروجہ اور نامبارک کتابوں کو پڑھنا اختیار کرو۔" (۳۶) انہوں نے حکومت کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی جو لڑکیوں کے اسکول کھولنے کے سلسلے میں تھی' یہاں تک کہ جب مولوی ممتاز علی نے خواتین کا اخبار نکالنا چاہا تو سر سید نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ (۳۷)

سرسید نے جس مقصد کے لئے علی گڑھ کھولا تھا اس کے وہی نتائج نکلے: جن مسلمانوں نے اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کی انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے ملے اور انہوں نے مغربی طرز معاشرت کو اختیار کیا اور اپنا رشتہ عوام سے کاٹ کر اپنے مفادات کو حکومت سے وابستہ کیا۔ اس کے نتیجے میں نوکر شاہی کا طبقہ وجود میں آیا' جس کا کام حکومت کی خوشامد اور چاپلوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کا یہ تعلیم یافتہ طبقہ جب عوام سے علیحدہ ہو کر حکومت کے ہاتھوں میں چلا گیا تو اس نے ترقی اور انقلاب کی راہوں کو مسدود کر دیا۔

ایک طرف تو مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے نتائج پیدا ہو رہے تھے تو دوسری جانب بنگال' بمبئی اور پونا کے ہندو' پارسی مرہٹے اور برہمن اعلیٰ تعلیم اور مغربی خیالات سے واقف ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں زبردست تبدیلیاں لا رہے تھے مغربی علوم نے ان میں قومیت کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا اور وہ انگریزی سامراجیت اور اس کے استحصالی نظام سے بخوبی واقف ہو رہے تھے۔ جمہوری اقدار اور آزادی رائے کے تصور نے ان میں سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ تمام ہندوستان کو متحد کر کے غیر ملکی سامراج سے اپنے حقوق کی جنگ کریں۔

سرسید نے تعلیم کے ان نتائج پر پریشانی کا اظہار کیا' انہیں ڈر تھا کہ اگر یہ خیالات مسلمان تعلیم یافتہ طبقے میں سرایت کر جائیں گے تو ان کی مفاہمت کی پالیسی کمزور ہو کر دم توڑ دے گی۔ اس لئے انہوں نے اس کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔۔(۳۸) اور حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ اعلیٰ تعلیم کے مضر اثرات نکل رہے ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ حکومت پر بے جا تنقید کر رہا ہے اس لئے حکومت کو چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کو اور محدود کر دے تاکہ یہ جو مضر اثرات پیدا ہو رہے ہیں ختم ہو جائیں۔ (۳۹)

سرسید تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم یافتہ طبقے کو نہ تو سیاست میں حصہ لینا چاہئے اور نہ ہی حکومت کے خلاف کسی تحریک کا

ساتھ دینا چاہئے ہندوؤں میں جو سیاسی بیداری ہوئی وہ اسے غلط تربیت کا نتیجہ قرار دیتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طلبہ ان مضر اثرات سے دور رہے اور ہر حالت میں انہوں نے حکومت سے اپنی وفاداری کو قائم و باقی رکھا۔ (۴۰)

سیاست اور مفاہمت

سیاست میں بھی سر سید مفاہمت کے حامی تھے اور ہر وہ تحریک جس سے حکومت کو بد گمانی ہو یا جو حکومت کے خلاف ہو وہ اس سے بیزار تھے وہ مسلمان جاگیزدار طبقے کو حکومت کی ہر مخالفت اور ایجی ٹیشن ہے دور رکھنا چاہتے تھے ان کے ذہن میں ۱۸۵۷ء کی یادیں پوری طرح سے موجود تھیں اور وہ زمانے کی تبدیلیوں کے باوجود ان تباہ کاریوں کو نہیں بھولے تھے ان کے نزدیک غدر نے مسلمانوں کی ترقی کو روک دیا تھا اور اسی کے بعد سے حکومت ان سے بد گمان ہوئی اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو سینکڑوں مسلمان جوان فوج میں کپتان' کرنل اور جرنیل ہوتے اور اسلحہ ایکٹ کبھی وجود میں نہ آتا۔ (۴۱)

ہندوستان میں جب آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو سر سید نے ان تمام تحریکوں کی پرزور مخالفت کی "بنگال نیشنل لیگ" نے جب "ستارہ مشرق" نامی رسالہ چھپوایا اور اس میں انگریزی حکومت کی نا انصافیوں کی طرف توجہ دلائی تو اس پر سر سید نے سخت اعتراض کیا کہ گورنمنٹ کے نظام کی اس طرح سے برائی کرنے سے جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ (۴۲)

انہی وجوہات کی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس تحریک سے علیحدہ رہیں کیونکہ اس تحریک میں شامل ہونے سے ان سے حکومت بد گمان ہوجائے گی۔ کانگریس کی مخالفت میں انہوں نے ۱۸۸۸ء "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اور انگلستان کے لوگوں کو اس بات سے مطلع کیا جاتا رہے کہ تمام ہندوستان کی قومیں خصوصیت سے جاگیردار اور والیان جاگیران کے ساتھ ہیں بنگال ' بہار ' مدراس' بمبئی ممالک متوسط اور اضلاع شمال مغرب اودھ' پنجاب میں اسلامی انجمنوں نے کانگریس کے خلاف جلسے کئے اور ان کا ساتھ تعلق داراں اودھ مہاراجہ بنارس نظام حیدر آباد اور دیگر ریاستوں کے سربراہوں نے دیا۔ (۴۳) حالی نے سرسید کی کانگریس مخالفت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ : تقریباً" کل تعلق داروں ' جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام طور سے کہ ہندوؤں یا مسلمان ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ (۴۴)

سر سید نے کانگریس کے ان مطالبات کی بھی مخالفت کی جس سے ہندوستان کے نچلے طبقے کو فائدہ پہنچتا مثلاً" کانگریس نے ایک مطالبہ یہ کیا کہ سول سروس کے امتحان انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہوں میں ہوا کریں کیونکہ اگر امتحان صرف انگلستان میں ہونگے تو ہندوستانی ان میں شرکت نہیں کر سکیں گے اور اگر کسی نے کی بھی تو چند دولت مند اور امراء کے لڑکے جو سفر کے اخراجات برداشت کر سکیں گے سر سید نے اس مطالبے کی صرف اس لئے مخالفت کی کہ وہ اس کے حق میں تھے کہ صرف اعلیٰ ذات کے لڑکوں کو یہ مراعات ملنی چاہئیں کہ وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں اگر ادنیٰ درجے کے لوگ ان عہدوں پر فائز ہوگئے تو ہندوستان کا نظام اس سے متاثر ہوگا اس لئے یہ امتحان صرف انگلستان میں ہوں تاکہ ہندوستان کا حکمران طبقہ یا تو انگریزوں پر مشتمل ہو یا دولت مند ہندوستانیوں پر۔ انہیں ڈر تھا کہ بنگالی جو تعلیم میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں وہ تمام انتظامی عہدے لے جائیں گے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

" یہ امر آپ پر ظاہر ہے کہ ولایت میں ہر شخص اعلیٰ و ادنیٰ ڈیوک اور ارل یا کسی جنٹل مین و شریف کا بیٹا برابر ہے امتحان دے سکتا ہے اور جو یورپین ولایت سے کمیشن کا امتحان دے کر آتے ہیں ادنیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں آپ سب صاحبان یقین کرتے ہوں گے اور میں کہتا ہوں کہ یقین کرتے ہوں گے کہ جو ادنیٰ خاندان کے لوگ ہیں وہ ملک یا گورنمنٹ کے لئے مفید نہیں اور اعلیٰ خاندان والے رئیسوں کی عزت کرتے ہیں اور انگلش قوم کی عزت اور برٹش گورنمنٹ کے انصاف کا نقش لوگوں کے دلوں پر بٹھاتے ہیں اور ملک و گورنمنٹ کے لئے مفید ہیں لیکن انگلستان سے جو آتے ہیں وہ ہماری آنکھوں سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ لارڈ کے بیٹے ہیں یا ڈیوک یا ایک درزی کے ..... اور اس سبب سے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ آدمی حکومت کرتا ہے ہماری آنکھوں سے چھپا رہتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ نہیں ہے ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں اپنی جان و مال پر وہ حاکم ہونا پسند نہیں کریں گے۔ (۴۵)

اس موضوع پر مزید وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ ہندوستان میں کوئی ایک قوم نہیں رہتی بلکہ مختلف اقوام ہیں اس لئے ان میں تعصبات اور اختلافات بھی ہیں اور یہ قومیں اعتبار

لیاقت اور تعلیم ایک نہیں اس لئے :

" اگر یہ امتحان کا مقابلہ جاری ہو تو غور کرنا چاہئے کہ ملک کا نتیجہ کیا ہوگا تمام قومیں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اس ملک کے معزز راجہ اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلواریں یاد ہیں ایک بنگالی (کو) جو چھری دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑے گا (چیرز) اپنے پر حاکم دیکھیں گے؟ ...... کیا آپ کے نزدیک راجپوت اور پرجوش پٹھان جو پھانسی یا پولیس کی تلوار یا فوج کی سنگین سے نہیں ڈرتے وہ ایک بنگالی کے نیچے امن سے رہ سکیں گے (چیرز) پس مقابلے کا امتحان ملک کی کسی خاص قوم کے لئے مضر ہے بلکہ امن کے لئے بھی مضر ہے ...... پس اگر کسی شخص شریف کو' رئیس کو' اوسط درجہ کے آدمی کو' اچھے خاندان والوں کو' جس کو خدا نے عزت دی ہے اگر اس کو قبول کرے کہ بنگالیوں کی حکومت سے' جوتیاں کھائے' تو بسم اللہ ..... (۴۶)

سرسید نے نمائندہ حکومت کی بھی مخالفت کی۔ کیونکہ جمہوری طرز حکومت میں ادنیٰ لوگ سیاست میں داخل ہوکر بااقتدار ہوجائیں گے اور امراء و شرفا ذلیل و خوار ہوجائیں گے لیجلسو کونسل کی ممبری اس لئے لیاقت پر نہیں بلکہ سماجی مرتبہ کی بناپر روساء کو دینی چاہئے۔ اس موضوع پر وہ کہتے ہیں کہ :

"کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ سے نے بے۔اے۔ کی ڈگری لی ہو یا ایم۔اے۔ کی اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال' جائیداد اور عزت پر حاکم ہو؟ .... گورنمنٹ کی' کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور وائسرے اس کو "مائی کلیگ" یا "مائی آنر ایبل کلیگ" یعنی برادر یا معزز صاحب کہہ سکتا ہے" (۴۷)

سرسید سیاست میں امراء اور روساء کی شرکت صرف اس حد تک ضروری سمجھتے تھے کہ جہاں تک حکومت کی مخالفت نہ ہو' بلکہ اس کے ذریعہ حکومت سے مفاہمت ہوسکے۔

○

حوالہ جات

(۱) خطبات سرسید: حصہ اول ۔ لاہور ۱۹۷۲ء ص ۳۴۶

(۲) مقالات سرسید: حصہ پنجم ۔ لاہور ۱۹۶۲ ص۔ ۹۷

(۳) الطاف حسین حالی: حیات جاوید۔ لاہور ۱۹۴۶ء ص۔ ۳۲

(۴) ایضاً ص۔ ۴۳

(۵) ایضاً ص۔ ۲۳۲۔۲۳۳

(۶) خطبات سرسید: حصہ اول۔ ص۔ ۲۲۴۔۲۲۵

(۷) مکتوبات سرسید: لاہور ۱۹۵۹ء ۔ ص۔ ۱۸۸

(۸) مقالات سرسید: حصہ دوم ۔ لاہور ۱۹۶۱ء ص۔ ۵۱

(۹) مقالات سرسید: حصہ نہم۔ لاہور ۱۹۶۲ء ۔ ص۔ ۱۹۔۲۰

(۱۰) حیات جاوید: ص۔ ۱۲۶

(۱۱) ایضاً ص۔ ۱۹۹

(۱۲) مکتوبات سرسید: ص۔ ۲۱

(۱۳) حیات جاوید: ص۔ ۴۶۷

(۱۴) ایضاً ص۔ ۲۰۹

(۱۵) ایضاً ص۔ ۴۵۴

(۱۶) ایضاً ص۔ ۴۵۶

(۱۷) مقالات سرسید: حصہ دہم ۔ لاہور ۱۹۶۲ء۔ ص۔ ۲۳۰

(۱۸) مقالات سرسید: حصہ نہم ۔ ص۔ ۵

(۱۹) حیات جاوید: ص۔ ۱۴۳

(۲۰) ایضاً ص۔ ۴۲۶

(۲۱) مقالات سرسید: حصہ ششم ۔ لاہور ۱۹۶۲ء ۔ ص۔ ۳۵۔ ۳۷

(۲۲) ایضاً ص۔ ۴۴
(۲۳) حیات جاوید: ص۔ ۳۹۳
(۲۴) مقالات سرسید: حصہ ششم۔ ص۔ ۴۸
(۲۵) مولوی طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل - چوتھا ایڈیشن۔ دہلی ۱۹۴۶ء ص۔ ۲۰۳
(۲۶) خطبات سرسید: حصہ دوم۔ لاہور ۱۹۷۳ء ص۔ ۴۹۱
(۲۷) مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص۔ ۲۳۰
(۲۸) ایضاً ص۔ ۲۳
(۲۹) خطبات سرسید: حصہ اول - ص۔ ۸۹۳
(۳۰) مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص۔ ۲۳۱۔۲۳۲
(۳۱) حیات جاوید: ص۔ ۴۵۳
(۳۲) ایضاً ص۔ ۴۵۳
(۳۳) خطبات سرسید: حصہ دوم - ص۔ ۱۳۸۔۱۳۹
(۳۴) مقالات سرسید: حصہ دہم - ص۔ ۶
(۳۵) مکتوبات سرسید: ص۔ ۳۸۱
(۳۶) حیات جاوید: ص۔ ۴۹۶
(۳۷) مکتوبات سرسید: ص۔ ۳۸۲
(۳۸) مقالات سرسید: حصہ نہم - ص۔ ۱۵۔۱۸
(۳۹) مقالات سرسید: حصہ پانزدہم۔ لاہور ۱۹۶۲ء ص۔ ۲۶۳
(۴۰) مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص ۲۸۲
(۴۱) حیات جاوید: ص۔ ۳۱۴
(۴۲) ایضاً ص۔ ۳۱۲
(۴۳) ایضاً ص۔ ۳۱۸۔۳۱۹
(۴۴) ایضاً ص۔ ۳۱۸
(۴۵) خطبات سرسید: حصہ دوم۔ ص۔ ۱۲۔۱۳
(۴۶) ایضاً ص۔ ۱۴۔۱۵
(۴۷) ایضاً ص۔ ۶

فکر اقبال کی بنیادیں

اقبال کی شاعری نے ہمارے معاشرے پر گہرے اثرات ڈالے۔ ان کی شاعری ایک ایسے دور میں تخلیق ہوئی کہ جب ہندوستان میں مسلمان معاشرہ مغل زوال کے بعد برطانوی اقتدار تک محرومی مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہو کر پژمردہ ہو رہا تھا ایک ایسا معاشرہ جس میں حقیقت فہمی اور خود اعتمادی مفقود تھی' ایک ایسا معاشرہ صرف وہی باتیں سننا چاہتا تھا جو اسے حقیقتوں سے دور خوابوں کی دنیا میں لے جائیں اور وہ اپنی محرومیوں کو فراموش کر کے یوٹوپیائی تصورات میں مدہوش ہو جائے اقبال کی شاعری نے مسلمان معاشرے کی ان خواہشات کو پورا کیا اسی لئے ان کی شاعری نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔

اس مختصر سے مطالعے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان بنیادی افکار کا تجزیہ کیا جائے' جن کی اساس اور بنیاد پر انہوں نے اپنے نظریات کی تشکیل کی۔

ماضی کی عظمت

اقبال کی شاعری میں مسلمانوں کی سابقہ عظمت و بڑائی اور شان و شوکت کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ ملتا ہے' انہوں نے ماضی کی عظمت کا جو نظریہ پیش کیا اس کی جڑیں ہندوستانی معاشرے میں پہلے سے موجود تھیں۔

تاریخ کی یہ روایت رہی ہے کہ جب کوئی قوم سیاسی طور پر طاقت ور ہوتی ہے تو وہ طاقت اور اقتدار کے نشے میں دوسری قوموں کو ذلیل سمجھتی ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت و روایات کو برتر و افضل گردانتی ہے اس کی مثال ہندوستان میں عہد مغلیہ سے دی جا سکتی ہے بابر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک جو سیاسی عروج کا زمانہ تھا' مسلمان حکمران طبقہ طاقت و قوت کے ذریعے ہندوستان پر حکومت کرتا رہا لیکن جب زوال کا عمل شروع ہوا اور اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگا تو اس وقت انہیں بابر' اکبر اورنگ زیب کا زمانہ یاد آنے لگا۔ ماضی کی شاندار روایات سے یہ لگاؤ اور محبت حکمران طبقے میں زیادہ ہوتی ہے۔

کیونکہ یہی طبقہ عروج کے زمانے میں سب سے زیادہ مراعات حاصل کرتا ہے اور زوال کے زمانے میں اسی طبقے کی مراعات سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

اس لئے ماضی کی عظمت کا احساس' اس کے تذکرے اور اس پر فخر کرنا' زوال کے دور کی پیداوار ہوتی جب معاشرہ زوال کے عمل سے متاثر ہوکر فرار چاہتا ہے تو اس وقت وہ ماضی کی یادوں میں پناہ لیتا ہے۔

ہندوستان میں جب برطانوی اقتدار قائم ہوا اور مسلمان حکمران طبقے کو مکمل شکست ہوگئی' تو احساس شکست نے انہیں زبردست احساس کمتری میں مبتلا کردیا کیونکہ نہ تو وہ برطانوی طاقت کا عسکری لحاظ سے کوئی مقابلہ کرسکے اور نہ ہی ان کی تہذیبی اور ثقافتی روایات و اقدار اور ادارے ان کے آگے ٹھہر سکے۔ یہ ایک ایسی شکست و پسپائی تھی جس نے منجمد معاشرے کا ہلا کر رکھ دیا اس لئے اس کا رد عمل کئی شکلوں میں ظاہر ہوا: اول عملی زندگی سے فرار اور مذہب و تصوف میں پناہ' دوم برطانوی اقتدار کی مخالفت اور مزاحمت کی ہمت نہ ہونے کے سبب اس کی ہر چیز سے نفرت' اور اپنے ماضی کی روایات پر فخر۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت ماضی کی عظمت کو اجاگر کرنے اور شاندار روایات کی یادیں تازہ کرنے کے لئے تاریخ کی مدد لی گئی اس تحریک کے سب سے فعال رکن شبلی نعمانی تھے' جنہوں نے "ہیروز آف اسلام" پر تاریخی کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جس میں بادشاہوں' علماء اور فقہا کی سوانح حیات لکھنے کا منصوبہ تھا ان میں سے کچھ کتابیں شائع بھی ہوئیں جیسے الفاروق' المامون' اور النعمان وغیرہ۔ مسلمان تعلیم یافتہ طبقے نے ان کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔

اس تحریک کو عوامی حیثیت سے مقبول بنانے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے جنہوں نے تاریخی ناول لکھ کر ان میں مسلمانوں کی عظمت اور برتری کو پیش کیا ان کے یہ ناول بہت جلد عوامی سطح پر پہنچ گئے اور تعلیم یافتہ طبقے اور عوام دونوں میں یکساں مقبول ہوئے کیونکہ ایک شکست خوردہ معاشرہ اس وقت ایسی تحریریں پڑھنا چاہتا تھا جس میں مسلمانوں کی فتوحات ہوں دشمن تذلیل و شکست ہو اور مسلمانوں کی کامیابی ہو چنانچہ اس دور میں اسلامی تاریخی ناولوں اور اسلامی تاریخ کی شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر ایک وسیع ادب تخلیق ہوا جس نے مقبولیت کا درجہ حاصل کیا۔

ماضی کی عظمت کی یہی روایات تھیں جنہیں اقبال نے بھی اپنی شاعری میں استعمال کیا ان کے ہاں بھی "یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے" والی گھن گرج اور احساس فخر ہے وہ

اس بات پر جذبات کو ابھارتے ہیں کہ " دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے" مسلمانوں کی فتوحات ان کی بہادری و شجاعت اور ان کے شاندار کارناموں کی تفصیلات بڑے جذباتی اور موثر انداز میں ان کے ہاں ملتی ہیں۔

اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ یہ آواز ایک ایسی قوم اور معاشرے کی آواز تھی جو شکست خوردہ' زوال پذیر بے جان اور بے حس تھا اور جسے ایک دوسری قوم نے اپنے استحصال اور استحصال کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا اس وقت برطانیہ کی سیاسی طاقت پورے عروج پر تھی ایشیا اور افریقہ اور امریکہ میں ان کی حکومت قائم تھی اس وقت ان کے ہاں بھی ادیبوں' شاعروں اور مورخوں کا ایک طبقہ برطانوی سامراجیت اور استعمار پر نازاں " سفید آدمی کا بوجھ" کے نظریے کی تبلیغ کر رہا تھا۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کیوں اپنی سامراجیت پر تو نازاں تھے اور برطانوی استعمار کے خلاف؟ وہ مسلمانوں کی فتوحات کو تو وہ جائز سمجھتے تھے اور برطانوی فتوحات کو لائق تنقید کسی بھی قوم کا دوسرے ملکوں پر قبضہ کرکے' اس کی زمینوں اور ذرائع پیداوار پر قبضہ کرنا انصاف کے خلاف ہے چاہے ہسپانیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو یا نائیجیریا پر برطانیہ کا ہمارے دانش ور اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے اور اسی لئے مسلمان بادشاہوں کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیلات اور ان کی شاندار کامیابیوں کے ذریعے ایک زوال پذیر معاشرے کے لوگوں کے جذبات مشتعل کرتے رہے۔

ماضی کی عظمت اور شان شوکت کے تذکروں کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے معاشرے میں جھوٹی انا اور بے جا فخر کے احساسات پیدا ہوئے اقبال کی شاعری نے ان احساسات کو پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا"تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں" یا "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" وہ خیالات اور نظریات ہیں جنہوں نے بے جا فخر و غرور کے احساسات کو ابھارا۔

اقبال یہ باتیں اس وقت کر رہے تھے جبکہ دنیا اسلام اور مسلمان انتہائی کسمپرسی اور ذلت کے عالم میں تھے اکثر اسلامی ممالک یورپی نو آبادیاتی نظام کے تحت تھے اور قدیم فرسودہ روایات کے زیر اثر جہالت اور ناواقفیت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ انہیں ماضی کے اندھیروں سے اور پژمردہ روایات سے نکال کر جدید دنیا اور جدید روایات و اقدار سے روشناس کرایا جاتا تاکہ وہ اعلیٰ ذہنی شعور کے ساتھ سامراج کا مقابلہ کرتے لیکن اقبال کے ہاں تو ضرب کلیم کے صفحہ اول پر درج ہے کہ " دور حاضر کے خلاف

اعلان جنگ" نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا معاشرہ ماضی کی عظمت میں گم رہا اور اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کی کوششیں بہت کم ہوئیں۔

مغرب کی مخالفت

ہندوستان یا عالم اسلام کے مسلمانوں میں شعور پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں جدید مغربی تہذیب سے روشناس کرایا جاتا اور مغرب میں جو سیاسی و معاشی و سماجی تبدیلیاں آرہی ہیں ان سے واقف کرایا جاتا۔ یورپ میں بادشاہت کے نظام کے خلاف جو جمہوری تحریکوں کو کامیابی ہوئی تھی اصلاح تحریک مذہب نے جو عیسائی مذہب پر کاری ضرب لگا کر جدید روایات کی تخلیق کی تھی' صنعتی انقلاب نے یورپ کو فنی و تکنیکی میدان میں آگے بڑھا کر ان کی معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کیا تھا۔ سوشل ازم علبرل ازم کی تحریکوں نے جو سماجی و معاشی تبدیلیاں پیدا کیں تھیں' یورپ کی اس ترقی سے واقفیت جدید دنیا کے انسان کے لئے ضروری تھیں۔

یورپی اقوام نے جب ایشیا و افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کیا تو اس شکست کے نتیجے میں ان ملکوں کے عوام میں دو طرح کا رد عمل ہوا : اول مغربی تہذیب اور اس کی روایات سے نفرت' دوم آزادی اور ترقی کے لئے مغربی تہذیب اور اس کے ارادوں کو اختیار کرنے کی کوشش۔ چونکہ مغرب سے نفرت وہ حربہ تھا جسے استعمال کرکے آزادی کے بعد ہمارا حکمران طبقہ' اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نظریے کی تبلیغ زور شور سے کی گئی۔

مغربی تہذیب کی مخالفت میں جو پر زور دلیل دی گئی وہ یہ تھی کہ اگرچہ مغرب نے سائنس' صنعت و حرفت اور فنی علوم میں زبردست ترقی کی مگر روحانیت میں وہ مشرق سے پیچھے ہے ہندو بھی اس بات کو کہتے رہے کہ ہندو مذہب نے روحانیت میں بڑا مقام حاصل کیا اور فلسفیانی تصوف میں انہوں نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ چینیوں کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ انسان کے بنیادی مسائل کا حل وہ سمجھتے ہیں۔ مشرق میں عام طور سے یہ تاثر دیا گیا کہ مغربی علوم و فنون صرف عملی حل کے لئے ہیں اور ان سے انسان کو آسودگی نہیں ملتی ہے۔

مسلمانوں کو بھی اس بات کا اصرار تھا(اور اب بھی ہے) کہ صرف ان کے مذہب و روایات اور اقدار میں انسان کو سکون ملے گا ان کے نزدیک مغربی تہذیب انسان کو مادیت کی جانب لے جارہی ہے اور مغرب کی یہ ترقی' دولت کی فراوانی' فنی مہارت اور سائنس کی ترقی کے باوجود مغرب کا انسان روحانی سکون کی تلاش میں ہے یہ روحانی سکون اسے صرف مذہب

میں ملے گا۔

یہی بات اقبال بھی کہتے رہے اور اس بات پر افسوس کرتے رہے کہ اگر مجذوب فرنگی (نشیتسے) ان کے زمانے میں ہوتا تو وہ اسے مقام کبریا کے بارے میں بتاتے۔ مغرب کی سائنس اور صنعتی ترقی کو مغرب کے لئے موت کا باعث سمجھتے رہے اور اسی لئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ: "تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرلے گی۔"

نو آبادیاتی نظام میں اس نظریہ کو بڑا فروغ ملا' کیونکہ یہ مغربی اقوام کے مفاد میں تھا کہ مشرقی اقوام اپنے روحانی درجے بلند کرتی رہیں اور وہ ذرائع پیداوار اور انتظامی اداروں پر قابض ان پر حکومت کرتے رہیں۔

مغرب کی اس مخالفت میں ہماری شکست خوردہ ذہنیت اور احساس کمتری کا بھی بڑا دخل ہے۔ جب ہم ذہنی طور پر خود کو مغرب کا اسیر پاتے ہیں اور مغرب کے مقابلے میں بے دست و پا اور لاچار ہوجاتے ہیں تو اس دلیل سے خوشی و مسرت ملتی ہے کہ مغرب کی یہ ترقی صرف مادی ہے اور وہ روحانیت میں ہم سے بہت پیچھے ہے ظاہر ہے یہ دلیل تیسری دنیا کے پس ماندہ ' غریب و جاہل عوام کو مطمئین کردیتی ہے۔ چنانچہ تیسری دنیا کا حکمران طبقہ اپنے عوام کی روحانی زندگی کو بہتر بنانے کی خاطر' انہیں موجودہ دنیا کی مادی آسائشوں سے محروم رکھتا ہے کلام اقبال عوام کو ذہنی طور پر مطمئین رکھنے اور مغرب کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنے میں بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔

جمہوریت کی مخالفت

مغرب کی ترقی میں جمہوریت کا بڑا حصہ ہے' جس نے بادشاہت کے قدیم نظام اور اس کے استبدادی اداروں کو ختم کرکے اقتدار میں دوسرے طبقوں کو شریک کیا۔ مغربی جمہوریت نے ارتقائی طور پر ترقی کی۔ ابتداء میں جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا مگر آہستہ آہستہ اس میں عوام کا اثر آتا گیا۔ خصوصیت سے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یورپ میں بالغ رائے دہی کے اصول پر جمہوریت قائم ہوئی۔

ہندوستان میں جب برطانوی اقتدار قائم ہوا تو ہندوستان نے ترقی کی جانب قدم بڑھایا۔ برطانوی حکومت نے جدید روایات و اقدار کی بنیادوں پر سیاسی و انتظامی ادارے قائم کئے' مغربی تعلیم اور افکار کے نتیجے میں ہندوستان میں تحریک آزادی پروان چڑھی اس لئے تحریک آزادی کے قائدین کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ یہاں سے برطانوی اقتدار ختم ہو اور

برطانوی طرز کی جمہوری حکومت قائم ہو۔ جمہوریت کے تصور نے ہندوستان کے زمیندار اور جاگیر دار طبقے کو بری طرح سے ڈرایا کیونکہ یہ طبقہ مراعات یافتہ تھا اور اپنی نسلی اور خاندانی برتری کا قائل تھا۔ خصوصیت سے مسلمان جاگیر دار طبقے جنہیں اپنے بخاری و خراسانی اور ایرانی ہونے پر فخر تھا یہ خواص عوام کے فرق کے قائل تھے۔ مساوات کا سماجی و معاشی و سیاسی تصور ان کے لئے قطعی قابل قبول نہ تھا اس لئے جمہوریت جس میں ترقی کا معیار خاندان کی بجائے قابلیت پر ہو اور جس میں قانون کا استعمال امیر و غریب سب کے لئے ایک ہو' انہیں منظور نہ تھا۔

اس لئے جمہوریت اور جمہوری طرز انتخاب و نمائندگی کی مخالفت سب سے پہلے سر سید احمد خان نے کی انہوں نے یہ دلیل دی کہ جمہوری طریقہ نمائندگی سے مسلمان اقلیت میں رہ جائیں گے اور ہندو جو اکثریت میں ہیں ہمیشہ ان پر حکومت کریں گے۔ آگے چل کر یہی بات محمد علی جوہر نے کہی کہ مسلمان تعداد میں تھوڑے ہیں' جاہل اور ناواقف ہیں اس لئے وہ جمہوریت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے اور اس کا فائدہ ہندوؤں کو ہوگا جو تعلیم یافتہ ہیں اور اکثریت میں ہیں۔ لہٰذا مسلمان جاگیر دار طبقے کے مفاد میں یہ تھا کہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ برطانوی حکومت سے کوٹہ سسٹم اور دیگر مراعات لے کر کریں۔

اس وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ جمہوریت ان کے حق میں مضر ہے کیونکہ وہ ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ جمہوری طرز حکومت کے بعد ہندو اکثریت انہیں غلام بنا کر رکھے گی۔

اس پس منظر میں اقبال نے بھی جمہوریت کی مخالفت کی اور ان کی مخالفت کی بنیاد بھی اعلیٰ و ادنیٰ اور عوام و خواص پر تھی کیونکہ ان کے نزدیک جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا اقبال کی اس جمہور دشمنی نے مسلمان خواص کے طبقے کو بڑا سہارا دیا اور اقبال کی ذات میں انہیں اپنا حقیقی ترجمان مل گیا۔

ملت اسلامیہ کا تصور

ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے عالم اسلام کی ہر تحریک کا ساتھ دیتے رہے۔ اس وابستگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہندوستان میں اپنی جڑیں پیوست نہیں کیں ہندوستانی مسلمان دانشور اور سیاست دان عالم اسلام کے مسائل کا ہندوستان میں زور شور سے پرچار کرتے رہے اور یہاں کے مسائل پر گہری نظر ڈالنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔

ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے' جب تک یہ سیاسی اعتبار سے طاقت ور اور صاحب اقتدار رہے اس وقت تک انہوں نے عالم اسلام اور اس کے مسائل پر توجہ نہیں دی لیکن جب ان کے سیاسی اقتدار کو زوال ہوا اور طاقت ان کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے پاس گئی تو انہوں نے اچانک خود کو بے یارو مددگار پایا اس موقع پر ان سے دو قسم کے رد عمل کی توقع کی جاسکتی تھی ' اول ہندوستان کی دوسری اقوام سے تعاون کرکے' اس سرزمین سے رشتہ جوڑا جاتا۔ دوم یہ کہ عالم اسلام سے تعلقات استوار کئے جاتے۔ ہندوستان سے باہر تلاش کرنا شروع کیا۔ اقبال نے بھی اس نظریہ کو اختیار کیا اور ہندوستان سے باہر تلاش کرنا شروع کیا۔ اقبال نے بھی اس نظریے کو اختیار کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ ان کے مسائل کا حل عالم اسلام سے اتحاد میں ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اقبال کے اس پہلو پر بڑی فکر انگیز بات کہی ہے۔

> "اقبال بھی مسلمانوں کے علیحدہ قوم ہونے سے انکار کرتے رہے اور خود کو عالمگیری اسلامی برادری کا ایک حصہ سمجھتے رہے حالانکہ ' عراقی' حجازی اور شامی علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔"

اس کے بعد مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> "اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ملت اسلامیہ کی ایک سیاسی شخصیت رکھی' جس کا دنیا میں کہیں وجود نہ تھا۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اگر اقبال کو ہندو مسلم متحدہ قومیت سے انکار تھا تو اس براعظم کی مسلمان آبادی کے گزشتہ آٹھ سو سال کی ہندی اسلامی فکر پر نظر ڈالتا اور اس کا احصاء اور تجزیہ کرتا' اس کی اساس پر اس سرزمین میں ہندی مسلم قومیت کی عمارت اٹھاتا' لیکن وہ دوسرے مسلمان ملکوں کے شاندار ماضی ہی کے راگ الاپتا رہا اور اسلامی ہند کی تاریخی عظمتوں میں خال خال اسے کوئی پرکشش موضوع سخن ملا۔

آگے چل کر وہ مزید کہتے ہیں کہ اقبال ایک روایت پرست یہودی کی طرح مسلمانوں کی موہوم جماعت کو پوجتے رہے' مولانا کو اس بات کا افسوس ہے کہ اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کی قربانیوں اور ان کے کردار کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ جنگ عظیم اول کے بعد آزادی کی خاطر ہندوستانی مسلمانوں نے جو صعوبتیں برداشت کیں اور ہند کے

مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جو کوششیں کیں ان میں ریشمی رومال کی تحریک' جلیانوالہ باغ کا المیہ' تحریک خلافت' تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک شامل ہیں۔ ان تحریکوں میں ہندو اور مسلمانوں دونوں نے قربانیاں دیں۔ اقبال کی "پیام مشرق" اسی زمانہ میں شائع ہوئی اور اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کہا کہ :

مسلم ہندی شکم رابندہ　　خود فروشے و لدل زدویں براندہ

(مسلم ہندی پیٹ کا بندہ ہے اپنے آپ کو بیچنے والا اس کا دل دین سے خالی ہے)

اور امیر حبیب اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے افغانوں کے لئے کہا کہ :

ملت آوارہ کوہ و دمن　　در رگ و خون شیراں موجزن

زیرک وردئیں تن و روشن جبین　　چشم اوچوں جر بازاں شیر بین

جب کہ اس وقت افغانستان میں قرون وسطیٰ کا بادشاہی نظام نافذ تھا اور جہاں وہ بہادری کے جوہر دکھا رہی تھیں جس کا استعمال وہ آپس کی لڑائیوں اور انتقامی کاروائیوں میں کر رہے تھے۔

اسلامی تاریخ کے سلسلے میں بھی اقبال نے ہندوستان کے علماء کا سا رویہ اختیار کیا' بعض اسلامی تاریخ میں سنہری دور عربوں کا دور حکومت ہے اور اسلامی تعلیمات میں خرابی جب آئی جب ان میں ایرانی اثرات آئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اس موضوع پر بڑی عمدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> "اقبال نے عجم اور قومیت کی مخالفت کی۔ یہ اسلامی تاریخ سے بے خبری ہے۔ عباسی عہد سے ایرانی و یونانی اثرات آئے۔ عجمیوں نے اسلام کی خدمت کی' ہندوستانی ہندی فکر نے اسلام کے تصورات ثقافت کو جلا بخشی۔ تاریخ اسلام میں عربوں کے دور کو مقدس سمجھا گیا' ایرانیوں' ترکوں اور ہندوستانیوں کے عہد کو زوال مانا گیا حالانکہ یہ عہد اپنے رنگ میں اسلام کی ترقی کا باعث تھے بدقسمتی سے اقبال اسلامی تاریخ کے ارتقاء اور اس کے قدرتی مظاہر کو نہیں سمجھا اور ساری عمر عجم و عجمیت کی مذمت اور عرب و عربیت کی تعریف کرتا ہے۔

جدیدیت

اقبال دور حاضر اور جدیدیت کے بھی مخالف ہیں جن میں آرٹ

موسیقی سینما اور تھیٹر شامل ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ فنون لطیفہ نے اس عہد میں انسانی شعور کو بیدار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے فنون لطیفہ کی اس لئے بڑی اہمیت اہم ہوتی ہے کہ یہ معاشرے میں لطافت اور بالیدگی کو پروان چڑھاتے ہیں انسان کے حساس اور نازک جذبات اس عمل کے ذریعے نشوونما پاتے ہیں اور انسان میں جو سختی کھردار پن اور وحشت و درندگی ہوتی ہے وہ ختم ہوجاتی ہے۔ مگر اقبال بقول مجنوں گورکھپوری مرد مومن میں عقاب شاہین شہباز اور چیتے جیسے سفاک جانو روں کی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح اقبال دور حاضر کی تبدیلیوں میں عورت کے صحیح مقام کا تعین نہیں کرسکے ان کے نزدیک عورت کا صحیح مقام گھر ہے جہاں پردے میں رہ کر روایتی انداز میں شوہر اور بچوں کی خدمت کرے ان کے ہاں قطعی اس کی گنجائش نہیں کہ عورت معاشرے میں مرد کے برابر آزادانہ اور خود مختار مقام حاصل کرسکے۔

اس لئے اقبال کی شاعری کوئی مثبت پیغام دینے میں ناکام رہی کبھی تو وہ "در قرون رفتہ پنہاں می شوم" کہہ کر ماضی میں پناہ لیتے رہے اور کبھی مسائل سے گھبرا کر "ہے پھر کسی مہدی برحق کی ضرورت" کہہ کر خاموش ہوگئے اقبال کی شاعری کی بنیاد جن افکار پر ہے وہ معاشرے کی ترقی اور شعور کو بیدار کرنے میں قطعی ناکام رہے۔

○○

حوالہ جات

(۱) محمد سرور: عبید اللہ سندھی لاہور۔ ۱۹۶۷ء ص۔ ۴۲۷

(۲) ایضاً ص۔ ۴۲۹

(۳) ایضاً ص۔ ۶۵

(۴) ایضاً ص۔ ۴۳۹

(۵) مجنوں گورکھپوری: اقبال۔ گورکھ پور(؟) ص۔۵۸

اخلاقی و ثقافتی اقدار

انسانی تہذیب تاریخ و تمدن کی ترقی کے ساتھ ایک ایسا موڑ بھی آیا جب معاشرے کی اقلیت نے اکثریت پر غلبہ حاصل کرکے ان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اقلیت معاشرے کے چنیدہ' طاقتور اور مضبوط افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو اپنا اقتدار اور اپنی قیادت کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں رکھتی ہے بلکہ معاشرے میں ایسی روایات' تصورات ' نظریات اور اقدار کو بھی فروغ دیتی ہے جو اس کے اقتدار کو مزید مستحکم اور مضبوط بنا سکیں۔

اگر ہم اپنے معاشرے کی اخلاقی اور ثقافتی اقدار کا تجزیہ کریں تو یہ وہ قدریں تصورات و خیالات ہیں جو اقلیتی با اثر طبقے نے اکثریتی طبقے کو اپنی غلامی میں لانے کے لئے پروان چڑھائے تاکہ اکثریتی طبقہ ذہنی طور پر پسماندہ ہوکر ان کے آگے سرنگوں رہے ان اخلاقی و ثقافتی قدروں کے ذریعے سے ان کو روحانی طور پر مفلوج بناکر اور ان کے کردار اور شخصیت کو کچل کر بے حس اور بے جان بنادیا جائے تاکہ ان کا احساس و شعور اور ان کی سوچ و فکر ختم ہوکر رہ جائے۔

ہمارے معاشرے کی اخلاقی ثقافتی قدروں کی بنیاد حکمران طبقے کی خصوصیات' ان کے کردار اور ان کی خوبیاں ہے۔ یہ فعل لفظ بنیاد سے متعلق ہے مثلاً ہماری زبان میں لفظ شریف کا استعمال ہوتا ہے جو کردار کی ایک خوبی اور وصف ہے اور جب یہ لفظ کسی شخص کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص کردار اور شخصیت کے لحاظ سے انتہائی نیک اور پاک باز ہے۔ اگر اس لفظ کی بنیاد کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ "شرف" سے نکلا ہے جس کے معنی ممتاز کے ہوتے ہیں۔ اسی سے شریف نکلا' جس کی جمع اشراف ہے۔ یہ لفظ امراء ' والیوں اور شہزادوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لہذا شریف اور اشراف وہ لوگ تھے جو امیر' دولت مند یا صاحب اقتدار ہوا کرتے تھے۔ اسی حیثیت سے وہ معاشرے میں ممتاز اور بزرگ تھے لہذا شرافت و خوبی وہ وصف ہوا جس کے حامل معاشرے

کے امراء تھے۔ اب اگر اس لفظ کو معاشرے کے عام افراد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر مہربانی و کرم کرکے اس کو حکمران طبقے کے ایک وصف سے نوازا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے لفظ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لفظ ہے "معزز" جو "عز" سے نکلا ہے۔ اور جس کے معنی طاقت و قوت کے ہیں۔ یہ لفظ بھی حکمران طبقے کے ایک وصف کو ظاہر کرتا ہے' یعنی معزز وہ لوگ ہوئے جو معاشرے میں بااثر اور صاحب اقتدار ہیں۔

ہمارے معاشرے کے بااثر صاحب ثروت اور حکمران طبقے نے اپنی دولت کا سہارا لے کر ایسی قدروں کو فروغ دیا جس کے ذریعے ان کا تسلط معاشرے پر قائم و دائم ہے۔ ایسی قدریں جن کا فروغ دولت کی وجہ سے وہ "فیاضی" "سخاوت" اور "جودو کرم" ہیں اور فیاض اور سخی وہی شخص ہوسکتا ہے جس کے پاس ضروریات سے زیادہ مال و دولت ہو' اور اس دولت میں سے ایک حصے کو وہ عوام میں "خیرات" "عطیہ" "بخشش" اور "صدقات" کا نام دے کر نیک نامی اور شہرت حاصل کرلیتا ہے۔ ایسے فیاض و سخی اور حاتم طائی لوگوں کی داستانیں سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی ادب و شاعری میں بھی نمایاں مقام حاصل کرلیتی ہیں۔

اس پس منظر میں جو جذبہ کارفرما نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی اکثریت کو ان قدروں کے ذریعے مرعوب کیا جائے اور اپنی عظمت ان سے منوائی جائے اور ساتھ ہی خیرات و بھیک دے کر کسی شخص کی مجبوری و لاچاری اور اس کے دکھوں کو ننگا کیا جائے اور اس ذریعے سے اس کی خود داری غیرت و حمیت کے احساسات کو زخمی کر کے کچل دیا جائے۔ یہاں تک کہ اس کی پوری شخصیت اعتماد اور کردار کی مضبوطی سے محروم ہوجائے۔ ایک بار جب کسی شخص کو ذہنی طور پر مردہ بنا دیا جائے تو اس شخص میں جو جدو عمل اور کوشش کے تمام جذبات ختم ہوجاتے ہیں اور وہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ایسا شخص خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہوجاتا ہے اور اس کی ہستی معاشرے میں کیڑے مکوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

یہ رحم وکرم ' یہ سخاوت و فیاضی' یہ عطاء و بخشش نہ صرف معاشرے کی اکثریتی طبقے کی صلاحیتوں' امنگوں' اور جوش و ولولے کو ختم کردیتی ہیں۔ بلکہ ان میں احساس کمتری' ذلت و خواری' اور بے غیرتی و بے حیائی کو پروان چڑھاتی ہیں۔ ان اقدار سے بااثر طبقہ اکثریت پر سیاسی و ذہنی تسلط حاصل کرتا ہے۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ اس تسلط سے نجات پانے کی

عوام کی جانب سے کوئی کوشش نہیں ہوتی وہ اقداروں کی صحیح حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کی طبقاتی تقسیم میں مالک و ملازم' آقا و خادم' سرپرست و زیر دست اعلیٰ و ادنیٰ کی اخلاقی قدریں بھی جدا جدا ہیں۔ مثلاً" ایک خادم اور ملازم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آقا کا وفادار ہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ اس کے احکامات کے بے چوں چرا تعمیل کرے یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر اپنے آقا کی خاطر جان تک دے دے۔ خادم میں یہ احساسات و جذبات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے آقا اور ملازم کی شخصیتوں کو دیکھا جائے: آقا وہ شخص ہے جو اپنے ملازم یا خادم کو معاش فراہم کرتا ہے اس کی ضروریات زندگی پوری کرتا ہے۔ اس کے عوض وہ یہ امید کرتا ہے کہ اس کا خادم اس کی اطاعت کرے اس کا وفادار رہے۔ ایسے خادم کو نمک حلال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جو خادم مالک کی وفاداری کے جذبے اور جوش میں قربانیاں دیتے ہیں ان کی مثالیں تاریخ اور ادب میں بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی ہیں اور انہیں وفاداری کے پیکر اور ایثار کے مجسمے بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ دوسرے اس سے متاثر ہوں اور اپنی جان دینے کے لئے تیار رہیں۔ آقا اور خادم کے اس لین دین کے پس منظر میں ایک تاجر اور گاہک والا معاملہ ہے۔ آقا ایک تاجر ہے جو چند سکوں کے عوض خادم سے اس کی محنت اور زندگی کا سودا کرتا ہے اور اس کو "وفاداری" "اطاعت گزاری" "جانثاری" اور ایثار کی قدروں سے تقویت دیتا ہے' تاکہ اس کی جان و مال اور دولت کی حفاظت کے لئے پاسبان رہیں۔ ان پاسبانوں میں سے اگر کوئی ذرا بھی مخالفت کرے یا اپنے حق کی بات کرے یا نگہبانی میں کوتاہی کرے تو ایسے شخص کو ہمارے ہاں "نمک حرام" کہا جاتا ہے۔

اس کے پس منظر میں سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اقلیتی دولت مند اور با اثر طبقہ' غریبوں پر حکومت کرے اور ذہنی طور پر انہیں ان اخلاقی اور ثقافتی قدروں میں جکڑے رہے تاکہ ان کے خلاف نہ تو کوئی بغاوت ہو اور نہ کوئی آواز اٹھے۔

جب ہم اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس کے علاوہ دوسرے تصورات خیالات' اور اقدار ملتی ہیں جن کی مدد سے طبقاتی تقسیم کو استحکام ملتا ہے۔ مثلاً" ہمارے معاشرے میں خاندان کا تصور انتہائی اہم ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ان کا تعلق شریف' معزز یا صاحب حیثیت گھرانے سے ہے یا یہ بڑے خاندانی آدمی ہیں تو ان صاحب کی بڑائی کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ یا بڑے خاندان والے میں سوائے نیکی'

پاکبازی' شرافت' شرم و حیاء اور دوسری خوبیوں کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

اس لئے اس موقع پر غور کرنے کا مقام ہے کہ آخر یہ خاندان کیا ہے؟ اور خاندان کے ساتھ جو یہ اضافی الفاظ لگائے جاتے ہیں یعنی شریف اور اعلیٰ یہ کیا ہیں؟

ہمارے ان سوالوں کا جواب ہمیں معاشرے کی طبقاتی تقسیم کی جانب سے مل جاتا ہے وہ تقسیم جو دولت و طاقت اور اقتدار کی بنیادوں پر ہوتی ہے یعنی اعلیٰ شریف خاندان وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت و طاقت ہو اور جس کے پاس اقتدار ہو۔ اس کے مقابلے میں غریب اور مفلس کا بھی خاندان ہوتا ہے۔ مگر "خاندانی آدمی" نہیں ہوتا۔ خاندانی ہونے کا شرف ہمارے معاشرے میں ہر شخص کو نہیں بلکہ یہ ان محدود افراد کو ہے جن کا حسب و نسب اور جن کا خاندانی شجرے انہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز کریں۔ اس لئے معاشرے میں وہ شخص شریف اور معزز کہلانے کا مستحق نہیں جس کا خاندان اور حسب و نسب اعلیٰ نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جو دولت مند و اقتدار سے محروم ہو وہ مجہول النسب شخص ہے۔ اور ہر وہ شخص جو کھاتے پیتے گھرانے سے ہو معاشرے میں عزت کا مستحق ہے۔

مذہب ' سرمایہ اور اقتدار کی بنیادوں پر بننے والے یہ خاندان وہ استحصالی قوتیں ہیں جو خود کو معاشرے کے دوسرے افراد سے افضل گردانتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر قائم شدہ خاندان سیدوں' صوفیوں' پیروں اور درویشوں کے ہیں سرمایہ اور اقتدار کی بنیاد والے خاندان جاگیرداروں' زمینداروں ' سرمایہ داروں' اعلیٰ عہدے داروں اور افسروں کے ہیں۔ یہ سب مل کر معاشرے میں خواص کا طبقہ پیدا کرتے ہیں۔

خاندان کے تصور کو مزید مستحکم اور مضبوط بنانے کے لئے ہمارے معاشرے میں ایک اور اہم تصور "خون کی پاکیزگی" کا بھی ہے۔ ہمارے ہاں اس بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ جس کی رگوں میں "شریف خون" گردش کرتا ہے وہ ہمیشہ صاحب کردار ہوتا ہے' یہ خون کی پاکیزگی کیا ہے؟ یعنی وہ خون جس میں عوامی خون کی آمیزش نہ ہو اور صرف اس طبقے کا خون ہو جو خود کو اعلیٰ' ممتاز' شریف اور معزز کہلاتاہے یہ اس بات کی کوشش ہے کہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم رہے۔

خون کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار طبقے "زبان کی پاکیزگی" پر بھی زور دیتا ہے ۔ مثلاً" اردو زبان میں " اردوئے معلیٰ اور بازاری زبان" کے فرق کو دیکھئے۔ اردوئے معلیٰ شہزادوں اور امراء کے خاندانوں میں ڈھل کر بنی سجائی اور نکھر کر آئی ہے۔ اس لئے یہاں کے استعمال شدہ محاورے' الفاظ اور ضرب الامثال معیاری ہیں۔ اس کے مقابلے میں

بازاری زبان ہے۔ چونکہ بازار ہمارے معاشرتی پس منظر میں عوامی علامت ہے اس لئے بازاری ذہن' بازاری بات چیت اور بازاری خیالات وہ فقرے ہیں جو کسی شخص کی پست اور حقیر ذہنیت کے اظہار کے لئے بولے جاتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ ہماری زبان میں ایسے الفاظ' محاورے اور روز مرہ کا استعمال ہوتا ہے کہ جو ارباب اقتدار طبقے کا ظاہر کرتا ہے۔ اور ہر موڑ پر معاشرتی تقسیم کی تلخ حقیقت کا احساس دلاتا ہے۔ مثلاً" خواص و عام' اعلیٰ و ادنیٰ' افضل و اسفل' برتر و کمتر' شریف و رذیل' معزز و حقیر اور امیر و غریب وغیرہ ان میں سے وہ الفاظ جو بااثر طبقے کے لئے استعمال ہوتے ہیں انکے معنی اور استعمال میں خصوصیت ہے۔ مثلاً "خواص" اور "عام" کا مفہوم ہے اس شئے کے لئے ہوتا ہے جو قدرو قیمت کے لحاظ سے اعلیٰ و قیمتی ہو۔ یا وہ چیز جو دوسروں سے ممتاز ہو۔ اس کے مقابلے میں "عام" وہ چیز ہے جس کی کوئی اہمیت اور قدر نہیں۔ اسی مناسبت سے افضل و برتر' شریف و معزز اور امیر وہ الفاظ ہیں جو مفہوم کے لحاظ سے ایک محدود طبقے کی افضلیت کو ہمارے روز مرہ اور بول چال میں ظاہر کرتے ہیں جبکہ نچلا اسفل کمتر' زیر دست' رذیل اور حقیر وہ الفاظ ہیں جو معاشرے کے اکثریتی طبقے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی طور پر اکثریتی طبقے نے صرف اس طبقاتی تقسیم کو قبول کرلیا ہے۔ بلکہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس اقلیتی طبقے کا ایک رکن بن جائے۔ ہمارے معاشرے میں اگر یہ شرف کسی کو حاصل ہوجائے تو یہ اس کی زندگی کی معراج ہوتی ہے۔ اگر چہ ایسے شخص کے لئے جس کا تعلق نچلے طبقے سے ہو اور دولت و ثروت کی بنیاد پر وہ اعلیٰ طبقے میں شامل ہونا چاہے اور ان کے طور طریق اور عادات کو اختیار کرے تو ایسے شخص کا پہلے پہلے "نو دولتی" کہہ کر مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اور "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا" والی کہاوت بھی کی جاتی ہے۔

معاشرے کی اکثریت جو اس طبقے کی حدوں سے بہت دور رہتی ہے' بعض اوقات خود کو ذہنی طور پر مطمئن رکھنے کے لئے اپنے ایسے نام رکھ لیتے ہیں جو ان کی اعلیٰ طبقے سے وابستگی اور مرعوبیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً" شہنشاہ' بادشاہ' شہزادہ' شہزادی' ملکہ' ثروت' راجہ اور رانی وغیرہ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان اخلاقی اور ثقافتی اقدار کے سہارے حکمراں اور با اقتدار طبقے نے معاشرے میں اپنا تسلط قائم کیا اور حکومت کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اخلاقی قدروں

کی بنیاد ایک طبقے سے وابستہ ہے۔ اس لئے ان قدروں کو آفاقی یا ابدی کہنا یا انہیں حق اور سچائی قرار دینا سوائے دھوکے اور فریب کے کچھ نہیں۔ اس کے پس منظر میں حکمران طبقے کی اس کوشش کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کی مدد سے عوام کے ذہنوں کو مسخر کیا جائے' ان کی فکر کو محدود کیا جائے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوو نما کو روکا جائے تاکہ معاشرے میں ان کے تسلط کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہو۔ جب اس مزاحمت کا فقدان ہوگا تو آسانی سے عوام پر حکومت کی جاسکے گی۔

○○

نسل' خاندان اور ذات پات

ہندوستان کے جاگیردارانہ معاشرے میں نسل' خاندان اور ذات پات کے نظریات نے اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد مساوات اور اخوت کے اصولوں کو نظر انداز کرکے' یہاں نسلی و خاندانی بنیادوں پر منصب و عہدے' جاگیریں اور مراعات تقسیم کی گئیں' جس کے نتیجے میں چند خاندان سیاست و اقتدار قابض ہوئے اور انہوں نے اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے' نسل خاندان اور ذات پات کے نظریات کو فروغ دیا تاکہ معاشرے کی اکثریت کو ذہنی طور پر متاثر کرکے انہیں نچلے و کم تر درجے پر مطمئن رکھا جاسکے۔

جب مسلمان ہندوستان میں بحیثیت فاتح کے آئے اور اپنی حکومت قائم کی تو یہ ایک قلیت کی اکثریت پر حکومت تھی۔ اس لئے اقلیت کی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان میں احساس برتری پیدا کیا جائے تاکہ یہ اکثریت پر حکومت کرسکیں۔ چنانچہ فاتحین کی اقلیت نے نسلی و خاندانی بنیادوں پر اس احساس برتری کو قائم کیا۔

مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے دوسری تبدیلی یہ آئی کہ سیاسی و معاشی و سماجی وجوہات کی بنا پر یہاں کی مقامی آبادی میں کچھ لوگ مسلمان ہونا شروع ہوگئے۔ ان کا ردعمل اہل اقتدار طبقے پر یہ ہوا کہ اگر ان کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو انہیں بھی اقتدار اور مراعات میں شامل کرنا پڑے گا اس لئے اقتدار اور مراعات سے محروم کرنے کے لئے اس طبقے کو نسلی اعتبار سے کمتر اور نیچا سمجھا گیا اور انہیں سماجی و معاشرتی و سیاسی زندگی میں برابر کا درجہ نہیں دیا گیا۔ مسلمانوں کی حکومت کے اس ابتدائی دور میں ترک نسل کے افراد کو اعلیٰ عہدے اور منصب دیئے جاتے تھے اور معاشرے کے دوسرے افراد کو ان سے محروم رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب سلطانہ رضیہ نے ملک یاقوت کا عہدہ بڑھایا تو اس کے اس رویے کے خلاف ترک اہل اقتدار طبقے نے سخت احتجاج کیا یہاں تک کہ اس کے خلاف بغاوت کرکے اس کو تخت و تاج سے محروم کردیا۔

جب سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا تو اس نے ترک اہل اقتدار کو طبقے کی حمایت حاصل کرنے اور انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے نسلی پالیسی کو فروغ دیا اور سختی کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ حکومت اور اقتدار کے کسی شعبہ میں' دوسری نسل کے افراد کو چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو' انہیں شریک نہیں کیا جائے گا۔ عہد سلاطین کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے سلطان کے ان اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ :

"اس نے کسی رذیل' بے کار' کم اصل' کمینے اور پست ہمت شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ بلکہ ا لوگوں کا محل کے قریب آنے کا بھی روادار نہ تھا جب تک وہ آدمی کی اصل بنیاد کو نہ جان! کوئی شغل یا کام اس کے سپرد نہ کرتا۔"

(ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی: اردو ترجمہ ۔ لاہور۔ ۱۹۶۹ء ص۔ ۷۷)

یہ نسلی تفاخر بلبن کے نظریہ بادشاہت میں بھی پوری طرح نمایاں تھا جس کا اظہار وہ اس طرح سے کرتا ہے:

"اگر بادشاہ سفلوں' کم ظرفوں' مفردوں' سپاہیوں' نالائقوں' نااہلوں' سوداگروں' دوکانداروں ..... مسخروں' اور بد اصل لوگوں سے بات کرے گا..... تو وہ حشمت بادشاہی اور ہیبت اولوالامری کو خود اپنے ہاتھ سے تباہ کردے گا۔"

(برنی ص۔ ۸۵)

برنی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عہدے کے لئے ایک شخص کا انتخاب ہوا' جس کا نام کل میار تھا۔ جب بلبن نے اس سے میار کے معنی پوچھے تو اس نے کہا: "میار میرا باپ ہے اور وہ ہندو غلام تھا" بادشاہ یہ سنتے ہی غضب کے عالم میں دربار سے اٹھ کر چلا گیا اور بعد میں اپنے امراء سے کہا:

"میں کسی کم اصل' کمینے' رذیل اور ذلیل کو کسی شغل' مرتبے یا عزت کی جگہ پر نہیں دیکھ سکتا۔ اور جوں ہی اس قسم کے لوگ میرے سامنے آتے ہیں میرے جسم کی تمام رگیں حرکت میں آجاتی ہیں.... میں کسی کمین نسل کے لڑکے کو حکومت میں جو مجھ کو خدا کی طرف سے ملی ہے' شریک نہیں کرسکتا..... اگر اس کے بعد کسی خدمت اقطاع' خواجگی مشرفی یا مدبری پر تقرر کے سلسلے میں کسی کمینے' بد اصل یا ذلیل زادے کو ان کارکنوں نے میرے سامنے پیش کیا' چاہے وہ ہزار ہنرمند ہو تو میں ان کے ساتھ وہ برتاؤ

کروں گا جس سے دنیا کے لوگ عبرت حاصل کریں گے۔"

(برنی ص۔ ۸۹-۹۰)

اس سلسلے میں بلبن ہی نے اپنے امراء کو یہ واقعہ سنایا کہ التمش کے زمانے میں بھی ایک مرتبہ اس سے یہ شکایت کی گئی کہ اس کے وزیر نے کم اصل لوگوں کو عہدے دے رکھے ہیں' تو سلطان نے فوراً" حکم دیا کہ ایسے لوگوں کے حسب و نسب کی تفتیش کی جائے۔ اس پر ۳۳ عہدے دار ایسے نکلے جو کم اصل تھے چنانچہ انہیں فوراً" ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

(برنی: ص۔ ۹۱-۹۲

نسلی تفاخر کی پالیسی سے جو بات واضح ہو کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ترک فاتحین اپنے اقتدار میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے بار بار اس بات کو دہرایا گیا کہ کم اصل لوگوں کو حکومت کے عہدے نہ دیئے جائیں' تاکہ حکومت صرف ایک مخصوص طبقے کے ہاتھوں میں رہے۔

نسلی برتری و تفاخر کے حامی اس طبقے کے نمائندگی' ضیاء الدین برنی نے کی ہے اور اپنے خیالات افکار کے ذریعے اس نے انہیں نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اپنے خیالات کا اظہار اس نے "فتاویٰ جہانداری" میں کیا ہے۔ جو نہ صرف برنی کے بلکہ اس عہد کے حکمران طبقے کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ برنی اس بات کا قائل ہے کہ انسان مساوی طور پر پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ ازل سے اس میں شرافت اور نجابت پیدا کردی گئی ہے۔ اس طرح ابتداء ہی سے ہر فن' ہر پیشہ و ہنر کی صلاحیت اس میں پیدا کردی جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے معاشرے میں ان لوگوں کو فضیلت دی ہے جو نفیس اور اعلیٰ پیشے اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا بہترین اوصاف سے نوازتا ہے۔ جیسے وفاداری' بصیرت' عدل ان لوگوں کو اشراف' آزاد' عالی نسب' اور نجیب الطرفین کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ اس کا اہل ہوتا ہے کہ اسے حکومت میں اعلیٰ عہدے دیئے جائیں۔ دوسری طرف کم اصل لوگ ہیں جو حقیر پیشے اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف برائیوں کے لائق ہوتے ہیں جیسے گستاخی' دروغ بیانی' بخل' غبن' حرام کاری' احسان فراموشی' گندگی' ناانصافی' بے غیرتی' بد قماشی' عیاری اور بے دینی۔ ایسے لوگوں کو کم اصل' بازاری' رذیل' کمین' نالائق' پنج ذات' بے شرم اور ناپاک کہا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی ترقی سے اس دنیا کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خدا کی مصلحت کے خلاف ہے۔

(ضیاء الدین برنی: سلاطین دلی کا سیاسی نظریہ۔ محمد حبیب و بیگم افسر عمر۔ دہلی۔ ۱۹۷۹ء ص۔

۲۰۴-۲۰۳

برنی اس بات پر زور دیتا ہے کہ کم تر طبقے کے لئے تعلیم ممنوع ہونی چاہئے کیونکہ اگر انہوں نے تعلیم حاصل کرلی تو یہ لائق اور قابل ہو جائیں گے۔

"ہر طرح کے اساتذہ کو یہ سختی سے حکم ہوتا ہے کہ وہ کتوں کے حلق میں قیمتی پتھر نہ ٹھونسیں' یا خنزیروں اور ریچھوں کے گلے میں گلو بند نہ پہنائیں' یعنی کمینوں' رذیلوں اور نکموں کو' دوکانداروں اور کم اصل کو نماز' روزہ زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن کے کچھ پاروں اور کچھ دینی عقائد سے زیادہ کی تعلیم نہ دیں۔ جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا...... لیکن اس کے علاوہ انہیں کچھ بھی نہ پڑھائیں کہ ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے۔

(سلاطین دہلی کلسیاسی نظریہ ۱۲۱-۱۲۲)

اس کے بعد برنی اس بات پر زور دیتا ہے کہ اقتدار میں سوائے اعلیٰ طبقے کے اور کسی کو اس میں شریک نہ کیا جائے' چاہے عالی نسبوں کے تقرر سے حکومت کو نقصان نظر آئے اور کم اصلوں کے تقرر سے فائدہ۔ مگر کسی بھی صورت میں عہدے ان لوگوں کو نہ دیئے جائیں۔

(سلاطین دہلی: ص۔ ۱۳۶-۱۳۷)

برنی کو اس بات کا احساس تھا کہ علمی دنیا میں ذہانت کسی طبقے کی میراث نہیں اور اہلیت و صلاحیت کسی کی جاگیر نہیں۔ خصوصیت سے آرام و آسائش مراعات اور مقابلہ نہ ہونے سے بر سر اقتدار طبقے کی صلاحیتوں کو زائل کرنا شروع کر دیا تھا' اور ان میں نالائق اور نااہل افراد کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ جب کہ مراعات سے محروم طبقے محنت و مشقت سے اپنی صلاحیتیں ابھار کر رہا تھا۔ اس لئے برنی نسلی و خاندانی تفاخر کی بنیادوں پر اس نااہل طبقے کی مراعات کے تحفظ کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے دلائل بڑے لاجواب ہیں۔ مثلاً" وہ کہتا ہے کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ رذیل' کم اصل اور بے دین' کسی دین یا دنیوی کام کو پورا نہیں کر سکتے اگر بادشاہ کم اصل لوگوں کو عہدے دے گا تو اسے خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس لئے اسے چاہئے کہ عالی نسب لوگوں کو عہدے دے تاکہ روز محشر اسے نجات مل سکے (سلاطین دہلی ص۔ ۱۴۰) ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ اگر کمین کم اصل ایک سو خوبیوں سے بھی مزین ہو تب بھی ملک کا نظم و ضبط نہیں چلا سکے گا۔ اور

سیاسی قیادت و اقتدار کا اہل نہیں ہوگا۔ ایضاً ۱۹۹)

برنی ان سلاطین پر تنقید کرتا ہے جو حسب و نسب دیکھے بغیر لوگوں کو محض وفاداری کی بنیاد پر جو بزرگی اور عظمت کا درجہ دیا گیا ہے اس پر برنی کہتا ہے کہ:

"یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ نجس اور نجس ذات کمین اور کم اصل میں تقویٰ نہیں ہو سکتا اگر ایک رذیل بازاری' انسان میں تقویٰ دکھائی دے تو سمجھ لو یقیناً اس کے بزرگوں کا خون شریف خون سے مخلوط ہو گیا ہوگا۔"

(ایضاً ۲۰۵)

نسلی تفاخر' خاندان اور ذات پات کے نظریات عہد مغلیہ میں باقی رہے اس عہد میں اہل اقتدار طبقہ ایران اور وسطی ایشیاء سے آنے والوں کا تھا اکبر کے زمانے میں صرف راجپوتوں کے اعلیٰ خاندانوں کو اقتدار میں شریک کیا گیا مغل حکومت میں خاندانی امراء کو رعایت دی جاتی تھی۔ مثلاً" اکبر نے ایک مرتبہ ہدایات دیں کہ: قدیم خاندانوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسلاف اور بزرگوں کے کمالات کو پیش نظر رکھ کر ان کے نا اہل جانشینوں کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

(آئین اکبری۔ آئین نمبر۲ اردو ترجمہ ۵۷)

اس سلسلے میں آئین اکبری میں اعلیٰ و ادنیٰ خاندان کے افراد پر جرمانوں کی تفصیلات بڑی دلچسپ ہیں۔ مثلاً" اگر کم مرتبہ' رذیل کسی عالی رتبہ اور شریف خاندان کو گالی دے تو اس سے جرمانہ کے طور پر ساڑھے بارہ درہم لئے جائیں۔ اگر برابر درجے کے ایک دوسرے کو گالی دیں تو اس کا نصف' اگر عالی مرتبت شریف آدمی کو گالی دے تو اس سے چوتھائی وصول کیا جائے۔ (آئین اکبری دوم ۳۳۵)

پورے عہد مغلیہ میں ہندوستان معاشرہ نسلی برتری' خاندان' ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے نمایاں رہا اور سیاسی اقتدار چند خاندانوں میں محدود رہا۔ اور عوام کو ذلیل' حقیر اور کم اصل سمجھ کر ان کے سیاسی مرتبے کو بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اہل اقتدار طبقے نے ان نظریات کو اس وقت تک برقرار رکھا جب تک ہندوستان میں ان کی حکومت مضبوط اور مستحکم رہی۔ لیکن جب حکومت پر انکی گرفت کمزور پڑی اور ان کے خلاف دوسری سیاسی طاقتیں ابھرنا شروع ہوئیں تو سیاسی کمزوری' اور خانہ جنگیوں نے معاشرے کے معاشی و سماجی اور معاشرتی استحکام میں ٹوٹ پھوٹ شروع کر کے زبردست تبدیلیاں کیں اور وہ ڈھانچہ جو نسل خاندان اور ذات پات کی

بنیادوں پر کھڑا تھا' گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگیا۔ بڑے بڑے امراء کے خاندان اپنی جائیدادوں اور مراعات سے محروم ہوگئے۔ قدیم خاندانوں کی حالت زار' روایات واقتدار کی تبدیلی اور سماجی شان و شوکت کی موت نے اس عہد کے شاعروں' ادیبوں اور مورخوں کو بڑا متاثر کیا اور وہ نوحہ کناں ہیں کہ معاشرے میں قیامت آگئی عزت و حرمت کے پیمانے بدل گئے۔ امیر و غریب کا فرق مٹ گیا' خاندانی و کم اصل ایک ہو گئے۔ نیچ ذات دولت مند بن بیٹھے اور اپنی ذات بدل کر معزز اور شرفاء کے زمرے میں شامل ہوگئے۔

اس لئے اس آخری عہد مغلیہ میں جہاں شعراء رخصت ہوتی ہوئی شان و شوکت کا مرثیہ پڑھ رہے تھے وہاں مورخین "عبرت نامے" تصنیف کرکے شرفاء اور معززین کے زوال پر افسوس کر رہے تھے۔ مثلاً" قدیم خاندانوں کے افراد خاک کے برابر ہوگئے اور شائستہ خاں و جعفر خاں کی اولاد کے لئے سواری تک میسر نہیں۔ اجلاف اور رذیل قوم کے پاس حکومت آگئی اور شرفاءِ بازاروں میں محنت و مزدوری کرتے پھر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک مغلیہ خاندان کے زوال کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس میں شرفاء اپنے درجے سے محروم ہوگئے تھے۔

تاریخ میں اس نسلی تفاخر ' خاندان ' اور ذات پات کے منفی اثرات ہوئے۔ اہل اقتدار طبقے نے تمام مراعات اور معاشرے کی دولت پر قبضہ کرکے ملک کی اکثریت کو زندگی کی سہولتوں سے محروم کردیا۔ اس احساس محرومی نے اکثریت کو ملک و قوم سے علیحدہ کر دیا۔ جب تک یہ ایک طبقہ سیاسی طور پر طاقتور رہا یہ عوام کو لوٹتے اور کھسوٹتے رہے' لیکن جب بیرونی حملے ہوئے اور ان کی جائیدادیں و جان و مال خطرے میں پڑے تو عوام کی اکثریت نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور جنگوں سے علیحدہ رہے۔ اگر چہ ایسے موقعوں پر مذہب و قوم و وطن کا نام لے کر اپنی مراعات و جائیدادوں کے دفاع کی کوشش تو کی گئی مگر عوام کی اکثریت نے انہیں بچانے کی کوشش نہیں کی۔

دوسرا منفی اثر یہ ہوا کہ اہل اقتدار طبقے نے صرف اپنے افراد کو تعلیم اور انتظامی تربیت دی اور معاشرے کے دوسرے طبقوں پر دروازے بند کردیئے اس لئے دوسرے ذہین اور باصلاحیت افراد کو مساوی مواقع نہیں ملے۔ اس لئے جب اس طبقے کے افراد عیاشی و سہولتوں اور مراعات کے بوجھ تلے اپنی صلاحیتوں سے محروم ہوئے تو معاشرہ تیزی سے زوال پذیر ہونا شروع ہوگیا۔

نسل ' خاندان ' اور ذات پات کے نظریات کو فروغ دینے کے لئے ادیبوں' شاعروں اور

دانشوروں نے بڑا حصہ لیا۔ اور "خاندان ' اعلیٰ ذات ' شریف خون " اور "خون کی پاکیزگی" کے خیالات کو معاشرے میں مقبول بنایا۔ مثلاً" ایک شاعر فرماتے ہیں کہ:

"کمینے آدمی کو ایک دو گھڑی سے زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا' تلچھٹ اگر اوپر آبھی جائے' آخر اسے تہہ نشین ہونا ہی ہے۔"

اس وجہ سے جب ہندوستان کی برادریاں مسلمان ہوئیں تو انہوں نے مسلمان معاشرے میں مساوی سماجی رتبہ حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ خود کو انصاری' قریشی' اور شیخ بنالیں' ذات پات کی اس تبدیلی پر بھی ایک شاعر نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

" میں ابتداء میں روئی دھننے والا تھا' پھر شیخ بن گیا اگر اناج سستا ہوگیا تو میں اس سال سید بن جاؤں گا۔"

چنانچہ ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ شریف کہلاتا تھا' جب کہ نچلا طبقہ اجلاف۔ شریف میں سید ' مغل ' پٹھان اور شیخ شامل تھے' جب کہ اجلاف میں کاشتکار' تاجر اور مختلف پیشے کے لوگ آتے تھے اور سب سے نچلے طبقے میں قصائی اور بھنگی تھے۔

ہندوستانی معاشرے میں ہنر مند اور محنت کرنے والے کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔امیر اور شریف خاندان کے لوگ انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی کوئی پیشہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ انشاء اللہ خان نے اسی کی جانب اشارہ کا ہے:

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بے کار بیٹھے ہیں

ہندوستانی معاشرے میں ذات پات کی تقسیم اس قدر گہری ہوگئی تھی کہ مشہور عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی نے ذات پات کے اثرات کے تحت شادی بیاہ کے قوانین وضع کئے: مثلاً" اگر کسی عورت نے اپنے میل سے نکاح نہیں کیا اور اپنے سے کم ذات والے سے نکاح کرلیا اور اس پر اس کا ولی ناخوش ہوگیا تو فتویٰ یہ ہے کہ نکاح درست نہیں ہوگا (بہشتی زیور ص-٦) اس لئے وہ بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بے میل بے جوڑ نکاح نہ کیا جائے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ نسب میں کن کن ذات کے افراد میں برابری ہے۔ مثلاً" شیخ ' سید ' انصاری' اور علوی یہ سب ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اگرچہ سیدوں کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ لیکن سید کی لڑکی شیخ سے بیاہی جاسکتی ہے۔ نسب میں بااعتبار باپ کا ہے ماں کا نہیں۔ اس لئے اگر کوئی سید باہر کی عورت گھر میں ڈال لے تو اولاد سید ہوئی۔ لیکن اگر ماں اور باپ دونوں عالی خاندان کے ہوں تو ان کی عزت زیادہ ہوگی۔ (بہشتی زیور ص۹)

اس کے بعد کہتے ہیں کہ مغل' پٹھان ایک قوم ہیں' یہ شیخوں اور سیدوں کی ٹکر کے نہیں۔ پیشوں میں برابری اس طرح سے ہے کہ جولاہے درزیوں کے برابر ہیں۔ تلی اور دھوبی درزی کے برابر کے نہیں۔ (حصہ چہارم ص ۱۰)

ان نسلی اور خاندانی نظریات کے اہم تاریخی اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمان بااقتدار طبقے نے نہ صرف کہ ہندو اکثریت کو حکومت سے علیحدہ رکھا بلکہ نو مسلموں اور غریب نچلے مسلمانوں کو بھی معاشرے میں مساوی درجہ نہیں دیا۔

ہندوستان میں آنے اور اپنی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سنہری موقعہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے کو جو ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے کمزوری اور انتشار کا شکار تھا' نچلی ذات کے افراد کا سماجی رتبہ بڑھا کر ان کی ہمدردیاں حاصل کیا جاتیں لیکن ہوا یہ کہ اس کے برعکس انہوں نے ہندو ذات پات کے اثرات کو قبول کرکے اسے اپنے ہاں رائج کیا۔

اس لئے نیچ ذات کے لوگوں میں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی توقع نہیں رہی کہ وہ انہیں باعزت سماجی رتبہ دیں گے۔ ہندوستان میں اسلام نہ پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان با اقتدار طبقے نے نسلی تفاخر' خاندان اور ذات پات کی بنیادوں پر معاشرے کو تقسیم کرکے' اونچی اور نچلی ذات کے' محروم طبقے کے لئے تمام راستے بند کردیئے۔

اگرچہ نسل' خاندان' اور ذات پات کے بت ٹوٹ چکے ہیں لیکن ابھی بھی ان کے پجاری ہمارے معاشرے میں باقی ہیں ان کے نزدیک سماجی و معاشرتی مساوات قیامت سے کم نہیں۔ لیکن عوامی شعور یہ قیامت پیدا کرکے رہے گا۔ اور نسل خاندان' اور ذات پات کے بتوں کو مکمل تباہ کرکے معاشرے میں مساوات قائم کرے گا۔

○○

فیاضی و سخاوت

قرون وسطیٰ کا ہندوستانی معاشرہ ' جاگیردار اور رعیت پر مشتمل تھا۔ ملک کی زراعتی زمین جاگیر کے طور پر حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور افسروں میں تقسیم کردی جاتی تھی۔ زمین کا ایک بڑا حصہ "خالصہ" کے نام سے بادشاہ کے لئے مخصوص تھا جس کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔ زمین کی اس آمدنی سے بادشاہ اور جاگیردار طبقہ ایک خاص تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھتا۔ فن تعمیر' موسیقی' مصوری' خطاطی' اور شعروادب کی ترقی اسی طبقے کی مدد کی وجہ سے تھی۔ اس طبقے کے شان و شوکت اور عزت بڑھانے کی خاطر فیاضی کا تصور پیدا ہوا تاکہ اس طبقے کو استحکام مل سکے۔ فیاضی کا تصور ہی اس معاشرے کی پیداوار ہے جہاں معاشی ناہمواری اور بعد ہو' جہاں امارت اور غربت ہو اور جہاں دولت کی بنیاد پر ایک طبقہ اپنا اقتدار اور اپنی برتری قائم کرے اور فیاضی و سخاوت کی قدروں کے ذریعے غریب و مفلس طبقے کو ذہنی طور پر اپنا غلام بنائے۔

لیکن دولت خواہ استحصال اور لوٹ مار کے ذریعے ہی کیوں نہ آئی ہو اسے آسانی سے جدا کرنے پر کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے دولت کے خرچ کے لئے مذہب اور اخلاق کا سہارا لیا گیا۔ ایک طرف تو دوسری دنیا میں لاتنے دوگنی اور چوگنی آمدنی کا یقین دلایا گیا تو دوسری طرف اس دنیا سے حاتم طائی کی نیک نامی و شہرت کا آسرا دیا گیا۔ چنانچہ نیک نامی و نام و نمود کی خواہش نے فیاضی و سخاوت کی قدروں کی پرورش کی اس کی مثال اس ادب سے مل سکتی ہے جو اس زمانے میں تخلیق ہوا: اس میں فیاضی و سخاوت جودو کرم اور عطا بخشش کی خوبیوں کی بڑے دلکش انداز میں تلقین کی گئی ہے۔ بادشاہ امراء جو اس وصف کے حامل تھے ان کی فیاضی کے قصے بڑے آب و تاب سے معاصر کی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں اور بعض تو ان میں اپنی سخاوت کی وجہ سے لافانی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔

ہمارے مورخین نے اس قسم کے واقعات کو بڑے فخر سے پیش کیا ہے جہاں بادشاہوں اور امراء نے فقیروں اور محتاجوں میں روپیہ تقسیم کیا' ان کے لئے لنگر خانے کھلوائے' مہمان

خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں ' بیوہ عورتوں کی نگہداشت کی' غریب لڑکیوں کی شادی کا انتظام کیا' مفلسوں میں کمبل اور کپڑے تقسیم کرائے اور ان کے وظیفے مقرر کئے وغیرہ وغیرہ۔ ان واقعات کو لکھتے وقت بادشاہوں اور امراء کی تعریف و توصیف مقصود تھی۔ لیکن انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہی واقعات تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کرتے ہیں یعنی: معاشرے میں مفلسی و غربت تھی' لوگ ایک وقت بھی پیٹ بھر کر نہیں کھاسکتے تھے' غریب اپنی لڑکیوں کی شادی کے وقت جہیز کا انتظام نہیں کرسکتے تھے' مفلسوں کو موسم سرما میں کمبل خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ لنگر خانوں سے اج بھی وہ تصور ابھر کے آتا ہے جہاں ہاروں کی تعداد میں عورتیں' بچے اور مرد کھانا حاصل کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہوں گے فیاضی و سخاوت کی داستانوں کے اس پس منظر میں عوام کی غربت' مفلسی محتاجی لاچاری اور مفلسی کے دکھ جھلکتے ہیں۔

مثلاً" فیروز شاہ تغلق نے ۳۰ خانقاہیں تعمیر کرائیں جہاں ایک خانقاہ میں مہمان تین دن تک ٹھہر سکتا تھا۔ اس طرح لوگ ۳۰ خانقاہوں میں رہ کر ایک سال پورا کرلیتے تھے ان کی زندگی انہی خانقاہوں میں گزر جاتی تھی۔

غریبوں اور محتاجوں کے لئے لنگر خانے قائم کرنے کے عام رواج تھا جہاں سے انہیں پکا پکایا کھانا اور خام غلہ ملا کرتا تھا۔ جہاں گیر نے بڑے بڑے شہروں میں مثلاً" احمد آباد' الہ آباد' لاہور' آگرہ او ر دہلی میں لنگر خانے قائم کرائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شہوں میں مفلس اور بیکار لوگوں کی اس قدر تعداد موجود تھی کہ ان کے لئے لنگر خانے کھولنا ضروری ہوگیا تھا۔ دیہات اور قصبے کے لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی نے کوشش کی نہیں لیکن قحط کے زمانے میں دیہات میں بھی لنگر خانے قائم کردیے جاتے تھے۔

شاہ جہاں کی دولت مندی اور خوشحالی کے تذکرے معاصرین کی تاریخ میں بہت ملتے ہیں اسی لئے اس عہد مغلیہ کا سنہری دور کہا جاتا ہے اس سنہری دور کی مثالیں آج بھی تاج محل اور لال قلعہ کی شکل میں موجود ہیں جبکہ اس عہد میں مفلس و غریب عوام بھوک و فاقہ کے ہاتھوں خاموشی سے زمین کی آغوش میں پنہاں ہوکر مٹ گئے اور اپنی مفلسی کے نشانات بھی اپنے ساتھ لے گئے اس سنہری دور میں دکن اور گجرات میں جب قحط پڑا تو رحمدل بادشاہ نے برہان پور' احمد آباد' اور سورت میں لنگر خانے قائم کرائے اور دو شنبہ کو جو شاہ جہان کی تخت نشینی کا دن ہونے کی وجہ سے مبارک تھا ۲۰ ہزار روپیہ روزانہ کے حساب سے ۵ مہینے تک تقسیم کرایا۔ اس خوشحالی کے زمانے میں، جب کشمیر میں قحط پڑا اور تقریباً" تیس ہزار لوگ

فریادی بن کر دارالحکومت میں آئے تو شاہجہاں نے ان میں ایک لاکھ روپیہ تقسیم کرایا اسی عہد میں ایک قحط پنجاب میں پڑا اور لوگوں کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انہوں نے اپنی اولاد تک کو بیچ ڈالا بلکہ بعض نے تو اپنے بچوں کو ذبح کر کے کھالیا۔ چنانچہ یہاں لنگر خانے قائم کر کے دو ہزار روپیہ روزانہ خرچ کیا گیا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں جبکہ مغل سلطنت اپنے عروج پر تھی اس وقت معاصرین مورخین یہ بھی لکھ رہے تھے کہ قحط اور گرانی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ علاقے ویران اور برباد ہوگئے تھے اور دارالحکومت میں مفلس عوام کا اس قدر ہجوم ہوجاتا تھا کہ راستے بند ہوجاتے تھے۔

بادشاہوں کے علاوہ امراء کی فیاضی کی داستانیں بھی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ بلبن کے زمانے میں فخرالدین کوتوال کا یہ دستور تھا کہ وہ جو لباس ایک بار پہنتا تھا اسے دوبارہ استعمال نہیں کرتا تھا اور انہیں غریبوں میں تقسیم کردیتا تھا اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر سال ایک ہزار غریب لڑکیوں کو جہیز دیا کرتا تھا۔

فیروزشاہ تغلق نے غریب لڑکیوں کی شادی کے انتظام کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ قائم کردیا تھا جہاں ہزاروں نادار لڑکیوں نے اپنے نام لکھوا رکھے تھے۔ شاہ جہاں نے بھی اس روایت کو باقی رکھا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک میں لاچاروں' لپاہجوں اور معذوروں کی کافی تعداد موجود تھی۔ مثلاً: محمود شاہ بہمنی نے جب اندھوں کے لئے وظائف مقرر کئے تو غریب لوگوں نے قصداً اپنی آنکھیں پھوڑ لیں تاکہ انہیں وظیفہ مل جائے۔

گجرات کے سلطان محمود شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سردی کے موسم میں غریبوں میں لحاف تقسیم کرتا تھا سردی سے بچاؤ کے لئے یہی بادشاہ راتوں کو گلیوں میں بازاروں میں آگ جلواتا تھا۔ اورنگ زیب جاڑے میں صرف صوبہ احمد آباد میں ہر سال ڈیڑھ ہزار قبائیں اور ڈیڑھ ہزار کمبل تقسیم کراتا تھا۔ جبکہ قبا کی قیمت ڈیڑھ روپیہ اور کمبل کی آٹھ آنے ہوا کرتی۔ اس ارزانی کے باوجود غریبوں میں ان کے خریدنے کی سکت نہیں تھی۔

فیاضی و سخاوت کے اس قسم کے لاتعداد واقعات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں اگر ان واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ ہمارے ملک میں ہندوستان کی خوشحالی کی تصویر ہمیشہ ایک رخ سے پیش کی گئی جبکہ اس ملک کی اکثریت ہمیشہ غریب و

مفلس رہی اس کی تصدیق خیرات بخشش ' صدقات و عطیات کے واقعات سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً اکبر نے ایک زمانے میں ارادہ کیا کہ ایک مخصوص دن لوگوں میں خیرات کرے اس اعلان کے بعد پہلی مرتبہ قلعہ کے سامنے اس قدر ہجوم ہوا کہ کئی لوگ مجمع میں روند ڈالے گئے۔ اکبر اس منظر سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اس طریقے کو ختم کردیا۔ آج جب ہم تاریخ کے صفحات پر ان بادشاہوں اور ان امراء کی فیاضی و سخاوت کے تذکرے پڑھتے ہیں تو ان واقعات کے پس منظر میں عوام کی مفلسی و عسرت کی ایک اندوہناک اور دکھ بھری تصویر بھی ابھر کر آتی ہے۔ لیکن ہم صرف عالیشان مسجدوں' مقبروں' محلات اور شاہی عمارتوں کو دیکھ کر یا اس دور کی شاعری پڑھ کر' یا موسیقی و مصوری کے فن پاروں کو دیکھ کر اس دور کے بارے میں یہ رائے قائم کرلیتے ہیں کہ ' ہندوستان میں خوش حالی و فارغ البالی تھی اور یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ ہمیں بادشاہوں اور امراء کی سخاوت کی داستانیں بڑی دلکش نظر آتی ہیں' لیکن افسوس کہ تصویر کا دوسرا رخ ہم نہیں دیکھ پاتے۔ ہماری تاریخ میں بادشاہوں ' امراء اور جاگیرداروں کے تذکرے تو ہیں مگر ان میں غریبوں کی آواز شامل نہیں ہے۔

OO

نمک حلالی

نمک حلالی کا تصور ایک خاص سماجی و اقتصادی اور سیاسی صورت حال کی پیداوار ہے' جسے جاگیردارانہ نظام میں حکمران اور بااقتدار طبقے نے اپنے مفادات کے تحفظ اور اقتدار کے استحکام کے لئے جنم دیا کیوں کہ حکمران طبقے کو ہمیشہ اپنے نظام کی بنیادوں کے لئے اخلاقی اور مذہبی نظریات اور قدروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا نمک حلالی کا تصور بھی انہیں بنیادوں میں سے ایک تھا۔ جس پر قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ معاشرے کی بنیاد رکھی گئی' نمک حلالی کی اخلاقی قدر نے بااقتدار طبقے کی اس موقع پر حفاظت کی جب مذہب بھی ان کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے اس سے جو نتائج پیدا ہوئے تاریخ میں وہ دوررس ثابت ہوئے۔

قرون وسطیٰ میں اقتدار کی جنگ شخصی اور خاندان کی بنیاد پر لڑی جاتی تھی اس جنگ میں مذہب کو اس وقت استعمال کیا جاتا تھا جب کہ مخالف کا تعلق دوسرے مذہب سے ہوا کرتا تھا لیکن اگر مخالف کا تعلق بھی اسی مذہب سے ہو تو اس صورت میں کسی دوسرے تصور اور نظریئے کی ضرورت پڑتی تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے ابتدائی زمانے میں مذہب کو ہندوؤں کے خلاف استعمال کیا۔ لیکن جب مسلمان جاگیرداروں اور امراء میں طاقت کے حصول کی خاطر جنگیں ہوئیں اور ان کی ملازمتوں میں ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ آئے تو پھر کسی ایسے نظریے کی تلاش ہوئی جسے ایک فرد یا خاندان کو اپنے لئے استعمال کیا جاسکے۔ چنانچہ یہ وہ مخصوص حالات تھے جن میں نمک حلالی کا تصور ایک نئے انداز سے پیدا ہوا۔ جس کے تحت ایک خادم یا ملازم کو اخلاقی طور پر اس کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنے مالک یا آقا کے ساتھ وفادار رہے اور اس کے خاندان کی خدمت خلوص دل سے کرے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ان کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دے۔ نمک حلالی کا یہ نظریہ ایک لحاظ سے مذہب سے بھی زیادہ وسیع تھا کیونکہ وفاداری اور نمک حلالی میں ہر مذہب و قوم اور نسل کا آدمی شریک ہو سکتا تھا۔

نمک حلالی کا یہ تصور ہمارے سامنے معاشرے کی اقتصادی و معاشی حالت کی ایک

دردناک تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں غربت و امارت کی بنیادوں پر انسانوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ جہاں دولت صرف امراء اور جاگیرداروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور جہاں دولت کے سہارے ان غریب انسانوں کے سودے ہوا کرتے تھے۔ جاگیردارا طبقہ انہیں دولت اور اقتدار کی بنیاد پر ملازمت فراہم کرتا تھا اور یہ توقع رکھتا تھا کہ اس کے عوض وہ صرف اس کے وفادار ہوں گے اور ایک بار اس کا نمک کھانے کے بعد ہر مفاد کو قربان کر کے' صرف اپنے مالک کے مفاد کو مقدم رکھیں گے یہ در حقیقت ایک تاجر اور گاہک کا سودا تھا جہاں جاگیردار تاجر چند سکوں کے عوض غریب گاہک کے جسم و جان پر قابض ہو جاتا تھا۔ لہٰذا نمک حلالی' محض وفاداری کا نام تھا اس کو مزید تقویت دینے کے لئے مذہب' اخلاق اور ادب کا سہارا لیا گیا۔ اس سے رو گردانی کرنے والا معاشرے میں "نمک حرام" کے نام سے مشہور ہوا۔ جو کسی بھی شخص کے لئے انتہائی باعث شرم تھا۔

اس ضمن میں صرف جاگیردار طبقے کے نقطہ نظر کو سامنے رکھا گیا اور ملازم کے خیالات کو کوئی وزن نہیں دیا گیا۔ یعنی اگر ملازم نے مالک کے سلوک' اس کی بے رحمی' یا اس کے استحصال سے مجبور ہو کر اس کی ملازمت چھوڑ دی تو اس صورت میں بھی قصور وار ملازم ہی ٹھہرے گا۔ کیونکہ اس سے توقع یہ رکھی جاتی تھی کہ وہ بے چوں چرا مالک کی خدمت کرے اور اس کا وفادار رہے۔ اس اصول کی بنا پر اگر کوئی شخص ایک مرتبہ کسی کے در دولت سے وابستہ ہو گیا تو پھر اس کا دوسرے در پر جانا معاشرے میں تذلیل کا باعث تھا۔

بادشاہ' امراء اور جاگیردار طبقے نے ان کے سہارے بڑی بڑی بغاوتوں کو کچلا' شورشوں کو ختم کیا اور اپنے مفادات کا تحفظ کیا اگر کسی نے مصیبت کے وقت ان کا ساتھ چھوڑا تو ایسے شخص کو معاشرے میں ذلیل سمجھا گیا اس کی مثال گجرات کے بادشاہ' بہادر شاہ کے امیر رومی خان کی ہے۔ جو ہمایوں کے ساتھ جنگ کے دوران اس کی ملازمت چھوڑ کر ہمایوں سے جاملا۔ اس پر اسے ہر طرف سے نمک حرام کہا گیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر کا طوطا بھی اسے دیکھ کر "نمک حرام رومی خاں" کی رٹ لگانے لگتا تھا۔

لیکن جو لوگ مصیبت کے وقت میں مالک کے وفادار رہتے تھے۔ انہیں تاریخ میں عظیم ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب نے جب گولکنڈہ پر حملہ کیا تو وہاں کے بادشاہ ابو الحسن کی فوج کی ایک جنرل نے جس کا نام عبدالرزاق تھا مغلوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ جب وہ زخموں سے چور ہو کر گرفتار ہوا تو اورنگ زیب نے اس کی بہادری سے متاثر ہو کر اسے مغلیہ فوج میں اعلیٰ منصب کی پیش کش کی۔ لیکن اس نے

کہا کہ اگر اسے دوبارہ زندگی مل گئی تو وہ پھر اپنے مالک کی خدمت کرے گا کیونکہ اس نے اس کا نمک کھایا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت جب پورا ہندوستان مرہٹوں' جاٹوں اور سکھوں کی شورش سے پریشان تھا تو اس وقت ہر سردار کی فوج میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوا کرتے تھے چنانچہ پانی پت کی تیسری جنگ میں جس میں مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ ہوا۔ اس وقت مرہٹہ توپ خانے کا انچارج ایک مسلمان ابراہیم گاردی تھا جو آخری وقت تک ان کی جانب سے لڑا۔

انگریزوں نے جب ہندوستان میں اپنی فوج کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے باشندوں کو اپنی فوج میں شامل کرلیا تو ہندوستانیوں کی برطانوی فوج میں شمولیت اور ان کی خاطر اپنے ہم وطنوں سے جنگ کرنے میں نمک حلالی کا نظریہ تھا جو مذہب 'ملک' اور قوم سے زیادہ ان پر غالب رہا۔

نمک حلالی کے اس نظریے کے پس منظر میں اقتصادی و معاشی عوامل کارفرما تھے۔ غریب عوام اپنی معاشی ضروریات کی خاطر کسی ایک شخص یا خاندان کے وفادار ہوجاتے تھے۔

اہل اقتدار طبقے اپنے ملازمین کی اس وقت مدد کرتا تھا۔ جب یہ اس کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امراء جاگیرداروں اور اہل اقتدار کو نہ تو مذہب سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ ملک و قوم سے۔ اس کی ساری دلچسپی اپنی جائیداد اور دولت میں ہوتی ہے جس کی حفاظت اور دفاع کے لئے نمک حلالی سے بہتر اور کوئی اخلاقی قدر نہیں تھی۔ اس کے زیر اثر غریب و بے سہارا انسانوں نے اپنے دولت مند آقاؤں کی خاطر جان دے دی۔

○○

مجلسی آداب

جاگیردارانہ معاشرے میں تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترقی و نشو نما ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے تحت ہوتی ہے۔ ان ثقافتی اقدار میں اس طبقے کی ذہنیت کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ طبقاتی معاشرے میں مختلف طبقوں کی ثقافتی اقدار جدا جدا ہوتی ہیں۔ ہم جس ثقافت کو معاشرے کی نمائندہ ثقافت کہتے ہیں' اس کا تعلق خواص کے طبقے سے ہوتا ہے خواص کا یہ طبقہ معاشرے میں اپنے استحکام اور عظمت کے لئے کوشاں رہتا ہے اور ہر ذریعے کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

اس ضمن میں مجلسی آداب بھی آتے ہیں۔ ان آداب میں نشست و برخاست بات چیت و گفتگو' کھانا پینا' میل جول' اور سلام و دعا شامل ہیں۔ اس لئے ایک ایسے طبقاتی معاشرے میں جہاں ہر شخص اپنی حیثیت سے واقف ہوتا ہے اعلیٰ و برتر طبقے کے لوگ مجلسی آداب کے ذریعے کمتر اور نچلے طبقے کو احساس کمتری میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔

مثلاً" جب ہمارے معاشرے میں بادشاہی نظام تھا تو اس وقت بادشاہ کے دربار میں ہر شخص کے لئے ضروری تھا کہ وہ بادشاہ کو سجدہ کرے' اس کے ہاتھ پیر چومے اس کے سامنے بار بار جھکے' اس کی موجودگی میں خاموشی کے ساتھ کھڑا رہے جاتے وقت اس کے سامنے پیٹھ نہیں کرے دربار کے آداب اور رسومات کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا میں بادشاہ کی عظمت و ہیبت بیٹھ جائے۔

بادشاہ کے بعد امراء اور عہدیداروں کا طبقہ تھا جو اپنے مرتبے اور منصب کے لحاظ سے کئی درجوں میں تقسیم تھا اس درجے بندی کے تحت مجلسی آداب کی بھی تشکیل ہوئی۔ مثلاً" اگر ایک اعلیٰ درجے کے امیر اور اس سے کم درجے کے امیر کی ملاقات ہوتی تو اعلیٰ درجے والا اپنی نشست پر بیٹھا رہتا اور کھڑے ہو کر استقبال نہ کرتا جبکہ اگر مساوی درجے کا کوئی امیر آتا تو اس کا کھڑے ہو کر استقبال کیا جاتا اور اسے برابر اپنے ساتھ مسند پر بٹھاتا اس کی مناسب خاطر تواضع کی جاتی اور رخصت کے وقت اسے دروازے تک چھوڑنے جاتا۔

امراء اور عوام کے درمیان آداب میں اور بھی فرق نمایاں تھا مثلاً" رعیت کے ہر فرد کے لئے لازمی تھا کہ وہ انہیں دیکھ کر فوراً" جھک کر آداب کرے اگر وہ کوئی مدعا لے کر آیا ہے تو خاموشی سے اس بات کا انتظار کرے کہ اسے بولنے کو موقع دیا جائے اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد اس کا محفل میں ٹھہرنا ضروری نہ تھا اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ تسلیم و آداب میں نچلے درجے کا فرد پہل کرے۔ اور محفل میں ان کی موجودگی میں اس کا کھڑا رہنا آداب میں سے تھا انداز تخاطب میں بھی ضروری تھا کہ جب بولے تو ہاتھ جوڑ کر اپنی عرض پیش کرے اور مخاطب کرتے ہوئے عہدے کے لحاظ سے القاب و آداب کا استعمال کرے۔ مثلاً" حضور' جناب عالی' اعلیٰ حضرت' عالم پناہ' اور جناب والا وغیرہ اپنی عرض پیش کرتے ہوئے ضروری تھا کہ اول اس کی تعریف میں چند جملے کہے۔ جیسے : خدا حضور کو سلامت رکھے' یا جناب کو زندگی بھر دعائیں دیتا رہوں گا' اپنی عرض داشت کے ساتھ یہ بھی کہتا جائے کہ "اگر حضور کو ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں" وغیرہ وغیرہ اسی طرح درخواستوں اور عرض داشتوں میں القاب و خطابات کا ایک خاص طریقہ تھا کہ ہر عہدیدار کو اس کے عہدے اور منصب کے اعتبار سے خطاب کیا جائے ۔ آخر میں درخواست گزار خود کو "فدوی" یا خاکسار لکھتا تھا۔

مجلسوں کے علاوہ شہر' بازار' اور شاہراہ پر اگر کسی اعلیٰ افسر' جاگیردار اور منصب دار کی سواری گزرتی تو اس وقت بھی عام لوگوں پر فرض تھا کہ وہ فوراً" اس کے لئے راستہ چھوڑ دیں اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر آداب و تسلیمات بجا لائیں۔

اس پس منظر سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ یہ وہ مجلسی آداب و ثقافتی قدریں تھیں جو ایک طبقے نے اپنی برتری کو قائم رکھنے کے لئے وضع کیں۔ یہ وہ نفسیاتی حربے تھے کہ جنہوں نے عام آدمی کی خود داری ' احساس نفس اور انا کو کچل کر رکھ دیا اور ان آداب نے عوام میں جرات و ہمت' بہادری' اور عزت کے احساس کو ختم کر کے انہیں بے حس اور بے غیرت بنادیا کیونکہ اسی صورت میں اقلیتی طبقہ ان پر حکومت کر سکتا تھا۔

مغلیہ سلطنت کے بعد جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے بھی ان آداب کو برقرار رکھا۔ کیونکہ یہ ان کی حکومت اور اقتدار کے لئے ضروری تھے آزادی کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں وہی طبقات' ادارے اور ثقافتی قدریں رہیں اور ان مجلسی آداب کے ذریعے طبقاتی تقسیم کو قائم رکھا گیا۔

لیکن عوام میں اب شعور بیدار ہو رہا ہے کہ مجلسی آداب طبقاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانیت اور مساوی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ یقین ہے کہ آج کے جمہوری دور میں یہ طبقاتی بنیادیں شکست خوردہ ہو کر مسمار ہو جائیں گی۔

○○

فن تعمیر

موجودہ جمہوری زمانے میں اب ہر چیز کو ناپنے کے پیمانے بدل گئے ہیں اور ہم چیز کی قدر و قیمت ان بنیادوں پر پرکھتے ہیں کہ ان سے عوام کا کیا تعلق تھا؟ اور تہذیب و تمدن کی' ایجادات اور فنون لطیفہ میں جو ترقی ہوئی اس سے کس حد تک عوام کو فائدہ پہنچا؟ اس لئے جدید مورخ جب تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کا طرز نگارش اور اسلوب درباری مورخ کا نہیں ہوتا جو صرف بادشاہ و امراء کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرتا تھا۔ بلکہ وہ تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے عوام کی اقتصادی و سماجی حالت۔ اور ان کے شعور کو بھی دیکھتا ہے اور اسی روشنی میں اس کا مطالعہ کرتا ہے۔

اس سلسلے میں جب ہم تاریخ میں فنون لطیفہ کی ترقی پر نظرڈالتے ہیں تو ان کی ترقی میں ہم بادشاہوں اور امراء کا ہاتھ دیکھتے ہیں۔ اور ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فنون لطیفہ کا' جو دربار میں پیدا ہوئے' اور دولت و آسائش کی فضا میں ان کی ترقی ہوئی' ان کا عوام سے کتنا تعلق تھا؟ مثلاً" موسیقی' مصوری' اور فن تعمیر' جو دربار کی سرپرستی میں پروان چڑھیں یہ کس حد تک اپنے وقت میں عوام کی نمائندہ رہی ہیں؟ اور ان سے کس حد تک ایک عام آدمی نے فائدہ اٹھایا؟ یا اس کی ذہنی تربیت میں ان فنون لطیفہ نے کیا کردار ادا کیا؟

اس مختصر مضمون میں ہم صرف فن تعمیر پر بحث کریں گے اور اس کا تعلق ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تعمیرات سے ہوگا۔ یہاں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ان تعمیرات میں کس حد تک عوامی فلاح و بہبود کا تصور تھا۔ اور کس حد تک صرف شخصی و ذاتی مفادات کارفرما تھے۔

یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ فن تعمیر کے زمرے میں صرف وہ عمارتیں آتی ہیں جن کی تعمیر میں ایک خاص انداز' طریقہ ثقافتی رنگ جھلکتا ہو۔ اس لئے فن تعمیر ہر دور میں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں عہد کے تصورات و نظریات جھلکتے ہیں۔

تعمیرات کو دیکھ کر اس عہد کی شان و شوکت' ذہنی اختراع اور بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے۔ جس سے کسی دور کی ثقافت کو ناپا جاسکتا ہے اور اس سے معاشرے کی سیاسی' اقتصادی' سماجی' و ثقافتی زندگی کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فن تعمیر کی اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں جو تعمیرات ہوئیں' ان پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ فن تعمیر' جس تصور' یا جس ذہن کی نمائندگی کرتا ہے وہ بادشاہ کی الوہیت اور عظمت ہے اور اس کا اظہار صرف ایک طبقے کی ثقافت ہے اور یہ حکمران طبقہ حکمرانوں' امراء اور جاگیرداروں کا تھا۔ ان تمام عمارات میں جو انہوں نے تعمیر کرائیں' ان میں ان کا محدود طبقاتی پس منظر اور ذہنیت موجود ہے۔ اور یہ اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان تعمیرات کا مقصد ایک طرف تو ان کے ذاتی و سیاسی مفادات تھے اور دوسری طرف وہ ان کے ذریعے اپنی قوت و طاقت کا اظہار چاہتے تھے اور ان سے رعیت کے ذہن کو مرعوب کرکے اپنی عظمت قائم کرنا چاہتے تھے۔

مثلاً اس عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں اور جنہیں فن تعمیر کے اصول پر پرکھتے ہیں' ان عمارتوں کا تعلق صرف ایک طبقے سے تھا۔ محلات' شاہی باغات' قلعے' مقبرے' مسجدیں' فتح کی یاد میں تعمیر شدہ دروازے اور مینار وغیرہ' یہ عمارات جاگیردارانہ معاشرے میں ایک طبقے کی سہولت و آسودگی' حفاظت یا ان کی عظمت کے لئے تعمیر ہوئیں انہوں نے صرف اس قسم کے فن تعمیر کی سرپرستی کی جو بادشاہ کی شخصیت اور جاگیردار طبقے کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائے اور ان تعمیرات کے ذریعے سے ان کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

ان عمارات کی تعمیر کا تجزیہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ محلات کی تعمیر کا مقصد رہائش کہ سہولت اور آرام تھا۔ وسیع کمرے' بارہ دریوں' شہ نشینوں اور صحنوں والے یہ مکانات و محلات بادشاہ اور امراء کے وسیع خاندان اور حرم کے لئے زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کرتے تھے اور مکینوں کے لئے ہر وقت پر فضا اور مسرور کن گردو پیش فراہم کرتے تھے۔ شاہی محلات اور امراء کی حویلیوں سے متصل جو باغات ہوتے تھے وہ بادشاہ و امراء اور ان کے اہل خاندان کی تفریح کے لئے ہوتے تھے۔ قلعے بیرونی و اندرونی دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے تعمیر ہوتے تھے۔ جن کی مضبوط پناہ گاہیں انہیں تمام خطروں سے محفوظ رکھتی تھیں اور جن کی بلند و بالا فصیلوں پر پہرے دار ہر وقت مسلح رہ کر ان کے جان و مال کی حفاظت کرتے

تھے۔ یہ اپنی فتح کی یاد میں مینار اور دروازے تعمیر کراتے تھے تاکہ یہ بلند و بالا دروازے اور مینار رعیت میں ان کی ہیبت قائم رکھ سکیں۔ مسجدوں کی تعمیر میں ایک طرف ان کے مذہبی جذبے کی تسکین ہوتی تھی تو دوسری طرف مسلمان عوام میں انہیں مقبولیت ملتی تھی۔ مرنے کے بعد ان کے لئے خوبصورت اور عالیشان مقبرے بنتے تھے تاکہ ان کا نام نہ مٹنے پائے اور یہ زندہ رہیں۔

ان عمارات کے علاوہ ایسی عمارتیں شاذو نادر ملتی ہیں جن کا مقصد طبقاتی مفاد کے علاوہ عوامی مفاد یا بہبود ہو۔ یا جن عمارتوں سے رعیت نے فائدہ اٹھایا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ان بادشاہوں نے ان عمارتوں کے علاوہ دوسری عمارتیں بھی تعمیر کرائیں جن میں سرائے' پل' یا مدارس شامل ہیں۔ لیکن یہ عمارتیں کوئی فن تعمیر کا نمونہ نہ تھیں اور نہ ہی مضبوط و مستحکم ' اس لئے یہ زمانہ کے نشیب و فراز میں روپوش ہوگئیں۔ آج عہد سلاطین و عہد مغلیہ کی عمارات میں محلات' باغات' قلعے مسجدیں دروازے مقبرے تو نظر آتے ہیں مگر کوئی یونیورسٹی' مدرسہ' ہسپتال اور ٹاؤن ہال نظر نہیں آتا۔

اگر افادیت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عمارات ' جو عوام کے ٹیکسوں سے تعمیر ہوئیں' یہ روپے کا بے جا استعمال تھا اور ان کے ذریعے ' ایک طبقے نے صرف اپنی ذاتی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا۔ ہمیں تاج محل کی خوبصورتی اور حسن سے انکار نہیں' لیکن ذہن میں یہ سوال ضرور آتا ہے کہ اس پر جو کروڑوں روپیہ صرف ہوا' اس کی افادیت کیا ہے؟

اس لئے ہم جمہوریت کے اس دور میں ان اقدار اور روایات کی مذمت کرتے ہیں جن کی تخلیق ایک طبقے کے مفاد میں ہوئی' اور جن میں عوام کی اکثریت کا مفاد نظر انداز کردیا گیا۔ ان تعمیرات کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا کہ بادشاہ امراء کا طبقہ اپنی زندگی آرام و آسائش سے گزارنا چاہتا تھا' اپنے اردگرد ہر شئے کو حسین و خوبصورت دیکھنا چاہتا تھا' اپنی یادگاروں کے ذریعے اپنا نام دنیا میں چھوڑنا چاہتا تھا اور اپنے عالیشان مقبرے عوام کی زیارت کا مرجع بنانا چاہتا تھا' تاکہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم باقی رہے اور ہمیشہ ان کی عظمت کے گن گائے جاتے رہیں اور ان بے نام و گمنام مجبور عوام کو بھول جائیں جن کی دولت و محنت سے یہ عمارات تعمیر ہوئیں۔

لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے اختیار کرتے ہیں

الناس علی دین ملوکھم

ہمارے معاشرے میں بڑی پرانی کہاوت ہے کہ "لوگ اپنے بادشاہوں کے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔" تاریخ میں ہمارے مورخین نے اس اصول کی بنیاد پر بہت سے واقعات پیش کئے ہیں جہاں بادشاہ کے خیالات و تصورات کے ساتھ پورا معاشرہ اسی صورت میں ڈھل گیا لیکن ہمارے مورخین اور دانشور کہاوت اور اس اصول کو بیان کرتے ہوئے یا تو غلط فہمی کا شکار ہوئے یا انہیں معاشرے کو پورا سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت رہی ہے کہ بادشاہ کے مذہب' یا اس کے نظریات و خیالات کی تقلید کرنے والا طبقہ خواص کا ہوتا ہے۔ عوام کا نہیں۔ ہوا یہ ہے کہ ایک زمانے میں عوام کی تو کوئی اہمیت تھی ہی نہیں اس لئے اگر خواص کچھ بھی کرتے تو اسے عوام الناس کا عمل سمجھا جاتا تھا کیونکہ معاشرے سے مراد ہی یہ لوگ تھے اس لئے ہمارے مورخین نے یا جن لوگوں نے اس کہاوت کو رواج دیا انہوں نے خواص کی پیروی کو عوامی بنا کر پیش کیا۔

معاشرے میں خواص اور عوام کے مفادات ہمیشہ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک ایسے معاشرے میں جہاں بادشاہت ہو' اور شخصی حکومت ہو وہاں حکمران کی طاقت لا محدود ہوتی ہے یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ جسے چاہے نواز دے اور جسے چاہے ذلیل و خوار کردے۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور حکومت کے تمام ادارے اس کی مرضی و خواہش کے تابع ہوتے ہیں ۔ اس لئے ایک ایسے معاشرے میں خواص کا طبقہ جس میں امراء فوج کے جنرل و افسر' دفتروں کے عہدیدار اور ملازمین شامل ہوتے ہیں اپنے حکمران کی خوشنودی کے خواہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی خوشنودی سے ان کی مراعات محفوظ رہتی ہیں ملازمتوں میں ترقی ہوتی ہے اور جائیدادیں قائم رہتی ہیں۔ اس لئے خواص کے طبقے کے اپنے کوئی نظریات نہیں ہوتے اور نہ ان میں کسی اصول کی خاطر قربانی کا کوئی تصور

ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے اصول اور نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے حکمران کی عادات و اطوار کے مطابق خود کو یہ طبقہ جس قدر چابک دستی سے ڈھالتا ہے اس کی مثالیں تاریخ میں بکثرت ملتی ہیں۔

اس کے برعکس عوام کے اقتصادی و سیاسی اور سماجی مفادات اس قسم کے نہیں ہوتے کہ جن کے لئے انہیں بادشاہ یا حکمران کی خوشامد کرنی پڑی ہو۔ ان کے پاس نہ جائیداد ہوتی ہے نہ دولت' اور نہ مراعات کہ جن کے تحفظ کے لئے انہیں حکمران کی خوشامد کرنی پڑے۔

لیکن خواص کے طبقے نے ہر دور میں اپنا یہ وطیرہ رکھا کہ بادشاہ کی خوشامد میں اپنی وضع قطع اور حلیہ بدل لیا۔ جیسے ہی ایک حکمران بدلا اور راتوں رات انہوں نے خود کو نئے حکمران کی خواہش کے مطابق تبدیل کرلیا۔ اس وجہ سے حکمران کی جانب سے جو بھی اصلاحی تحریکیں اٹھیں یا جن تحریکوں کی انہوں نے حمایت کی' ان کا دائرہ ہمیشہ خواص میں محدود رہا اور یہ کبھی بھی عوام میں مقبول نہیں ہوئیں۔ اور اسی وجہ سے یہ تحریکیں ان حکمرانوں کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ کیونکہ کسی بھی تحریک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑیں عوام میں ہوں۔ چونکہ عوام اور حکمراں کے مفادات کبھی ایک نہیں ہوئے۔ اس لئے حکمرانوں کی تحریک میں خواص' محض خوشامد کے طور پر شریک ہوئے۔ اور ایسی تحریکیں حکمرانوں کے ساتھ ہی ختم ہوگئیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایسی ہی مذہبی تحریک اکبر بادشاہ نے چلائی تھی۔ جسے چند خوشامدی امراء اور علماء نے اختیار کیا اور اس کے مرنے کے بعد ہی اس کا ایسا خاتمہ ہوا کہ اس کے بعد تاریخ کے صفحات اس سے خالی ہیں۔

تاریخ میں ایسی بہت سی دلچسپ مثالیں ہیں کہ خواص کا طبقہ محض بادشاہ کی خوشامد' دکھاوے کے طور پر بڑا دیندار اور متقی بنا رہا' لیکن فوراً" ہی دوسرے حکمران کے زمانے میں جو عادات و اطوار میں مختلف تھا۔ انہوں نے راتوں رات خود کو بدل ڈالا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس تضاد کی اچھی مثال' عہد سلاطین کی ہے۔

بلبن بادشاہ حکومت کے معاملے میں بڑا سخت تھا اور حکومت کے استحکام کے لئے جبر و تشدد کا قائل تھا۔ عوام میں مقبولیت کے لئے مذہب پر بھی عمل کرتا تھا اس لئے اس کے دور میں خواص کا طبقہ بڑا ہی مذہبی تھا اور بادشاہ کی خوشنودی کے لئے عیش و عشرت کے لوازمات سے بھی دور رہتا تھا۔ لیکن جیسے ہی بلبن کی وفات ہوئی اور اس کا پوتا کیقباد بادشاہ بنا۔ ایسے ہی دربار کی بساط الٹ گئی یہاں پر ضیاء الدین برنی کی کتاب "تاریخ فیروز شاہی"

سے ان حالات پر ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔

"ایک عمر رسیدہ اور پختہ کار سلطان کی بادشاہی ' اس کی سخت گیری باقاعدگی مزاج دانی اور تجربہ کار حکمران کا تدبر اور اس کے تعزیرات کا خوف قیدو بند کی ہیبت' اور اس کی سختی و تیز مزاجی' جن کی وجہ سے ملوک و خوانین کے دلوں میں لہو لعب کی آرزو شراب نوشی اور عیش بازی کی تمنا تک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور ہوا پرستی' خود غرضی' ہنسی مذاق اور مسخرو اور مطرب کا نام تک ارکان دولت اور راعیان مملکت کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ یہ سب لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔ ایسے بادشاہ کی جگہ اب وہ شخص تخت شاہی پر بیٹھا جو نوجوان' خوبصورت خوش خلق' خوش طبع ' اور ہوا و ہوس کا شکار تھا عیش و عشرت کا دلدادہ اپنی خواہشات پوری کرنے کا متمنی...... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے کار لوگوں کی بن آئی۔ خوشیاں اڑانے والے' مجلسوں میں رونق پیدا کرنے والے' عیش و عشرت کے دلدادہ' لطیفہ گو' اور ہنسی مزاق کرنے والے جو خاموش تھے .... خود سلطان معزالدین اور اس کے ارکان ملک و دولت' اور اس کے عہد کے خانزادے' اور ملک زادے ' تفریح اور عیش کرنے والے' مال دار' نفس پرست اور مزے اڑانے والے' سب کے سب عیش و طرب اور راحت و آرام میں پڑ گئے..... الناس علی دین ملکوکھم کا اثر سلطنت کے ہر بڑے' چھوٹے ' جوان ' بوڑھے عالم و جاہل عقل مند و بے وقوف اور ہندو و مسلم پر ظاہر ہونے لگا۔"

(تاریخ فیروز شاہی: اردو ترجمہ۔ ص۔ ۲۱۷-۲۱۸)

برنی نے خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ بلبن کے زمانے میں "ملوک و خوانیں" میں بادشاہ کی وجہ سے عیش و عشرت کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اور کیقباد کے زمانے میں "ارکان دولت " اور "خانزادے" اس کے شریک محفل ہوا کرتے تھے آگے چل کر برنی نے الناس علی دین ملکوکھم کی مزید تشریح کی ہے۔

"بادشاہ اور اس کے دربار سے منسلک خواص و عوام کے عیش و طرب میں مستغرق اور منہمک ہوجانے کی شہرت تمام پھیل گئی اور ملک کے ہر حصہ میں پہنچ گئی۔ ہر علاقے سے مطرب خوش الحان اور حسین لوگ ہنسی کرنے والے' مسخرے اور بھانڈ دربار میں آگئے..... مسجدیں نمازیوں سے خالی

ہو گئیں اور شراب خانے آباد ہو گئے' خانقاہوں میں کوئی باقی نہ رہا' اور معلبے
یعنی نشست گاہیں بھرنے لگیں' شراب کا نرخ دس گناہ بڑھ گیا اور لوگ
عیش و عشرت میں ڈوب گئے۔"

(تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۱۹)

سلطان علاؤ الدین کی وفات کے بعد' جب قطب الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو پھر تاریخ نے خواص کے طبقے میں تبدیلی دیکھی۔ مرحوم بادشاہ کے آئین و قوانین' نظم و نسق اور انتظام سلطنت کو اسی کے ساتھ دفن کر دیا گیا اور نئے حکمران کے رنگ میں رنگ گئے۔ برنی کے الفاظ میں اس تبدیلی کا مطالعہ کیا جائے:

"ساری دنیا ہوا پرستی میں مبتلا ہو گئی' زمانے کے کاروبار کا رنگ بدل گیا' بادشاہی کا خوف لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا اکثر لوگوں نے توبہ توڑ دی اور نیکی و عفت کو خیرباد کہہ دیا' عبادات میں نوافل میں جو مصروفیات ہو گئیں تھیں اس میں بھی کمی آگئی' بلکہ فرائض کی ادائیگی میں خلل آگیا' مسجدیں بے جماعت ہونے لگیں' چونکہ بادشاہ دن رات کھلم کھلا فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا' مخلوق کے دلوں میں بھی فسق و فجور راہ پانے لگا۔"

تاریخ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شخصی حکمرانوں کی جانب سے چلائی جانے والی تحریکیں صرف ان ہی کی زندگی میں باقی رہتی ہیں اور ان کی زندگی میں جو لوگ ان کی حمایت کرتے ہیں وہ خواص کا خوشامدی طبقہ ہوتا ہے عوام الناس نہیں ہوتے۔

○○

ہندوستان میں فارسی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے فارسی زبان حکمرانوں اور با اقتدار طبقے کی زبان رہی۔ ہندوستان میں اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جو وسط ایشیا' ایران اور افغانستان سے یہاں آئے تھے اور اپنے ساتھ فارسی زبان کو بھی ساتھ لائے تھے۔

سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ فارسی نے تہذیب و تمدن اور ثقافتی میدان میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں برتری حاصل کرلی۔ لیکن ہندوستان کے عوام کی اکثریت فارسی سے نابلد تھی۔ سوائے معدودے چند افراد کے یا اس اقلیت کے جس نے ملازمتوں کے حصول یا سیاسی مقاصد کے لئے حکمران طبقے کے قریب آنے کے لئے یہ زبان سیکھی اس لئے فارسی زبان نے حکمران طبقے اور عوام کے درمیان حد فاصل قائم کردی حکمران طبقے نے اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ اور سیاسی فوائد کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں اور بولیوں کو آگے بڑھنے کا مواقع فراہم نہ کئے جائیں چونکہ دربار کی سرپرستی صرف فارسی کے لئے تھی اس لئے اس نے ترقی کی لیکن اس کی جڑیں عوام میں مضبوط نہیں ہوئیں۔

زبان کے اس فرق سے یہ نتیجہ نکلا کہ حکمران طبقے اور رعیت میں بعد اور دوری ہوگئی۔ اس لئے حکمران طبقے کے لئے یہ وقت طلب مسئلہ تھا کہ وہ عوام سے براہ راست گفتگو کرکے ان کے مسائل یا ان کی مشکلات سے آگاہ ہوتے زبان کے فرق نے حکمران اور رعیت میں ہم آہنگی نہیں ہونے دی اور ہندوستان کی اکثریت میں یہ احساس قائم رہا کہ ان پر غیر ملکی حکمران حکومت کر رہے ہیں فارسی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر وہی لوگ فائز ہوتے تھے جن کی مادری زبان یا تو فارسی تھی یا جو حصول ملازمت کے لئے اسے سیکھتے تھے۔ اس لئے اہل ایران جو ہندوستان میں بہتر ملازمتوں کے حصول کی خاطر برابر آتے رہتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر یہی لوگ فائز ہوتے تھے۔ اور فارسی نہ جاننے

الے یا کم جانے والے ان ملازمتوں سے محروم رہتے تھے۔

تاریخ میں یہ اصول عام رہا ہے کہ جب کسی ملک پر غیر ملکی قابض ہوجاتے ہیں تو مفتوح قوم کا ایک طبقہ فاتح سے مفاہمت کرکے اس کے ساتھ اقتدار میں شریک ہوجاتا ہے چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کاسیتھوں نے فارسی زبان سیکھنی شروع کی تاکہ حکومت کی ملازمتیں انہیں مل سکیں۔ انکی فارسی زبان دانی کے باوجود بجائے اس کے ان کی قدر ہوتی' ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی فارسی میں ہینگ کی بو آتی رہی۔ اس کے پس منظر میں بنیادی بات یہی تھی کہ انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدوں سے دور رکھا جائے۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود انہوں نے فارسی زبان سیکھی اور حکومت کی ملازمتیں بھی اختیار کیں۔

لیکن جہاں ایک طرف ان کاسیتھوں کی فارسی کو اعلیٰ و معیاری تسلیم نہیں کیا جاتا تھا' اسی طرح اہل ایران ہندوستان کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کے فارسی کے شعراء و ادباء ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہے اور اس کوشش میں رہے کہ اپنی زبان کی قابلیت اہل ایران سے تسلیم کرائیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود اہل ایران نے ہندوستانی فارسی ادب کو بنظر تحقیر دیکھا اور اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔ امیر خسرو جیسے باکمال شاعر کو بقول پروفیسر آربری "طوطی ہند" کہا کیونکہ طوطی ہمیشہ نقالی کرتا ہے۔

یہ حقیقت رہی ہے کہ سوائے چند ایک کے ہمارے اکثر شعراء اور ادباء ایرانی اسلوب سے متاثر تھے اور تخلیق سے زیادہ ان کی تقلید تھی۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا فارسی ادب' ہندوستانی معاشرے سے زیادہ ایرانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب کی اصناف ہوں یا اسلوب' تشبیہات و استعارات ہوں یا تلمیحات ان سب میں ایرانی رنگ جھلکتا ہے۔ ہمارے شعراء و ادباء نے اپنے گردو پیش پر کم نظر ڈالی اور خیالی ایران کی زیادہ رنگ آمیزی کی۔ اس لئے زبان کی بنیاد پر جو ثقافت اور کلچر وجود میں آیا۔ جس سے ہم معاشرے کے رجحانات کا پتہ چلاتے ہیں اس معیار پر ہمارا فارسی ادب پورا نہیں اترتا کیونکہ اس کے ثقافتی و تہذیبی پیمانے پر ایرانی رہے' ہندوستانی نہیں۔

یہی حال ان موضوعات کا ہے جنہیں ہمارے شعراء اور ادباء نے اختیار کیا۔ ان کا تعلق بھی ایران و توران سے ہے' رستم و سہراب' شیریں فرہاد' اور دوسرے قصے کہانیاں' جو ہندوستان کی نہیں باہر کی ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی پھل' پھول درخت' پرندے اور موسم بھی ایرانی رہے۔

ہمارے نصاب میں جو کتابیں شامل تھیں' ان میں "گلستان و بوستان" "دیوان حافظ"

"شاہ نامہ" یا "سکندر نامہ" وغیرہ تھے جن کا تعلق ایران کی ثقافت سے تھا اس نے اہل ہندوستان کو ایران سے اس قدر متاثر کیا کہ انہیں اپنی زبان' تہذیب و تمدن اور ثقافت حقیر نظر آتی تھی۔

یہ تاریخی شواہد ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ ایک طرف فارسی حکمران جماعت کی زبان رہی جس نے ان میں اور رعیت میں فرق کو قائم رکھا دوسرے اہل ہندوستان نے تخلیق کی بجائے تقلید کو اختیار کیا اور ان پر ایران کی برتری چھائی رہی۔ اس کی مثال علامہ اقبال ہیں جنھوں نے اردو زبان کو چھوڑ کر اس کی کم مائیگی کا اقرار کر کے فارسی میں شاعری کی۔ آج یہ کتنی بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہم اپنے قومی شاعر کا کلام ترجمے کے ذریعے پڑھتے ہیں اور دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ اہل ایران ان کی فارسی کو مستند نہیں مانتے۔

○○

غیر ملکی اقتدار

دنیا کی تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ طاقتور قومیں کمزوروں پر غلبہ حاصل کرکے انہیں غلام بناتی رہی ہیں۔ ایسی قومیں دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو تہذیب و تمدن سے بالکل عاری ہوتی ہیں' غیر متمدن اور وحشی قومیں' جنہوں نے اپنی جسمانی طاقت و قوت سے ان قوموں کو با آسانی زیر کرلیا جو تہذیب و تمدن کے زیر سایہ سہل پسند اور عیش پرست ہوگئے تھے۔ چونکہ یہ وحشی اقوام تہذیب و تمدن سے نا آشنا ہوتی تھیں اس لئے فتح کے بعد ان کے ہاتھوں صدیوں کی تہذیب بری طرح تباہ ہوئی۔ شہروں کو لوٹنا' جلانا' کتب خانوں کو برباد کرنا' نازک و خوبصورت اشیاء کو توڑ پھوڑ کر ختم کردینا ان کا دستور رہا۔ اس قسم کی تباہی مشرق و مغرب دونوں جگہ وحشی اقوام و قبائل کے ہاتھوں ہوئی جس کی وجہ سے نہ صرف تہذیب و تمدن کی ترقی رک گئی' بلکہ اکثر تہذیبیں ان کے ہاتھوں ختم ہوگئیں۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال منگولوں کے حملے ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے صدیوں کے تہذیبی و ثقافتی مراکز کو بالکل تباہ و برباد کردیا۔ اور علمی و ادبی ترقی کے جاری عمل کو ختم کرکے اسلامی دنیا کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا۔

اس کے بر عکس ایک دوسرا غیر ملکی اقتدار بھی ہوتا تھا' یہ اقتدار ایک تہذیب اور ترقی یافتہ قوم اپنے سے کم تر پر غلبہ حاصل کرکے حاصل کرتی تھی سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد یہ اپنے ترقی یافتہ اداروں' روایات اور نظریات کو مفتوح معاشرے میں رواج دیتی تھی۔ اور اس کی فرسودہ اور غیر ترقی یافتہ روایات اور رسومات کو ختم کرکے سیاسی و معاشرتی زندگی میں انقلاب لے کر آتی تھی۔

کیونکہ جو ادارے فاتح قوم کے اپنے ہوتے ہیں اور دنیا کو مہذب اور ترقی یافتہ بنانے کا جذبہ اس قوم کے افراد میں ہوتا ہے' وہ جذبے اور ترقی کا شوق وہ مفتوحہ ملکوں میں بھی پیدا کردیتے ہیں۔ اس کی مثال ہندوستان میں انگریزوں کا قبضہ ہے۔ ہندوستان پر انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں سیاسی افراتفری' عدم تحفظ' معاشرتی انتشار' معاشی بے چینی اور سماجی خلفشار

تھا۔ ملک میں چھوٹی ریاستیں تھیں جہاں نوابوں ' راجاؤں اور زمینداروں کی شخصی حکومتیں تھیں۔ جنہوں نے عوام کو تمام حقوق سے محروم کرکے اپنے اقتدار تلے دبا رکھا تھا۔ اس لئے یہاں کے عوام اس قدر پس ماندہ ' کم ہمت اور کچلے ہوئے تھے کہ ان میں استبدادی نظام ختم کرنے کا نہ تو شعور تھا اور نہ ہی طاقت۔ انگریزی اقتدار کے استحکام سے یہ ہوا کہ ان شخصی حکومتوں کا ایک ایک کرکے خاتمہ ہوا' اور عوام کو ان آمروں اور ظالموں سے نجات ملی اگر یہاں انگریزی اقتدار قائم نہ ہوتا تو پھر ہندوستان کو اس استبدادی نظام سے چھٹکارا پانے کے لئے صدیوں انتظار کرنا پڑتا۔

انگریزی حکومت کے زمانے میں جو ذہنی و فکری تبدیلیاں یورپ میں ہورہی تھیں' اس سے ہندوستان بھی متاثر ہوا اور اس اثر سے یہاں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں' جدید تعلیم کا آغاز ہوا اور اہل ہندوستان قدیم دور سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوگئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان نے جو کچھ انگریزی اقتدار کے زمانے میں حاصل کیا' یہی کچھ وہ آزادانہ طور پر کتنے عرصے میں اور کیا کیا قربانیاں دے کر حاصل کرتا' یہ صحیح ہے کہ زمانے کی رفتار کو کوئی استبدادی نظام نہیں روک سکتا ہے' فرسودہ ادارے اور روایات ختم ہوکر رہتی ہیں۔ لیکن یہ عمل ترقی یافتہ غیر ملکی اقتدار کی صورت میں تیز ہوجاتا ہے۔

اس کی دوسری مثال وسط ایشیا میں اس کے قبضے سے دی جاسکتی ہے جہاں ظالم و عیاش حکمرانوں کا اقتدار تھا جس کے بوجھ تلے وہاں کے عوام تھے ان کی پس ماندگی اور جہالت کا یہ حال تھا کہ ان میں اتنی قوت و طاقت اور اتحاد نہیں تھا کہ وہ اس استبدادی نظام سے مقابلہ کرسکتے۔ روسی انقلاب کے بعد اس میں زبردست تبدیلی آئی اور وہاں کی آبادی' تعلیم' صحت و صفائی اور معیار کی زندگی سے آشنا ہوگئی' اگر روسی ترقی یافتہ اقتدار ان کی مدد نہ کرتے تو اس دور میں داخل ہونے میں انہیں کئی صدیاں انتظار کرنا پڑتا۔

اس ترقی یافتہ اقتدار کی مثالیں ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں میں مل جائیں گی۔

قومیں باہمی جنگ و جدل اور فتح و شکست کے نتیجے میں تباہی و بربادی' تکلیف و اذیت سے دوچار ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب فاتح اقوام غیر مہذب اور وحشی ہوتی ہیں تو اس صورت میں آگے چل کر وہ خود اس تہذیب کے ہاتھوں شکست کھالیتی ہیں۔ اور متمدن قوم کی تہذیبی و ثقافتی قدروں اور روایات کو اختیار کرلیتی ہیں جیسے آریہ قوم نے ورلوڑ روایات کو اختیار کیا' رومیوں نے یونانیوں کی تہذیب کو اور منگولوں نے اسلامی تمدن کو۔ اور مفتوح قوم کی تہذیب میں ضم ہوگئے اس عمل سے تہذیب وقتی

طور پر تو رک جاتی ہے لیکن اس کا دائرہ پھیل جاتا ہے اور بعد میں یہ دوسری قوموں سے مل کر تخلیقی عمل کی ابتدا کرتی ہے۔

دوسری صورت میں متمدن قوم' اپنے سے کم مہذب قوموں کو اپنی ذہنی سطح پر لانے کی کوشش کرتی ہے اور اشتراک سے مفتوح قوم میں شعور و آگہی پیدا ہوتی ہے۔

انسان وقتی طور پر صرف ان تباہیوں اور تباہ کاریوں کو دیکھتا ہے جو غیر ملکی اقتدار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی تہہ میں تعمیر کے عنصر بھی مضمر ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

OO

کیا نظریے کا احیاء ممکن ہے

نظریے کی تاریخ میں یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ کیا ایک نظریہ جو اپنی پیدائش' ارتقاء اور عروج کے وقت جن اقدار و روایات اور اثرات کو پیدا کرتا ہے جس فلاحی اور مثالی معاشرے کو تشکیل دیتا ہے کیا وہ اپنے زوال پزیر ہونے کے بعد اپنی قوت و طاقت کھونے کے بعد اس قابل رہتا ہے کہ پھر کسی موقع پر اس کا اسی قوت اور توانائی کے ساتھ احیاء ہو سکے اور پھر سے وہ اسی شدت کے ساتھ نئی تبدیلیاں لا سکے یا پرانی روایات کو نئی زندگی دے سکے؟

انسانی تاریخ میں ہر نظریے کے ماننے والوں کی جانب سے یہ کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ وہ زوال پذیر' فرسودہ اور مضمحل معاشرے کی ترقی کا خواب اسی میں دیکھتے ہیں کہ اپنے نظریے کا دوبارہ سے احیاء کیا جائے۔ اس کی تعلیمات کو اسی شدت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسی تمام تحریکیں چاہے ان کا تعلق کسی نظریے سے ہو ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ آج تک کوئی نظریہ اپنی قوت و طاقت کھونے کے بعد دوبارہ اس قابل نہیں ہوا کہ اس کا احیاء کیا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے کہ نظریہ یا نظریاتی تحریک کن حالات میں پیدا ہوتی ہے؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی نظریے کے پیدا ہونے یا تحریک کے جنم لینے میں ہمیشہ معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں ہوتی ہیں۔ جب یہ برائیاں اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہیں اور ان کی اصلاح ایک ناممکن عمل بن جاتی ہے اور معاشرے کی روایات و اقدار درست کرنے' ٹھیک کرنے یا بہتر بنانے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ تو اس کے نتیجے میں کوئی نظریہ تخلیق ہوتا ہے جو معاشرے کی تمام روایات' خیالات اور افکار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اس لئے یہ نظریہ اپنے ابتدائی دور میں انقلابی ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک پورے معاشی و معاشرتی اور سماجی نظام کو مکمل مسمار نہیں کیا جاتا اس وقت تک ایک نئے جاندار معاشرے کی تعمیر ناممکن ہوتی ہے۔

اس لئے ہر نیا نظریہ پرانے نظریے کی موت کا پیغام لاتا ہے' وہ سمجھوتے کا قائل نہیں ہوتا بلکہ شدت سے اپنی تعلیمات کا نفاذ چاہتا ہے اس لئے یہ اپنے ماننے والوں میں ایسی روح پیدا کرتا ہے کہ جس کے زیر اثر وہ جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے نظریے کی پیدائش ' ارتقاء اور عروج کے وقت اس کے پیرو کار اس پر شدت و سختی سے ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس کی خوبیوں و اچھائیوں سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس نظام کو پوری دنیا میں نافذ کردیا جائے یہ خواہش ان میں توسیع پسندی اور استعماریت کو جنم دیتی ہے اس کے زیر اثر نئے ملک فتح کئے جاتے ہیں اور دوسری قوموں کو مفتوح بنایا جاتا ہے۔ لیکن نظریے کا یہ عالمی و آفاقی تصور' اس کا پھیلاؤ اور وسعت ہی بالاخر اس کے زوال کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ جب تک نظریہ ایک محدود دائرے میں اور مخصوص معاشرے وجغرافیائی حدود میں ہوتا ہے اس وقت تک یہ اپنی روایات و اقدار کی قوت و طاقت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ لیکن نئے ملک کی فتح نئے معاشروں سے ٹکراؤ' اور ان کی روایات و اقدار سے تصادم اس نظریے کی ہیئت' شکل و صورت اور ڈھانچے کو تبدیل کردیتے ہیں۔ کیونکہ اب یہ نیا نظریہ انقلابی نہیں رہتا بلکہ یہ سمجھوتے پر عمل پیرا ہوکر مفتوح اقوام کی تہذیب و تمدن کو خود میں جذب کرلیتا ہے۔ اس کے اس پھیلاؤ سے اس میں وہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ ہر جگہ سے پرانی روایات کو ختم کردے۔ اس لئے اسے دوسری روایات کو خود میں جذب ہونے کی دعوت قبول کرنی پڑتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اس نظریے ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظریے میں جغرافیائی' لسانی' تہذیبی ' تمدنی' اور ثقافتی طور پر ہم آہنگی و اتحاد نہیں رہتا اور نظریہ مختلف حصوں میں تقسیم ہوکر اس کی وحدت کو ختم کردیتا ہے اور یہی وہ عوامل نظریے کو دن بدن کمزور کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس زوال پذیر زمانے میں مصلحین کی مختلف جماعتیں ابھرتی ہیں جو اس بات پر غور و خوض کرتی ہیں کہ معاشرے یا قوم کو کس طرح پس ماندگی سے نکالا جائے۔ ان میں وہ افراد ہوتے ہیں جو نظریے کے تاریخی کردار سے متاثر ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس نظریے کے تحت اور اس کی تعلیمات کے اثر سے وہ ایک بار پھر معاشرے کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرسکتے ہیں یہی وہ طبقہ ہوتا ہے جو نظریے کے احیاء کی بات کرتا ہے۔ اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ۔ چونکہ ماضی میں اس نظریے نے ایک فلاحی معاشرہ تشکیل دیا تھا اور جب اس کی تعلیمات میں یہ قوت تھی تو آج پھر کیوں نہ انہی تعلیمات پر

عمل کرکے ایسے ہی معاشرے کی تشکیل کی جائے۔ اس ضمن میں ان کی جانب سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ نظریے کے زوال کے اسباب میں سب سے اہم سبب یہ ہے کہ اس کی خالص روایات باقی نہیں رہیں۔ اور اس میں خارجی اثرات زیادہ آگئے ہیں۔اس لئے نظریے کو پھر سے خارجی اثرات سے پاک کرکے خالص کردیا جائے تو اس میں پھر سے وہی توانائی اور قوت آسکتی ہے۔

لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ احیاء کی یہ تحریکیں ان تمام کوششوں کے باوجود کامیاب نہیں ہوسکیں اور معاشرے کی اکثریت کو اپنے دلائل سے مطمئن نہیں کرسکیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:-

(۱) نظریے کی خالص روایات جن کی یہ طبقہ بات کرتا ہے ان کا زمان و مکاں سے اس قدر بعد ہوجاتا ہے کہ معاشرے کی اکثریت کو ان سے کسی قسم کا جذباتی لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے ان کے احیاء میں کسی کو دلچسپی نہیں رہتی۔

(۲) معاشرے میں موجود روایات سے افراد کااس قدر جذباتی تعلق ہوجاتا ہے کہ وہ انہیں ختم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

(۳) خالص روایات کی تاویل' تعبیراور تفسیر میں اختلافات ہوجاتے ہیں۔

(۴) احیاء کے حامی نظریے کے احیاء کے لئے سیاسی قوت و طاقت کا حصول ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے دوسرے بااثر گروہ اس حصول میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اقتدار کے حصول کی جنگ میں انہیں معاشرے کے دوسرے سیاسی گروہوں سے شدید جنگ کرنا پڑتی ہے۔ جس میں ضروری نہیں کہ وہ فتح یاب ہی ہوں۔

(۵) لیکن ان سب سے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ زمانے میں تغیرو تبدل ہوتا رہتا ہے۔ انسان کے خیالات و افکار میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ہر نسل اپنے تقاضے اور ضروریات اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس لئے نئے مسائل کا حل پرانی قدروں سے نہیں ہوتا نئے حالات ہمیشہ نئے نظریات کو جنم دیتے ہیں۔

اس لئے تاریخ کے مفکروں نے اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ ہر نظریہ اور تہذیب اپنی طبعی مدت کے بعد ختم ہوجاتے ہیں۔ اور یہ کہ کسی نظریے کا احیاء ممکن نہیں۔ جب اس کی روح مرجائے تو پھر بے جان ڈھانچے' میں زندگی پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ اسی لئے دنیا میں اصلاح و احیاء کی جو تحریکیں اٹھیں وہ اکثریت کو متاثر نہیں کرسکیں اور صرف معمولی اقلیت ان کی ہم نوا ہوئی جس نے معاشرے کو متحد کرنے کے بجائے انہیں فرقوں میں تقسیم کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی تحریکیں معاشرے کو مزید فرقوں میں تقسیم کرکے اسے کمزور کرتی ہیں۔ طاقتور نہیں۔

○○

تاریخ نویسی

سماجی و معاشرتی علوم میں تاریخ کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ وہ علم ہے جو قوموں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت اور محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک طرف تو معاشرے کو وسیع النظر اور وسیع القلب بنایا جاسکتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعے ذہنوں میں نفرت و عناد اور تنگ دلی کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اسی لئے علم تاریخ ایک خطرناک اور مہلک ہتھیار ہے۔ اگر یہ تنگ نظر اور متعصب حکمرانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ اس کے ذریعے پورے معاشرے کو تنگ اور اندھیرے راستے پر ڈال دیتے ہیں کہ جس میں مقید و محصور ہو کر معاشرہ ارد گرد کے حالات واقعات سے بے خبر رہتا ہے۔

اس مرحلے پر ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ہاں تاریخ کو جس انداز سے لکھا جارہا ہے وہ صحیح ہے؟ کیا یہ تاریخی علم ہمیں دنیا' انسانیت اور ہماری تاریخ کے بارے میں کوئی شعور دے رہا ہے؟ کیا ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہماری نسل تاریخ کے اس عمل کی بنیاد پر فہم اور ادراک حاصل کرسکے گی؟

اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ نویسی کا پس منظر' اس کے اہم رجحانات' اس کی ساخت و موضوعات اور اس کی تعبیر و تفسیر کا جائزہ لیں۔

ہماری تاریخ نویسی کا پس منظر

ہماری تاریخ نویسی کا سرمایہ اس وقت ہمارے پاس تین قسموں میں ہے۔ عہد سلاطین و عہد مغلیہ کی تاریخ نویسی' عہد برطانیہ کی تاریخ نویسی' اور برصغیر کی آزادی کے بعد کی تاریخ نویسی۔ ان تینوں قسموں کی تاریخ نویسی کی کیا کیا خصوصیات ہیں؟ اور انہیں کن رجحانات کے تحت لکھا گیا ہے؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لئے ان کا مختصر تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے برصغیر میں باقاعدہ تاریخ نویسی

کا رواج ہوا۔ لیکن یہ تاریخ نویسی نظام حکومت کی وجہ سے ایک مخصوص دائرے میں محدود رہی کیونکہ بادشاہی نظام حکومت میں تمام سیاسی قوت و طاقت بادشاہ کے ہاتھ میں رہتی ہے اس لئے ہماری تاریخ نویسی بھی اس کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے۔ ان تاریخوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کی عظمت کو عوام کے ذہنوں میں بٹھایا جائے۔ اور اس کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس کانام رہتی دنیا تک باقی رہے۔ چنانچہ یہ تمام تاریخیں بادشاہ کی شخصیت کو مرکز بنا کر اس کی بہادری ' شجاعت 'فیاضی اور سخاوت کی داستانیں بیان کرتی ہیں یہ تاریخیں ایک خاص مقررہ ڈھانچے میں تشکیل دی گئی ہیں اس کے اہم موضوعات بادشاہ' امراء اور علماء ہیں' عوام کو اس سے قطعی خارج کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان تاریخوں میں صرف جاگیردارانہ ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ عوامی ثقافت کے بارے میں یہ خاموش ہیں۔

ان تاریخوں میں دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دارالسلطنت یا دارالحکومت کی تاریخیں ہیں جہاں بادشاہ اور اس کا دربار ہوا کرتا تھا۔ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کی سرگرمیوں سے یہ تاریخیں خالی ہیں۔

ان تاریخوں کی یہ اہمیت ضرور ہے کہ ان کے ذریعے ہم بادشاہوں کی شخصیت' ان کے عہد میں ہونے والی جنگوں ' انتظامی اصلاحات مذہبی تحریکوں' امراء کی سماجی و معاشی زندگی اور دربار میں تخلیق ہونے والے ادب' شاعری' مصوری' موسیقی اور تعمیرات سے واقف ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تاریخیں معاشرے کی پوری تصویر پیش نہیں کرتیں۔ یہاں عوام کی زندگی ' دیہاتوں کے رسوم و رواج 'عوامی موسیقی' میلے ٹھیلے' لوک گیت و لوک کہانیاں موجود نہیں۔ یہ طبقہ خواص کی نمائندہ ہیں عوام کو ان کے صفحات پر بازیابی کی اجازت نہیں۔

دوسرے درجے میں تاریخیں آتی ہیں جو برطانوی عہد میں نوآبادیاتی نقطہ نظر سے لکھی گئیں: برطانوی مورخین کا اولین مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اپنی حکومت کی اخلاقی بنیادیں فراہم کی جائیں اور ہندوستان کے عوام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جائے کہ ان پر اب تک جن حکمرانوں نے حکومت کی وہ آمر' جابر 'غاصب' عیاش اور نکمے تھے۔ اور ان کا دور حکومت جہالت و اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا بد قسمتی سے آخری عہد مغلیہ میں ہندوستان اس قسم کے حالات اور سیاسی انتشار سے گزرا تھا اس لئے لوگوں کے ذہن تاریخ کے اس مفہوم کے لئے تیار تھے۔ تاریخ کے اس مفہوم نے برطانوی افسروں اور عہدیداروں میں احساس برتری کو پیدا کیا اور ان میں اس مشنری جذبے کو پیدا کیا کہ ہندوستان کو بربریت و جہالت سے

نکل کر' مہذب و جدید بنانے کی ذمہ داری قدرت نے انہیں دی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کی بدعت سب سے پہلے جیمس مل (JAMES MILL) نے شروع کی۔ جس نے ہندوستان کی تاریخ کو مذہبی اعتبار سے ہندو' اسلامی اور برطانوی ادوار میں تقسیم کیا دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانوی عہد کو عیسائی نہیں لکھا' جبکہ پہلے دو ادوار کو مذہبی اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کی یہ تقسیم ہر اعتبار سے غلط اور گمراہ کن ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو دور کہنا تاریخی غلطی ہے کیونکہ اس طرح بدھ مت' جین مت اور دوسرے مذاہب کو بالکل نظر انداز کردیاگیا۔ اسی طرح شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پورا ہندوستان ان کے زیر اقتدار نہیں آیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہندو سلطنتیں آخری وقت تک قائم رہیں۔ مذہبی بنیاد پر تاریخ کی اس تقسیم نے ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دی کیونکہ یہی وہ بنیادیں تھیں جن پر آگے چل کر ہندو مورخین نے قدیم ہندوستان کی عظمت میں اپنی تخلیقی قوتیں صرف کیں تو مسلمان مورخین ہندوستان میں اسلامی عہد کی برکتوں کی تلاش میں رہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ یہ تاریخی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ ہمارے مورخین نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ آج تک ہر تاریخ انہی ادوار میں تقسیم ہوکر ترویج دی جاتی ہے اور ابتداء ہی سے ہمارے ذہنوں کو مسموم کردیتی ہے۔

برطانوی عہد کی تاریخ نویسی میں دو رجحانات نمایاں ہیں' انگریزوں کی تہذیبی اور نسلی برتری اور ان کے سامراجی عزائم۔ چنانچہ ان تاریخوں میں جو انہوں نے لکھیں یا ہندوستانی مورخین سے لکھوائیں ساری برائیوں کا الزام ہندوستانی حکمرانوں اور ان کی حکومتوں پر ہے۔ جب بھی انہیں کسی ریاست پر قبضہ کرنا ہوتاتھا تو اس کے بارے میں یہی تاثر دیا جاتا کہ ان کے حکمران نالائق و عیاش ہیں اور ریاست میں انتظامی خرابیاں ہیں۔ ان بنیادوں پر وہ اپنے اقتدار کو جائز قرار دیتے اور عوام کو ذہنی طور پر اپنی حکومت کے لئے تیار کرتے۔

برطانوی مورخین نے ہندوستان کی مختلف اقوام کے بارے میں جو رائیں دی ہیں' اس کے پس منظر میں بھی ان کے استعمارانہ نظریات تھے مثلاً" بنگالیوں کو تخریب پسند' شورش پسند اور باغی کہا گیا کیونکہ انہوں نے ہمیشہ قائم شدہ حکومتوں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اس لئے یہ ثابت کیا گیا کہ بنگالی کبھی کسی حکومت کے وفادار نہیں رہے۔ بنگالیوں کے بارے میں یہ تاریخی تاثر ہمیں ورثے میں ملا اور ہمارے ہاں یہ نظریہ بڑا مقبول رہا۔

خصوصیت سے بنگلہ دیش کی تحریک نے اس نظریے کو مزید تقویت دی' جبکہ اسباب کا

تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ بنگالیوں کی شورشیں' اور بغاوتیں ان کے سیاسی شعور کا نتیجہ تھیں کہ جنہوں نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور خاموشی سے وفاداری کی بجائے اپنے حقوق کی جنگ کی' جو ان کی کمتری نہیں بلکہ عظمت کی نشانی ہے۔ ان کی تمام بغاوتیں ان کی بیداری' آزادی اور حریت کی علامتیں ہیں جو انہیں دنیا کی باشعور قوموں میں اونچا مقام دیتی ہیں۔

اسی طرح جنگ جو اور غیرجنگ جو قوم و نسل کا تصور بھی برطانوی استعمار کی پیدا کی ہوئی چیز ہے جن اقوام نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کے اقتدار کو قائم کرنے میں مدد کی وہ جنگ جو کہلائیں۔ اور جنہوں نے اس کی مزاحمت کی وہ باغی و تخریب کار۔

برطانوی حکومت کے قیام اور سیاسی شکست نے ہماری تاریخ نویسی کو بھی متاثر کیا۔ ہم اپنی تاریخ نویسی میں دو رجحانات خصوصیت سے دیکھتے ہیں: ماضی کی شان وشوکت تاکہ ہمارے احساس کمتری کو اس کے ذریعے کم کیا جائے' اور معذرت خواہانہ انداز تاکہ جو اعتراضات ہم پر کئے گئے ہیں ان کی معذرت خواہانہ توجیہہ بیان کی جائے۔ اولین رجحان کی نمائندہ تحریک دارالمصنفین کی تھی' اس تحریک کے بانی شبلی اور ان کے رفقاء نے اسلام کی عظمت اور شان وشوکت کو ابھارنے کے لئے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ان کا مقصد یہ تھا کہ اس تصور کو مقبول بنایا جائے کہ دنیا کی تہذیب پر سب سے زیادہ اثر اسلام اور مسلمانوں کا ہے۔ اس اسکول کے مورخین کے ہاں تاریخ محض "بیانیہ" ہے تجزیاتی نہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تاریخ کی تعبیر محض تعریفی ہے مجموعی طور پر انھوں نے بے روح اور خشک تاریخیں لکھی ہیں جو کسی بھی طرح ہمارے تاریخی شعور میں کوئی حصہ نہیں لیتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں معذرت خواہانہ طرز تحریر تاریخ نویسی میں آیا جس نے مغربی مورخین کے اعتراضات کا جواب معذرت کے انداز میں دیا' اس میں سید احمد خان اور امیر علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہماری تاریخ نویسی میں تیسرا رجحان قومیت کا ہے۔ مغربی تعلیم اور جدید مغربی نظریات و افکار سے واقف ہندوستانی تعلیم یافتہ مورخین نے اپنی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کی' جہاں قدیم ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق ہوئی وہاں مسلمانوں کے عہد کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ خصوصیت سے "الہ آباد یونیورسٹی سکول" کے مورخین نے عہد سلاطین و عہد مغلیہ پر تحقیقی کام کرکے مسلمانوں کے عہد کی عظمت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ قومیت کے جذبات کے تحت لکھی جانے والی تاریخوں میں ہندو مسلمان اتحاد نظر آتا ہے۔

تاریخ اور سیاست

برطانوی اقتدار کے خلاف تحریک آزادی سے لے کر قیام پاکستان اور اس کے بعد موجودہ دور تک ہماری تاریخ سیاست کے زیر اثر لکھی جاتی رہی ہے۔ سیاست دانوں نے اپنے عزائم کو پورا کرنے کے لئے جو لائحہ عمل بنایا' ہمارے مورخین نے اس کی تکمیل میں تاریخ کو استعمال کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ اور سیاست ایک ہی راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور یہی تاریخ کے لئے ایک المیہ ثابت ہوا۔ جس طرح درباری مورخین دربار کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اسی طرح ہمارے جدید مورخ سیاست دانوں کے نظریات و افکار میں گرفتار' اہل اقتدار کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جس طرح درباری تاریخ نویسی تنگ نظری کا شکار ہوکر تاریخ کا وسیع مفہوم نہ دے سکی۔ اسی طرح ہماری جدید تاریخ نویسی نفرت و فرقہ واریت کے جذبات کا شکار ہوکر' وسیع القلبی اور وسیع النظری کی تعلیم نہیں دے سکی۔ ہمارا مورخ بااقتدار سیاستدانوں کا تابع ہوکر' اپنی آزادی اور حقیقت پسندی کو کھو بیٹھا۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری جدید تاریخ نویسی میں کوئی تنوع نہیں رہا۔ ان کے لئے ایک فارمولا وضع کر لیا گیا ہے اور ہر مورخ اسی کے تحت تاریخ لکھنے میں مصروف ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ ایک ریکارڈ سے صرف کیسٹ تیار ہورہے ہیں۔ اسی لئے ہماری تاریخ ایک بے جان' خشک اور غیر دلچسپ چیز بن کر رہ گئی جس کا اسلوب تحریر دلائل اور واقعات کے بیان کا انداز نہ تو ہماری حس کو متاثر کرتا ہے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کا تاثر چھوڑتا ہے تاریخ کو سیاسی' سماجی اور معاشی پس منظر میں دیکھنے اور تحریر کرنے کی بجائے اسے صرف اہل اقتدار سیاستدانوں کے محدود اور تنگ نظر نظریات کی روشنی میں پرکھا اور صحیح ثابت کیا جاتا ہے۔

تاریخ اور شخصیتیں

ہماری جدید تاریخ نویسی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں عوام کی خواہشات و جذبات اور مفادات کو نظر انداز کرکے شخصیتوں کے گرد تقدس کا ہالہ بنا کر ان کے کارناموں کی تفصیلات دی جاتی ہیں اور وہ لوگ جن کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا انہیں عوامی راہنما کا خطاب دے کر ان کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں یہاں ایک اہم سوال یہ

پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ تاریخ سوائے شخصیتوں ' ان کے حالات زندگی اور ان کے نظریات کے علاوہ کچھ نہیں؟ اگر ہم اس سوال کا تجزیہ کریں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کر آتی ہے کہ ہماری تاریخ میں یہ شخصیتیں اس لئے ہیں کہ ہماری تاریخ اقلیت کی تاریخ ہے۔ یہ امراء' زمینداروں' جاگیرداروں کی تاریخ ہے اس میں نہ تو عوام کو شامل کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی ان کی سرگرمیوں کو اہمیت دی گئی ہے اس لئے اگر ان شخصیتوں کو ہماری تاریخ سے نکال دیا جائے تو یقیناً ہمارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لئے ان شخصیتوں کے گرد تقدس کا ہالہ بنا دیا جاتا ہے تاکہ کوئی ان کے نظریات و افکار کو چیلنج نہ کرسکے اور انہوں نے جو مراعات اپنے طبقے کے لئے حاصل کی ہیں انہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جاسکے۔

تاریخ اور عقیدت

ہماری تاریخ نویسی عقیدت کے جذبات سے بڑی متاثر ہوئی ہے۔ اسی لئے ہماری تاریخ کا بیشتر حصہ عقیدت کے جذبات کے تحت لکھا گیا ہے۔ ہمارا مورخ عام طور پر مذہبی ' سیاسی' معاشرتی یا نسلی عقیدت کا شکار ہوتا ہے۔ عام طور سے تو اس کا مطمع نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ عقیدت مندی کے تحت کسی شخصیت اور اس کے کارناموں کو تحریر کرے۔ یا کسی تحریک کا تاریخی جائزہ لے۔ اس عقیدت مندی میں کبھی کبھی نظریات کا ٹکراؤ بھی ہوجاتا ہے اور مختلف مسلک کے مورخ' عقیدت مندی کے تحت اپنے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری تاریخ نویسی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً سید برادران جنہیں بادشاہ گر بھی کہا جاتا ہے۔ شیعہ مورخ محض شیعہ ہونے کے سبب انہیں تاریخ میں اعلیٰ مقام دیتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔

سید احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی شخصیتوں اور تحریکوں کو محض عقیدت سے لکھا جاتا ہے اور ان تحریکوں کا سیاسی معاشی اور سماجی تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عقیدت مندی کے تحت لکھی جانے والی تاریخیں کوئی معروضی نقطہ نظر پیش نہیں کرتیں بلکہ ان میں اکثر واقعات کو مسخ کرکے کے اپنی پسند کی شخصیت کو ابھارا جاتا ہے۔ دارالمصنفین کے تمام مورخین کی تاریخیں اسی عقیدت مندی کے تحت لکھی گئی ہیں۔ غلام رسول مہر کی "حیات سید احمد شہید" بھی اسی قسم کی تاریخ نویسی کا ایک نمونہ ہے۔ خصوصیت سے اسلامی تاریخ پوری کی پوری اسی عقیدت مندی کے تحت لکھی گئی ہے اور اس کا کوئی تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مورخ

تخلیق کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

تاریخ اور فرقہ واریت

لیکن تاریخ نویسی کا سب سے خطرناک پہلو فرقہ واریت ہے جس نے تاریخ کو مسخ و مجروح کرکے تاریخ کی ساخت اور ماہیت کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستانی سیاستدانوں نے فرقہ واریت کو ہوا دی جس کے نتیجے میں تاریخ نویسی میں بھی ان رجحانات کو اختیار کیا گیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے علیحدہ علیحدہ ہیرو بنائے گئے۔ دونوں جانب سے متعصب مورخین نے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کردیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں محمد بن قاسم' محمود غزنوی اور اورنگ زیب ہیرو قرار پائے' تو ان کے ہاں پرتھوی راج' رانا پرتاب اور شیوا جی ہیرو ٹھہرے' فرقہ واریت کے جذبات نے تاریخ کی صحیح تشریح اور حقائق کی چھان بین میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اسی لئے آخری عہد مغلیہ میں مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کی قومی تحریکوں کو محض بغاوتیں کہہ کر ان کی اہمیت کو گھٹایا گیا۔

ہماری جدید تاریخ بھی انہی فرقہ وارانہ جذبات کے تحت لکھی جارہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ محض نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کررہی ہے۔

تاریخ نویسی کے ان رجحانات کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں تحمل اور رواداری کے جذبات مفقود ہوگئے ہیں اور اسی لئے ہمارے معاشرے میں معروضی تاریخ کی تعبیر اور تفسیر ناممکن ہوگئی ہے۔ اگر دوسرے مورخ ہماری تاریخ کا معروضی تجزیہ کرتے ہیں تو ہم انہیں اپنا دشمن کہہ کر ان کی کتابوں پر پابندی عائد کرادیتے ہیں ہم تاریخ میں صرف وہی پڑھنا چاہتے ہیں جو ہمیں پسند ہے۔

اگر کوئی مورخ تاریخ کا تنقیدی جائزہ لینے کی جرأت کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ہر طبقے' اقلیت اور مسلک کو ماننے والوں کے جذبات مجروح ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ سیاسی و دینی حمیت کا بھی ڈر رہتا ہے۔

اسی لئے ہمارے مورخین ایک بے روح بے جان اور غیر دلچسپ تاریخ کو بار بار دہرانے کا کام کررہے ہیں۔ یہ وہ تاریخیں ہیں جو کسی بھی صورت میں ہمارے معاشرے کی تشکیل میں کوئی موثر کردار ادا نہ کرسکیں گی۔

تاریخ کی تعبیر

ایک مورخ کی ذمہ داری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ معاشرے میں پیدا ہونے والے بحران کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ بحران کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس کے پس منظر میں ہونے والے عوامل کو دیکھا جائے۔ کیونکہ اگر معاشرے میں پیدا ہونے والے بحرانوں کا تجزیہ نہ کیا جائے اور محض انہیں بیان کر دیا جائے تو یہ معاشرے کو کوئی شعور نہیں دے گا۔ اس کا تنقیدی جائزہ معاشرے کے ذہن کو شعور دیتا ہے۔ اور اس کی روشنی میں معاشرے کی آئندہ تعمیر و تشکیل ہو سکتی ہے۔

ہمارے مورخین نے ابتداء ہی سے بحرانوں کا جو تجزیہ کیا اس نے معاشرے کو صحیح راستہ پر ڈالنے کی بجائے غلط راستہ پر ڈال دیا۔ مثلاً ابتدائی اسلامی تاریخ لکھتے وقت جب حکومت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو بیان کیا گیا تو ان تمام تحریکوں میں ہمارے مورخین کو یہودیوں کا ہاتھ نظر آیا۔ چنانچہ ہمارے مورخین کے تجزیے کے مطابق مسلمانوں کے اولین دشمن یہودی ٹھہرے۔ جنہوں نے ہماری تباہی و بربادی میں ہمیشہ حصہ لیا۔ ابتدائی اسلامی تاریخ میں عبداللہ بن سبا کی شخصیت انتہائی پر اسرار کردار کی شکل میں ابھرتی ہے۔ جس نے یکہ و تنہا بڑے بڑے صحابہ کو اپنی سازشوں میں الجھا کر سیاسی بحران پیدا کئے۔ اس کے بعد سے مسلمان مورخین کا یہ پسندیدہ موضوع رہا اور ہر تحریک' ہر فساد اور ہر گڑ بڑ میں انہیں یہودی نظر آتے رہے۔

یہودیوں کے بعد ہمارے دشمن' باطنی و قرامطی ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچائے۔

ہمارے دشمنوں میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب یورپی اقوام نے ایشیا و افریقہ میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا اور اکثر مسلمان ممالک ان کے زیر اثر آگئے چنانچہ اس کے بعد سے یورپی اقوام ہمارا ہدف بنیں۔ چنانچہ جب بھی ہندوستان کی جدید تاریخ لکھی جاتی ہے تو اسمیں اہل ہندوستان کی شکست انگریزوں کی چالبازی' فریب اور چالاکی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہماری معاشی سماجی اور سیاسی زندگی میں جو بھی خرابیاں ہیں ان کے ذمہ دار بھی انگریز اور یورپی اقوام ہیں۔

جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو اس وقت ہمارے دشمنوں میں ہندوؤں کا بھی اضافہ ہوا۔ اس کے بعد سے انگریز اور ہندو ہمارے خطرناک دشمن بن گئے جو ہماری تباہی و بربادی میں حصہ لے رہے ہیں اور ہمیں مسلسل

بحرانوں میں الجھائے ہوئے ہیں۔

بر صغیر سے انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو تنہا ہمارے دشمن رہ گئے۔ چنانچہ بنگلہ دیش میں جو کچھ ہوا اس کی ساری ذمہ داری وہاں کے ہندوؤں پر ڈال دی گئی۔ جنہوں نے بنگلہ دیش کی قومی تحریک کو پروان چڑھایا اور یہ انہیں کی سازش کا نتیجہ تھا کہ بنگلہ دیش آزاد ہوا۔

چنانچہ اس وقت ہمارے دشمنوں میں یہودی' یورپی اقوام ' ہندو کمیونسٹ اور عالمی طاقتیں ہیں۔

تاریخ کی اس تعبیر سے اول تو یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ اگر واقعی ان عناصر نے مسلمانوں کو ہمیشہ بحران میں رکھا اور ان کے خلاف ہر تحریک کو کامیابی سے چلایا تو کیا مسلمان قوم اس قدر بے وقوف اور نادان تھی کہ ان کے فریب میں آتی رہی اور مسلسل بے توف بنتی رہی؟ تاریخ کی اس تعبیراور تفسیر سے تو پوری مسلمان قوم انتہائی احمق قرار پاتی ہے جن میں اتنی بھی سمجھ اور عقل نہ تھی (اور نہ ہے) کہ وہ اپنے دشمنوں کو پہچان سکتے اور ان کی سازشوں کا تدارک کرسکتے' ظاہر ہے کہ تاریخ کی اس تعبیر کو ہم صحیح تسلیم نہیں کرسکتے کیونکہ ہمارے بحرانوں اور ہمارے زوال کے عمل میں کئی دوسرے عوامل نظر آتے ہیں کہ جن سے ہمارے مورخین نے چشم پوشی کی اور حقیقت سے گریز کرکے لوگوں کے ذہن کو دوسری طرف ڈال دیا اور معاشرے میں پیدا ہونے والے بحرانوں اور خرابیوں کے ظاہری دشمن پیدا کرکے اصل دشمن کو چھپا لیا۔

مثلاً" جب کسی بحران کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں کوئی عنصر کام کرتا نظر نہیں آتا بلکہ اس میں مختلف سیاسی ' سماجی و معاشی عوامل ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے اس کے تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً" جب ایرانی مسلمان ہوئے تو انہیں معاشرے میں مساوی درجہ نہیں ملا تو "موالی " شیعہ تحریک کے ساتھ ہوگئے اور اپنے حقوق کے لئے جنگیں لڑیں۔ اسی طرح جب عباسی عہد میں کسانوں کا طبقہ مظلومیت کا شکار ہوا تو اس نے باطنی تحریک میں حصہ لیا اور اہل اقتدار کے خلاف جنگ شروع کی۔ بنگلہ دیش کی تاریخ ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے جہاں سرمایہ داروں اور حکمرانوں نے جو استحصال کیا اس کے نتیجے میں وہاں قومی تحریک شروع ہوئی اس لئے ہمارے معاشرے میں ہماری تباہی و بربادی کا اصل ذمہ دار ہمارا حکمران طبقہ رہا۔ جس نے اپنے مفادات کی خاطر معاشرے کی تباہی میں حصہ لیا۔ چونکہ ہمارے مورخین اسی طبقے کے ملازم تھے اور انہیں کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے اس لئے انہوں

نے اس سے توجہ ہٹا کر ساری ذمہ داری دوسرے عناصر پر ڈال دی۔

ہماری جدید تاریخ نویسی میں انگریز دشمنی کے جذبات بڑے گہرے ہیں اس میں انگریز اقتدار کا صحیح تجزیہ کرنے کی بجائے انتہائی غیر منطقی انداز میں ان کے تاریخی کردار کو بیان کیا گیا ہے مثلاً" ہمیشہ سے تاریخ کی ابتداء اس طرح سے کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں انگریز بحیثیت تاجر کے آئے اور پھر چالاکی و فریب سے یہاں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرلیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ملک پر سیاسی اقتدار قائم کرنا اتنا آسان و سہل ہے؟ اور اگر یہ فارمولا اس قدر سہل اور آسان تھا تو ہم نے اس قسم کی کوشش کیوں نہ کی یورپ پر قبضہ کیوں نہیں کر لیا؟ اس بات کے تجزیے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ انگریزوں اور یورپی اقوام کی آمد کے وقت ہندوستان کی جو سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالت تھی اس کا جائزہ لیا جاتا اور پھر اس کی روشنی میں یورپی اقوام کی کامیابی اور اہل ہندوستان کی شکست کا بہتر تجزیہ کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً" ایک اہم نقطہ جس کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی وہ یہ ہے: کہ ابتداء میں یورپی تاجروں کی آمد سے ہندوستان کو اقتصادی طور پر فائدہ پہنچا کیونکہ یہ تاجر سونا چاندی کے سکوں کے عوض' نقد ادائیگی کے بعد یہاں سے سامان خریدتے تھے اور پھر اسے یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے اس وقت ہندوستان صنعتی لحاظ سے یورپ سے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن ہندوستانی حکمرانوں نے اس موقع سے نہ کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ ہی صنعتوں میں مزید ترقی کی کوشش ہوئی ' نہ بحری راستے دریافت ہوئے اور نہ ہی بحری بیڑا بنایا گیا۔ یورپ میں سیاسی و معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں آتی گئیں جبکہ ہمارا معاشرہ منجمد اور ساکت رہا یہاں تک اس کی سختی نے اس میں ٹوٹ پھوٹ پیدا کرکے اسے زوال پذیر بنادیا۔

ہمارے مورخ انگریزوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے دھوکہ اور چالبازی سے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار بڑھایا لیکن وہ اس بات کا تجزیہ نہیں کرتے کہ انہیں یہ مواقع کس نے دیئے؟ یہاں ہندوستان کی معاشی حالت' اور طبقاتی تقسیم کے ذریعے پیدا ہونے والی خرابیوں کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔ جس نے بے روز گار اور محروم طبقے کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ روزی کی خاطر انگریزوں کی ملازمت کرے۔ اور ان کے لئے اپنے ہم وطنو سے جنگ کرے۔ یہاں اس تجزیئے کی بھی ضرورت ہے کہ اگر کسی طبقے کو مراعات سے محروم کردیا جائے تو پھر اس میں نہ تو قوم سے محبت ہوگی نہ ملک سے اور نہ معاشرے سے۔ کسی بھی ایسے معاشرے میں جہاں اکثریت محرومیت کا شکار ہوگی اسے کبھی بھی معمولی ضرب سے پاش پاش کیا جاسکتا ہے اگر ہمارے دشمنوں نے ہمارے خلاف سازشیں کرکے

ہمیں نقصانات پہنچائے تو اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ ہم نے اپنے معاشرے میں اکثریت کو انصاف' حقوق اور مراعات نہ دیں یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کی اس تعبیر اور تفسیر نے ہماری تمام تنقیدی صلاحیتوں کو ختم کردیا اور ہم نے اپنے بارے میں کبھی صحیح تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آج بھی ہم اپنے ہر بحران کو کبھی سپرپاور کی ریشہ دوانی قرار دیتے ہیں تو کبھی اس میں ہمیں کسی غیر ملک کا ہاتھ نظر آتا ہے تو کبھی ہندو مورد الزام ٹھہرتے ہیں تو کبھی یہودی اور کیمونسٹ ۔ تاریخ کی یہ تفسیر اپنی "معصومیت" کی تفسیر ہے اور تاریخ کا یہ مفہوم ہمیں غلط راستے پر لے جارہا ہے۔

تاریخی ساخت اور موضوعات

ہماری تاریخ نویسی' حکمران خاندانوں کی تاریخ بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے: اس لئے یہ تاریخ ایک مخصوص نمونے اور فارمولے کے تحت لکھی گئی ہے: مثلاً" حکمران خاندان' اس کا بانی' ہر بادشاہ کا دور حکومت' تخت نشینی' جنگیں' فتوحات ' شکستیں' بغاوتیں ' اصلاحات' سیاسی انتشار' حکمران خاندان کا زوال اور اس دور کی مشہور شخصیتوں کے تذکرے' ایک خاندان کے بعد دوسرے خاندان آتے رہتے ہیں اور تاریخی بیان جاری رہتا ہے۔

تاریخ نویسی کی یہ ساخت اور موضوعات انتہائی محدود اور تنگ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہماری تاریخ صرف ماضی کی سیاست بن کر رہ جاتی ہے اور اس کا دائرہ کار صرف حکمران اور دربار کی سرگرمیوں و رسومات تک محدود ہوجاتا ہے۔

یہاں ان موضوعات کا تجزیہ کریں گے جو ہماری تاریخ نویسی میں بار بار آتے ہیں ۔ اور جن سے معاشرے کے ذہن میں تاریخ کا ایک خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

سنہری دور

ہماری تاریخ نویسی میں سنہری دور کی اصطلاح کو عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے سہارے معاشرے کو ایک مثالی معاشرے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں امن و امان کا دور دورہ تھا' جہاں خوش حالی و فارغ البالی تھی اور جہاں سماجی و معاشرتی اقدار کی جڑیں بڑی گہری تھیں۔ سنہری دور کے ذکر میں علم و ادب کی ترقی تعمیری سرگرمیاں' دولت کی فراوانی اور طبقاتی ہم آہنگی کا ذکر ہوتا ہے۔ عام طور سے مورخ ہمیں

یہی تاثر دیتا ہے کہ یہ ذکر پورے معاشرے کا ہے۔ لیکن تاریخی حقائق اس کے خلاف ہوتے ہیں تاریخ کے کسی بھی سنہری دور میں عام انسان کی محنت و مشقت میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ اس طرح زندگی کی محرومیوں سے دوچار رہا جیسے کہ عام حالات تھا۔ مثلاً" شاہ جہاں کے عہد کو تاریخ میں سنہری دور کہا جاتا ہے جبکہ خوبصورت' نازک اور عالیشان عمارتیں بن رہی تھیں' دربار میں ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا' امراء کی زندگی آسائشوں سے بھرپور تھی' غلاموں 'کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی بہتات تھی' لیکن اسی عہد میں قحط بھی پڑ رہے تھے' لوگ بھوک اور فاقے سے مر رہے تھے' اور محنت و مشقت کے باوجود لوگ بنیادی ضروریات سے محروم تھے۔

اس لئے سنہری دور کا تصور ایک محدود طبقے کی نمائندگی کرتا ہے پورے معاشرے کی نہیں ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب کہ خوش حالی اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک آئی ہو۔

طبقاتی احساس

ہماری تاریخیں چونکہ طبقے کی ہوتی ہیں اس لئے ان میں اسی طبقے کی زندگی اور ثقافت ہوتی ہے۔ ہماری ان تاریخوں سے امراء زمینداروں اور جاگیرداروں کی جو تصویر ابھر کر آتی ہے اس میں یہ نیکی کے مجسمے' اور اخلاقی خوبیوں کے پیکر نظر آتے ہیں تاریخ میں ان کی سخاوت و فیاضی کی داستانیں ہوتی ہیں غریبوں کی مدد کے تذکرے ہوتے ہیں سراؤں' مسجدوں اور باغات کی تعمیرات کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ ان کی سماجی و معاشرتی زندگی کے سلسلے میں پر آسائش و شان و شوکت والی زندگی کی جھلکیاں ہوتی ہیں' ادیبوں شاعروں کی مدد کا ذکر ہوتا ہے' اور ان کی محفلوں کے رومان پرور تذکرے ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور زندگی کی یہ تصویر ہمارے معاشرے کے ذہنوں کو مرعوب کردیتی ہے۔ اور عوام میں احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔

ہمارے مورخین کبھی اس بات کا تجزیہ نہیں کرتے کہ ان امراء کے پاس یہ دولت کن ذرائع سے آئی؟ انہوں نے دولت کے یہ ذخیرے کیسے جمع کئے؟ کیا یہ دولت ٹیکسوں' جرمانوں اور عوام کی محنت کی کمائی ہوئی دولت نہ تھی جسے جبرو تشدد اور اپنے بنائے ہوئے قانون کی مدد سے انہوں نے حاصل کیا؟ تاریخ کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ناجائز ذرائع سے دولت جمع کی جائے اور اس کا ایک حصہ خیرات کرکے دنیا میں سخی و فیاض کے نام سے مشہور

ہوا جائے۔

ہماری تاریخ میں شخصیتوں کو اور ان کے کرداروں کو ایک خاص پیمانے سے ناپا جاتا ہے اور اکثر اس کے مذہبی اوصاف کا ذکر کر کے اس کی عظمت و بڑائی کا تعین کیا جاتا ہے۔ مثلاً" پنج وقتہ نمازی' روزے دار' قرآن شریف کی تلاوت کرنے والا' تہجد گزار اور علماء کی قدر کرنے والا لیکن اس کا تجزیہ نہیں کیا جاتا کہ اس کا سلوک اپنے ملازمین کے ساتھ کیسا تھا اور اس نے رعیت کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ عام طور سے اس کے مذہبی اوصاف کی وجہ سے اس کی عوام دشمنی کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔

جنگیں

ہماری تاریخ کا ایک اہم موضوع جنگ ہوتا ہے جسے ہمارا مورخ بڑی تفصیل سے لکھتا ہے۔ سپاہیوں کی تعداد' سپہ سالار' اور جنرلوں کی جنگی تدابیر' ہتھیاروں کی اقسام' میدان جنگ کا نقشہ' قتل و خونریزی وغیرہ وغیرہ لیکن اس بات کا تجزیہ کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی کہ یہ جنگیں کیوں لڑی گئیں؟ کیا ان کا مقصد ذاتی اقتدار' دولت کی ہوس' اور کمزور ہمسایہ ملک پر قبضہ کرنا تھا یا یہ جنگیں کسی اعلیٰ اخلاقی مقصد کے لئے لڑی گئیں؟ یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ملک پر حملہ ہوا اور اس نے دفاعی جنگ لڑی تو کیا اسے وطن کا ہیرو کہیں گے؟ اور کیا یہ جنگ اس نے وطن کے تحفظ کے لئے لڑی یا اپنے اقتدار کو بچانے اور مراعات کو محفوظ رکھنے کے لئے! یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شخصی نظام حکومت میں لڑی جانے والی جنگیں ذاتی جنگیں ہوا کرتی تھیں' اگر ایک حکمران اپنے اقتدار کی وسعت چاہتا تھا تو دوسرا اس کا تحفظ' دونوں جانب سے عوام کو مذہب اور اعلیٰ اصولوں کے نام پر قربان کیا جاتا تھا۔ ان جنگوں کا صحیح پس منظر اور تجزیہ یقیناً ہمارے شعور کی ترقی میں مددگار ہو گا۔

فتوحات

ہماری تاریخ نویسی میں فتوحات وہ موضوع ہے جو ہمارے معاشرے میں بے جا فخر و غرور کے احساسات کو پیدا کرتا ہے۔ عام طور سے ہمارا مورخ فتح کا تذکرہ بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے جس میں خوشی و مسرت کے ساتھ دشمن کی تذلیل بھی شامل ہوتی ہے لیکن جب مورخ شکست کو بیان کرتا ہے تو اس کے قلم سے غم و اندوہ کے جذبات ٹپکتے ہیں۔ ضرورت

اس بات کی ہے کہ فتح کا صحیح تجزیہ پیش کیاجائے کہ ان فتوحات سے کس کو فوائد حاصل ہوئے؟ مال غنیمت کس کو ملا لوٹ مار میں کس نے زیادہ فائدہ اٹھایا؟ کسی ملک کی فتح کے بعد اس ملک کی زمینوں اور خزانوں پر کس نے قبضہ کیا؟ یقیناً حکمران طبقے نے ہمیشہ فتوحات سے فائدہ اٹھایا جبکہ عام سپاہیوں کو ان جنگوں میں محض ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اسی ضمن میں یہاں اس بات کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان جنگوں اور فتوحات کے نتیجے میں حکمران طبقے کی بہادری و شجاعت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ شجاعت و بہادری کا یہ منفی تصور انسانوں کی خونریزی کے نتیجے میں تھا جس نے زیادہ سے زیادہ انسانوں کا خون بہایا ہو اسے ہم اتنا ہی شجاع اور بہادر تسلیم کرتے ہیں۔

بغاوتیں

جب بھی ہمارے مورخ کسی بادشاہ کے عہد میں ہونے والی بغاوتوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان بغاوتوں کا ذکر انتہائی حقارت سے کیا جاتا ہے اور باغیوں کو شورش پسند' تخریب کار اور حکومت و حکمرانوں کا دشمن کہا جاتا ہے اکثر ان بغاوتوں کے پس منظراور ان کی اصلی وجوہات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کبھی اس اہم سوال کا تجزیہ نہیں کیا جاتا کہ لوگ بغاوت کیوں کرتے ہیں؟ اور وہ بھی اپنے سے زیادہ طاقتور کے خلاف' جس میں انہیں اکثر اپنی شکست کا بھی یقین ہوتا ہے۔ ہمارے مورخین نے اکثر باغیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جنہوں نے جرات و ہمت کے ساتھ اپنے حقوق کے لئے جنگیں لڑیں اور جانیں دیں۔ انہوں نے شجاعت و بہادری کا منفی نہیں بلکہ مثبت تصور دیا۔ یہ لوگ شورش پسند' دہشت پسند اور تخریب کار نہیں تھے بلکہ حق و انصاف کی خاطر لڑکر انسانیت کو زندہ رکھنے والے لوگ تھے۔

حکومتوں کا زوال

حکمران خاندانوں کے عروج و زوال کو بھی ہمارے مورخ نے محدود اور تنگ زاویے سے دیکھا ہے اور حکمران خاندان کے عروج و زوال کو معاشرے کا عروج و زوال سمجھا ہے اگر تاریخ کا وسیع نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حکمران خاندانوں کا عروج و زوال ایک علیحدہ چیز ہے اور معاشرے کے نشیب و فراز الگ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر دونوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔

مثلاً" تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جب بھی حکمران خاندان سیاسی لحاظ سے طاقتور رہا تو اس نے جبرو تشدد سے عوام سے ٹیکس وصول کئے اور اس دولت کے سہارے انہوں نے عالیشان عمارتیں بنوائیں، موسیقی، رقص، لباس اور کھانے میں نئی نئی ایجادات کیں اور فن کاروں و ہنر مندوں کو اپنی ملازمت میں رکھا جنہوں نے ان کی پسند اور خواہش کے مطابق فن تخلیق کیا اور مصور نے وہی تصویر بنائیں جو اس کے آقا کو پسند تھیں، موسیقاروں نے وہی راگنیاں و دھنیں ترتیب دیں ۔ جن سے امراء بادشاہوں کو خوشی حاصل ہو، شاعروں نے وہی غزلیں، قصیدے لکھے جن سے حکمران طبقے کی عظمت اجاگر ہو۔ ان کا فن حکمران طبقے کے لئے ہوتا تھا۔

جب حکمران خاندان کی سیاسی قوت و طاقت میں کمی آتی تو اس سے پورا عمل متاثر ہوتا تھا۔ سیاسی کمزوری کے ساتھ ہی فوجی قوت کم ہوجاتی تھی اور اس کے نتیجے میں ٹیکسوں کی وصول یابی نہیں ہوپاتی تھی۔ ذرائع آمدن کے گھٹنے سے نہ تو نئی عمارتیں بنتی تھیں اور نہ پرانی عمارتوں کی مرمت ہوپاتی تھی۔ نہ شاعروں، مصوروں اور موسیقاروں کو ان کی تخلیقات کا صلہ ملتا تھا اور نہ ہی دربار کی پرانی شان وشوکت باقی رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ عمارتیں ویران ہونا شروع ہوجاتیں، باغات اجڑ جاتے۔ ہمارا مورخ جب اس خستہ حالی اور ویرانی کو دیکھتا ہے تو اسے پورا معاشرہ زوال پذیر نظر آتا ہے۔ لیکن یہ معاشرے کا زوال نہیں حکمران طبقے کا زوال ہوتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ معاشرہ ہمیشہ اس عروج و زوال کے ڈرامے سے علیحدہ ایک سی حالت میں رہتا ہے اس کا اس وقت بھی استحصال ہوتا تھا جب حکمران خاندان عروج میں ہوتا تھا اور وہ اس وقت بھی مصیبت کا شکار رہتا تھا جبکہ سیاسی انتشار کے زمانے میں لاقانونیت اور لوٹ کھسوٹ ہوتی تھی عوام کی اکثریت تو ہمیشہ زوال کی حالت میں رہی ہماری تاریخ میں تو اسے کبھی بھی عروج نصیب نہیں ہوا اس لئے حکومتوں کے عروج و زوال کے پس منظر میں عوام کی حیثیت اور ان کے کردار کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسی انتشار

ہماری تاریخ کا ایک اہم موضوع سیاسی انتشار بھی ہے جسے ہمارا مورخ اکثر بڑے رنج اور مایوسی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ جس لاقانونیت کا دور دورہ ہوتا ہے، امیری غریبی کا فرق مٹ جاتا ہے امراء کے خاندان ذلیل و خوار ہوجاتے ہیں اور کم ذات والے طاقت میں

آجاتے ہیں ۔ اس سیاسی انتشار کے زمانے میں پورا معاشرہ الٹ پلٹ ہوجاتا ہے سماجی و معاشرتی قدریں مٹنے لگتی ہیں اور قرب قیامت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

مورخوں کی اس مایوس کن تصویر کے ساتھ ہی سیاسی انتشار دوسری تاریخی تصویر بھی پیش کرکے' دوسرے حقائق کو ہمارے سامنے لاتا ہے مثلاً یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب حکومت کے جبرو تشدد اور استبداد کے ادارے کمزور ہوکر اپنی طاقت کھو رہے ہوتے ہیں اور حکمران طبقے کی گرفت ڈھیلی ہورہی ہوتی ہے۔ پابندیاں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں اور عوام صدیوں کی غلامی اور اطاعت کی زنجیروں سے آزاد ہورہے ہوتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب فنکار اپنے لئے اور معاشرے کے لئے فن تخلیق کرتا ہے۔ مذہبی تعصب ' نسلی تفاخر اور قومی انا کے بت ٹوٹتے ہیں۔ پرانے و قدیم دولت مند خاندان دولت سے محروم ہو کر عوام کے جم غفیر میں مل جاتے ہیں اور طبقاتی بندشیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔

تاریخ میں سیاسی انتشار کا دور بڑا اہم ہوتا ہے جس میں معاشرے آئندہ زندگی کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ اگر اس مرحلہ پر کوئی تحریک شعور کے ساتھ سرگرم عمل ہو تو معاشرہ اس انتشار کے بعد صحت مند بنیادوں پر استوار ہوسکتا ہے۔

تاریخ نویسی کی بنیادیں

موجودہ دور ہمارے مورخوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ نویسی کا کوئی مقصد متعین کریں کیا ان کا مقصد حکمران طبقے کی بنیادوں کو مستحکم کرنا اور ان کے نظریات کو فروغ دینا ہے؟ یا حکمران طبقے کے سیاسی عزائم کو تاریخ کے ذریعے عملی جامہ پہنانا ہے ؟ یا تاریخ کے ذریعے معاشرے میں شعور کو پختہ کرنے اور معاشرے میں وسعت ذہن ' آزادی و حریت کو پیدا کرنا ہے۔

جو مورخ قومی و معاشرتی شعور کی خاطر تاریخ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کی تفسیر وسیع و پھیلے ہوئے مفہوم کے ساتھ کریں تاریخ کی یہ تفسیر تب ہوسکتی ہے جبکہ ہم سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ معاشرتی و سماجی و معاشی اور ثقافتی تاریخ کے موضوعات پر لکھیں کیونکہ یہی وہ موضوعات ہیں جو معاشرے سے نفرت و فساد کو دور کرکے ان میں انسانیت سے محبت و الفت پیدا کرتے ہیں۔

○○

تاریخ کیسے پڑھانا چاہیئے؟

تاریخ کو کیسے پڑھانا چاہیئے کہ یہ ہماری نسل سے نفرت اور تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں وسیع النظری اور قوت برداشت پیدا کرے؟ کیونکہ اس وقت تاریخ کو جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے وہ انتہائی فرسودہ ہے جس نے ہماری نسل کو جاہل اور تنگ نظر بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہمارے ہاں تاریخ کا نصاب انتہائی محدود ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں کی تاریخیں اور وہاں کے حالات اور عالمی تاریخ کا وسیع تصور ہمارے ہاں مفقود ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو قومی و نسلی زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے اور اس کا عالمی تصور دیا جائے۔ کیونکہ صرف عالمی تصور کے ذریعے ہم اپنے معاشرے کو تعصب فرقہ واریت اور قومیت سے نکال سکیں گے۔

اس لئے ضروری ہے کہ ابتداء میں ہمارے تعلیمی اداروں میں عالمی تہذیبوں کی تاریخ پڑھائی جائے۔ ان کا مطالعہ ہمارے ذہن سے بہت سے مفروضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گا۔ کیوں کہ عالمی تہذیبوں کے مطالعے کے بعد ہی ہم اس حقیقت تک پہنچیں گے کہ ہر معاشرے کا انسان تخلیقی صلاحیتوں کا مالک رہا ہے اور اس نے ہر دور و عہد میں تہذیبی روایات اور اقدار کی ترقی میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ انسان اور فطرت کی جنگ جو ہماری ابتدائی تاریخ کا موضوع رہا ہے۔ وہ ہمیں حوصلہ دے گا کہ جدوجہد اور انسانی قوت کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ انسان نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی اور ہر جبر و تشدد کا مقابلہ کر کے اسے ختم کیا۔ جس طرح انسان فطرت کی سختیوں سے مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتا ہے اسی طرح ہم اپنے معاشرے میں پیدا ہونے والے جبر و تشدد کا مقابلہ کر کے اسے ختم کر سکتے ہیں۔

عالمی تہذیبوں کے مطالعے کے بعد ہی ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تہذیب و تمدن کی تخلیق کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں رہی ہماری تمام روایات اور اقدار کی جڑیں انہی عالمی تہذیبوں میں ملیں گی۔ ہمارے عقائد' نظریات اور توہمات انہی تہذیبوں میں پائے جائیں

گے۔ ہمارے معاشرہ کوئی تنہا اور مجرد شئے نہیں بلکہ عالم برادری کا ایک حصہ ہیں اور ہماری تہذیب کی جڑیں عالمی تہذیبوں میں ہیں۔

اس مطالعے سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ کسی قوم کے عقائد' مذاہب اور مخصوص حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور حالات کے ساتھ ساتھ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ معاشرے بدلتے رہے ہیں اور انہیں کے ساتھ معاشرے کا پورا ڈھانچہ بھی بدلتا رہا ہے۔ عالمی تہذیبوں کے مطالعے کے بعد ہی ہم پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ رنگ نسل کی وجہ سے دنیا میں کسی قوم کو برتری نہیں۔ ہر قوم کا عالمی تہذیب میں اپنا حصہ ہے کوئی کسی سے کمتر یا بالاتر نہیں۔

عالمی تہذیبوں کے مطالعے ہی سے ہمارا ذہن کشادہ ہوگا اور اسی ذریعے سے ہم دنیا کی تہذیبوں کا تقابلی جائزہ لے سکیں گے۔ اور مختلف معاشروں میں پیدا ہونے والی تہذیبوں سے آگاہ ہوسکیں گے اور اسی مطالعے کے ذریعے ہم بے جا فخر و غرور سے چھٹکارا پاسکیں گے اور تعصب و تنگ نظری کی جگہ ہم میں وسیع انسانیت کا تصور پیدا ہوگا۔

ہمارے لئے یورپی تاریخ کا مطالعہ بھی انتہائی اہم ہے کیونکہ یورپی معاشرے کی سیاسی و معاشی و معاشرتی تبدیلیاں ہمارے لئے ایک پیغام ہیں۔ بحری راستوں کی دریافت' نشاۃ ثانیہ میں ان کا تہذیبی و ثقافتی انقلاب' اصلاح تحریک مذہب میں پوپ سے بغاوت' صنعتی انقلاب کے ذریعے ان کی فنی و معاشی زندگی میں ترقی اور اس کے نتیجے میں نو آبادیاتی نظام سرمایہ داری' جمہوریت' سوشلزم اور لبرل ازم کے تجربات یہ وہ موضوعات ہیں جو تاریخ کا انقلابی تصور دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں عام طور پر صرف عروج کی تاریخ پڑھاتے ہیں مثلاً عہد عباسیہ میں المتوکل تک پڑھاکر آخری عہد عباسیہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ہسپانیہ کی تاریخ صرف بنو امیہ تک پڑھاتے ہیں اور اس کے بعد زوال کے عہد کو نظرانداز کردیتے ہیں عہد مغلیہ کی تاریخ اورنگ زیب کے عہد سے آگے نہیں پڑھائی جاتی۔ عہد عثمانیہ میں سلیمان قانونی سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس طرح ہم اپنی تاریخ کے انہیں ادوار کو پڑھاتے ہیں ' جس میں فتوحات ہوئی ہوں' دولت کی فراوانی و اعلیٰ طبقے کی ثقافتی زندگی کی رنگینیاں ہوں اور جس معاشرے کی عظمت و بڑائی کا اظہار ہو۔ اس لئے ہمارا تاریخ کا طالب علم صرف ہمارے عروج کی تاریخ سے واقف ہوتا ہے اور اس سے بے بہرہ کہ ان حکمران خاندانوں کا زوال کیوں ہوا؟ اور زوال کے دوران معاشرہ کن کن نشیب و فراز سے گزرا؟ ان سوالات کا جواب ہمارا

نصاب نہیں دیتا ہے اور اسی لئے جب ہم اپنی ماضی کی عظمت کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنی پسماندگی کو دیکھتے ہیں تو ہم اس کا صحیح تجزیہ نہیں کرپاتے۔

اس زوال کی تاریخ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے کیونکہ اسی کے ذریعے ہمیں اپنی تاریخ کا صحیح شعور ہوگا۔

ہمارے تاریخ کے نصاب کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ ہم صرف سیاسی تاریخ پڑھاتے ہیں۔ ثقافتی و تہذیبی تاریخ عام طور سے ہمارے نصاب میں نہیں۔ سیاسی تاریخ چونکہ جنگوں' سازشوں اور قتل و غارت گری سے بھری ہوئی ہے اس لئے ہمارے ذہن میں تاریخ کا ایک خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے اور ہم تاریخ کو صرف خون ریزی اور لوٹ مار کے واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اس کے برعکس ہم مصلحین' فلسفیوں ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں جبکہ ہماری علمی و ثقافتی تاریخ ہے جس میں انسان بحیثیت انسان کے نظر آتا ہے اور تاریخ کے روشن پہلو کو ہمارے سامنا لاتا ہے۔

چونکہ تاریخ انسانی فکر و عمل کے ایک تسلسل کا نام ہے اس لئے اسے علیحدہ علیحدہ عہدوں اور اداروں میں تقسیم کرنے کی بجائے اسے تسلسل کے ساتھ ہی پڑھا جائے۔

ہمارے ہاں برصغیر ہندوستان کی تاریخ کو مسلمانوں کی آمد کے بعد سے پڑھا جاتا ہے اور قدیم ہندوستان کی تاریخ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم ہندوستان کی تاریخ کو مکمل نہیں پڑھیں گے اس وقت تک ہم اس خطے کی صحیح تاریخ اس کے مزاج و ذہن سے واقف نہیں ہوں گے۔

OO

اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ

عام طور سے دنیا کی تاریخ کو جغرافیائی لحاظ سے تقسیم کر کے اسی مناسبت سے اسے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً" تاریخ انگلستان' تاریخ فرانس یا یورپی تاریخ اور افریقی تاریخ۔ اگر کسی ملک میں مختلف اقوام نے حکومت کی، تو ان کی تاریخ اس ملک کی تاریخ کا ایک حصہ ہوگی اسی طرح اگر وہاں مختلف مذاہب نے کوئی کردار ادا کیا تو وہ بھی اسی طرح تاریخ کا ایک حصہ ہوں گے۔ کسی ملک کی تاریخ ایک عجائب مجموعہ ہوتی ہے جس میں اس ملک میں رہنے والی اقوام' مذاہب اور علیحدہ علیحدہ ثقافتیں و تہذیبیں آجاتی ہیں۔

دنیا کے دوسرے حصوں اور ملکوں میں تاریخ کو مذہب سے منسلک نہیں کیا گیا مثلاً" عیسائی تاریخ نام کی کوئی چیز نہیں۔ یورپ میں عیسائیوں کی اکثریت ہے مگر یورپ کے ہر ملک کی تاریخ اس ملک کے نام سے موسوم ہے یا پھر پورے یورپ کی ایک تاریخ ہے۔

ہمارے ہاں تاریخ کو مذہب سے منسلک کر کے اسے اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ سے موسوم کرنا شروع کردیا۔ اسلامی تاریخ کی اصطلاح نے ہمارے مورخین کو خاصی الجھن میں مبتلا کردیا کیونکہ جب اسلامی تاریخ میں غیر اسلامی فعال نظر آئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سب اسلامی تاریخ ہے۔؟ اسلامی تاریخ کو اس الجھن سے نکالنے کے لئے ہمارے مورخین نے یہ فرق پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تاریخ میں صرف رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد تک محدود ہے اور جب امیہ اور عباسی خاندانوں نے شخصی حکومتیں قائم کرلیں اور اسلامی اصولوں اور اقدار کو مجروح کردیا تو ان کی حکومتیں اسلامی نہیں رہیں اس لئے یہ تاریخ اسلامی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلامی تاریخ کی اس تفسیر سے ایک الجھن کو تو دور کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ میں ایک بہت ہی مختصر دور اور عہد میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اور طویل تاریخ کو اس سے نکال دیا گیا اور یہی وہ تاریخ ہے جس میں اگر ایک طرف خونریز جنگیں' فتوحات اور سازشیں ہیں تو دوسری طرف علم و ادب' مصوری' موسیقی' تعمیرات اور علم سائنس کی بھی ترقیاں ہیں۔

تاریخ کی یہ تفسیر اس لحاظ سے غلط ہے کہ اسلام اور مسلمان دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ اس لئے اسے چاہئے کہ اسلامی تاریخ کہا جائے یا مسلمانوں کی تاریخ یہ صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے ورنہ اس کا مفہوم ایک ہے۔

یہی الجھن اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جب ہم اسلامی نظریات و افکار میں ان مسلمان فلسفیوں کے افکار لے آتے ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے ابن رشد' الفارابی' الرازی' بو علی سینا' اور ابن خلدون ۔ یہی حال ان سیاسی اداروں کا ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں لیکن ہم انہیں اسلامی یا مسلمانوں کے ادارے سے موسوم کرتے ہیں۔

اس لئے اس الجھن کا علاج یہ ہے کہ ہم تاریخ کو جغرافیائی ناموں سے تقسیم کریں۔ مثلاً" ہندوستان کی تاریخ کو مذہبی یا نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی بجائے اسے مجموعی تسلسل کے ساتھ لکھا جائے کہ جس میں ہندو' بدھ' جین' عیسائی' اور مسلمانوں کے کارنامے بحیثیت مجموعی آئیں۔ کیونکہ تاریخ کو مذہب کی بنیاد پر موسوم کرنے سے یہ ہوا کہ تاریخ میں فرقہ واریت کی بنیاد پڑی اور یہ تاثر ابھرا کہ مسلمانوں کی جڑیں کسی ملک میں نہیں۔ جن ملکوں میں یہ آباد ہوئے اور جہاں صدیوں کی رہائش کے بعد انہوں نے وہاں کی تہذیب و ثقافتی زندگی میں حصہ لیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس سے علیحدہ رہنے پر اصرار کیا اور اپنی تاریخ کو اس ملک کی تاریخ میں ضم کرنے سے انکار کیا۔

جدید تاریخ میں بہر حال یہ تبدیلی آگئی ہے اور مسلمان ملک اپنی علیحدہ علیحدہ تاریخیں لکھ رہے ہیں' ان کی یہ تاریخیں ان کے قومی تشخص کی علامتیں ہیں کیونکہ ان کی پہچان ان کے ملک کی مرہون منت ہے۔

OO

مسلمان حکمران خاندان اور ان کا زوال

دنیا کی تاریخ قوموں کے عروج و زوال کے عمل سے بھری پڑی ہے۔ وقت کے گزرنے کے بعد جب انسان زوال شدہ قوموں کے آثار دیکھتا ہے تو اس پر مایوسی طاری ہوجاتی ہے جب وہ قدیم قوموں کے پر اسرار عظیم آثار جو خاموشی سے تنہا فضاؤں میں فطرت کی آفات کا مقابلہ کرتے اور خاموشی سے سربستہ کہانیاں سناتے دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں اس تباہی و بربادی اور اس زوال کے بارے میں لاتعداد سوال ابھرتے ہیں۔

زوال ہمیشہ ایک المیہ رہاہے۔ قوموں کے لئے بھی اور تاریخ کے لئے بھی۔ یہ زوال کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ قوموں کے اجتماعی گناہوں کی سزا کے طور پر ہوتا ہے یا اس کے کچھ قوانین ہیں؟ جنہیں مورخ اب تک دریافت نہیں کرسکا۔ ہر زوال شدہ قوم اپنے پیچھے یادوں کا ایک ذخیرہ چھوڑ جاتی ہے اور یہی یادیں تاریخ میں اسے زندہ رکھتی ہیں۔

جب زوال شدہ قومیں بالکل معدوم ہوجاتی ہیں تو ان پر کوئی ماتم کناں نہیں رہتا ہے۔ لیکن اگر زوال شدہ قوم حالت زوال میں رہے تو اسے بار بار اپنے شاندار ماضی کی یاد ستاتی ہے اور وہ اپنے زوال کی وجوہات اور اسباب ڈھونڈتی نظر آتی ہے مسلمان قوم بھی ان ہی میں سے ایک قوم ہے مسلمانوں کا زوال کیوں ہوا؟ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو بار بار ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور بار بار ان کا مختلف نقطہ نگاہ سے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس سوال کا جواب دینے میں بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ مسلمان قوم کی پوری تاریخ کو ایک سمجھ کر اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے کہ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ مختلف حکمرانوں میں بٹی ہوئی ہے اور اسی لئے اس کا عروج و زوال بھی ایک وقت میں نہیں ہوا بلکہ مختلف عہدوں اور مدارج میں یہ عمل پورا ہوا۔ مسلمانوں کے عروج کا ابتدائی زمانہ خلافت راشدہ' بنو امیہ اور بنو عباس کا تھا۔ یہ دور عرب قوم کے عروج کا بھی دور تھا۔ جس میں انہوں نے فتوحات کیں' نئے نئے علاقے اور ممالک فتح کئے اور فتوحات کے نتیجے میں مال

غنیمت حاصل کیا' جس سے ان کے معاشرے میں خوشحالی آئی اور انہوں نے تہذیبی اور ثقافتی میدانوں میں ترقی کی۔ لیکن عباسی خاندان کے زوال کے ساتھ ہی تاریخ میں عربوں کے عروج کا دور ختم ہوگیا اور وہ دوبارہ گمنامی میں روپوش ہوگئے اس حالت میں وہ بحیثیت قوم کے تو زندہ رہے مگر ان کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوچکی ہیں۔

تاریخ سے عربوں کی روپوشی کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں وسط ایشیا اور ایران میں ایرانی و ترک نژاد حکمران آئے جنہوں نے اپنا تعلق ایران کے قدیم حکمران خاندانوں سے جوڑا اور قدیم ایرانی روایات و اقدار کے احیاء کی کوشش کی۔ یہ حکمران خاندان اگرچہ چھوٹے چھوٹے تھے مگر انہوں نے اپنے درباروں میں علم و ادب کی سرپرستی کی اور اس دور میں فلسفہ' طب' موسیقی' مصوری' شاعری اور دوسرے علوم میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ بوعلی سینا' البیرونی' رودکی' عمر خیام' نظام الملک' حافظ اور سعدی انہیں درباروں کی پیداوار تھے۔ اگر چہ وسط ایشیا اور ایران سیاسی لحاظ سے مختلف حکمرانوں میں تقسیم تھا مگر یہ ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کی تاریخ کا تیسرا دور وہ ہے جب تین ترک خاندانوں نے اپنی عظیم الشان سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں یعنی: عثمانی ترک' صفوی اور مغل یہ تینوں سلطنتیں ایک دوسرے کی ہم عصر رہیں۔ مگر ان کا زوال علیحدہ علیحدہ ہوا ان تینوں سلطنتوں نے تہذیب و تمدن کی عظیم یادگاریں چھوڑیں اور دنیا کی تاریخ میں اپنے اثرات چھوڑے۔

ان سلطنتوں کے زوال کے بعد مسلمانوں کا زوال مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد کا دور مسلمانوں کی تاریخ میں پستی و ذلت کا دور ہے۔ جس میں بیشتر مسلمان ملک یورپی اقوام کی کالونی رہے اور دور غلامی نے ان کی رہی سہی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی ختم کردیا نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی مسلمان اقوام نے کسی بیداری کا ثبوت نہیں دیا اور آج عالم اسلام انتہائی کس مپرسی کے عالم میں ماضی کے احیاء کی کوششوں میں مصروف ہے۔

تاریخ کے اس پس منظر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں عروج و زوال اجتماعی طور پر نہیں آئے بلکہ عروج و زوال کے اس ڈرامے میں ایشیا و افریقہ کی مسلمان اقوام نے حصہ لیا اور یہ مختلف اوقات اور عہدوں میں کھیلا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں وہ کون سی بنیادی خرابی تھی جس نے ان کی طاقت و قوت کو گھن کی طرح کھا کر انہیں آہستہ آہستہ ختم کردیا؟

مذہب اسلام نے مسلمان معاشرے کو جو مساوات کا انقلابی تصور دیا تھا اس کی مدد سے

وہ معاشرے کو مضبوط اور مستحکم بنا سکتے تھے لیکن ہوا یہ کہ جب انہوں نے شام' عراق اور ایران کو فتح کیا اور اس کے نتیجے میں مفتوحہ قومیں مسلمان ہوگئیں تو انہیں یہ معاشرے میں برابر کا سماجی درجہ نہیں دیا گیا یہ نئے مسلمانوں کے لئے ایک زبردست دھچکا تھا کیوں کہ معاشرے میں عربوں کو سیاسی و معاشی اور سماجی لحاظ سے فوقیت تھی۔ اس سلوک نے نو مسلموں کو احساس محرومی میں مبتلا کردیا۔ بنو امیہ کے خلاف بغاوتیں ہوئیں ان میں انہوں نے بھر پور حصہ لیا۔ یہاں تک کہ "عباسی انقلاب" ان کی وجہ سے کامیاب ہوا اور معاشرے سے عرب و غیر عرب کی تفریق ختم ہوئی۔

جب عباسی حکومت میں ضعف کے آثار پیدا ہوئے تو وسط ایشیا اور ایران میں قومیت کی بنیادوں پر مقامی حکمران خاندانوں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں اور عباسی حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہوگئی۔

مسلمانوں میں شخصی حکومت کے قیام کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اقتدار عملاً ایک طبقے کے پاس رہا جبکہ عوام کی اکثریت اپنے حقوق سے محروم ان کی رعیت رہی۔

جب مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تو مساوات کو یہاں بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ یہاں صورت حال یہ تھی کہ محکوم رعایا غیر مسلم تھی اور اکثریت بھی تھی جب کہ مسلمان اقلیت میں۔ اس کا حل مسلمان حکمران طبقے نے یہی نکالا کہ اکثریت پر قوت و طاقت کے ذریعے حکومت کی جائے اس بات کی کوئی کوشش نہیں ہوئی کہ ہندوستانی معاشرے میں جہاں ذات پات کی تقسیم تھی وہاں نچلی ذات کے لوگوں کا سماجی مرتبہ بڑھا کر ان کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں جو لوگ مسلمان بھی ہوئے تو ان کو معاشرے میں برابر کا درجہ نہیں دیا گیا۔ عہد سلطنت کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی نے اس بات کا اظہار کیا کہ جب تک کسی کی رگوں میں کئی نسلوں تک اسلامی خون گردش نہ کرے' اسے سچا اور پکا مسلمان تسلیم نہ کیا جائے۔ اکبر نے اس بات کی ضرور کوشش کی کہ ہندوؤں کو حکومت میں شریک کرکے ان کی مدد حاصل کرے مگر اس نے بھی ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے سے روابط بڑھائے اور نچلی ذات کے لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا۔

اس کے بر عکس یہ ہوا کہ مسلمان معاشرے نے ہندو معاشرے سے ذات پات کی تقسیم اور سماجی طور پر اونچ نیچ کا تصور قبول کرلیا اور وسط ایشیا' ایران اور افغانستان سے آنے والے اعلیٰ ذات کے قرار پائے جب کہ مقامی باشندے جو مسلمان ہوگئے تھے انہیں ثانوی درجے کا مسلمان قرار دیا گیا۔ اس طبقاتی تقسیم نے ابتداء ہی سے مسلمان معاشرے کی بنیادیں

کمزور کردیں اور جب حکومت فوجی لحاظ سے کمزور پڑی تو ان کی مدد کرنے والا اور انہیں سہارا دینے والا کوئی نہ تھا' مرہٹوں جاٹوں اور سکھوں کی بغاوتیں احساس محرومی کے نتیجے میں تھیں جو قومیت کی بنیادوں پر ابھریں اور جنہوں نے مغل اقتدار کو ختم کرکے رکھ دیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں اسی پالیسی کو ہسپانیہ میں اور عثمانی ترکوں نے بلقان کی ریاستوں میں اختیار کیا۔ مقامی آبادی کی اکثریت کو سماج میں برابری کا درجہ دینے کی بجائے ان کو لوٹا کھسوٹا گیا اور اس لوٹ کھسوٹ کے پیسے سے "قصرۃ الزھرہ" اور الحمرا تعمیر کرتے رہے جو آج ان کی عظمت کی نہیں بربادی کی گواہی دے رہے ہیں۔ عثمانی ترکوں نے مقامی آبادی کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اس نے ان کے لئے سوائے نفرت کے اور کچھ نہ چھوڑا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے حکومت میں تمام طبقوں کو شریک نہیں کیا اور حکومت کی مراعات صرف ایک طبقے میں محدود رکھیں اس کی وجہ سے اکثریت محض رعیت رہی جس کا کام حکومت سے محض وفاداری اور اطاعت تھا۔ اس لئے جب بھی عوام کو کچلا گیا اور ان میں احساس محرومی بڑھا تو انہوں نے بغاوتیں کرکے حکومت کی بنیادوں کو کمزور کیا۔

مسلمانوں کی تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے کہ جب تک معاشرے میں مساوات کو عملی شکل میں نافذ نہیں کیا جائے گا اور جب تک مراعات کو عام نہیں کیا جائے گا اس وقت تک حکمران طبقہ قوت و طاقت کے ذریعے کچھ عرصہ تک تو حکومت کر سکتا ہے۔ مگر اس طرح حکومت کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوں گی اور جب ایسی حکومت کا خاتمہ ہوگا تو عوام میں اس کے لئے سوائے نفرت کے اور کچھ نہ ہوگا۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان حکومتوں کے زوال میں جو عناصر کام کررہے تھے وہ داخلی تھے۔ مساوات کے تصور کی خلاف ورزی' اقتدار کی ہوس اور مال غنیمت کے لالچ میں سلطنت کی توسیع اور بلا مقصد خونریز جنگیں' ایک طبقے کی بالادستی ' شخصی حکومت اور معاشرے کی اکثریت کا احساس محرومی' یہ وہ وجوہات تھیں جنہوں نے مسلمان حکمران خاندانوں کے زوال میں حصہ لیا۔

OO

پاکستان میں تاریخ کا المیہ

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر معاشرے اور ہر جماعت میں تاریخی شعور بڑھ رہا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ کے تصور میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اور یہ علم محدود دائرے سے نکل کر وسعت میں داخل ہوگیا ہے اس کی وجہ سے نہ صرف ذہنی سطح اونچی ہوئی ہے بلکہ اس میں طب' کھیل' ذرائع نقل و حمل' صنعت ' آرٹ ' ادب ' زراعت' سائنس اور ٹیکنالوجی اور ان کے معاشرے پر کیا اثرات ہوئے یہ سب اب تاریخ کے موضوعات ہیں' اس نے تاریخ کو ایک ایسے علم میں بدل دیا ہے کہ جس میں زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں معلومات ہیں اس لئے تاریخ محض بادشاہوں کے کارناموں کا مرقع نہیں رہی بلکہ اس میں عوامی سرگرمیوں کا بھی بیان آگیا ہے۔

جو معاشرے تاریخی شعور کے لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں وہ ماضی کی ان تمام اقدار اور روایات سے بغاوت کررہے ہیں کہ جنہوں نے اپنی فرسودگی اور بوسیدگی کی بنا پر ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی تھیں ان کی مسلسل جدو جہد یہ ہے کہ ماضی کے سحر اور جادو سے خود کو آزاد کرائیں اور تاریخی مفروضوں کو حقیقت کا لباس پہنائیں اور ماضی کو حال کی ضروریات اور تقاضوں کی مناسبت سے دیکھیں اس کا مطالعہ کریں اور اس کی تعبیر و تفسیر کریں۔

اس نئے نقطہ نظر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ماضی کے عظیم ہیرو جنہوں نے عوام کے ذہن و دماغ پر اپنی عظمت کا رعب جمایا ہوا تھا وہ اپنے اصلی روپ میں آنے کے بعد اپنی شان و شوکت اور دبدبہ کھو بیٹھے وہ مورخ جن میں تاریخ کا عوامی شعور ہے انہوں نے ایک ایک کرکے ان بڑی بڑی شخصیتوں کے طلسم کو توڑدیا اور انہیں بلندی سے گرا کر عوام کے قدموں تلے لا ڈالا اس طرح وہ روایات اور قدریں جو ایک زمانے تک ابدی اور لافانی سمجھی گئیں تھیں تاریخی عمل میں ان کی اہمیت اور قدرو قیمت کے بعد اندازہ ہوگیا کہ یہ بدلتے ہوئے زمانے اور نئی نسل کے تقاضوں کے لئے بے سود اور بے کار ہیں عوام کے کچلے ہوئے

طبقوں میں اور محروم لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے ان کے ذہن کو جلا اور روشنی بخشنے اور ان میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کرنے کے لئے تاریخ ایک ایسا علم ہے جسے استعمال کیا جانا چاہئے کیونکہ اس کے ذریعے ماضی کی حقیقتوں کو سامنے لایا جاسکتا ہے تو ہمات اور جہالت کو دور کرکے عوام کو ان کی اصلی طاقت و قوت سے آگاہ کیا جاسکتا ہے تاریخ کا یہ وہ استعمال ہے جو معاشرے میں مثبت اثرات پیدا کرے گا۔

اس ضمن میں جہاں تک پاکستان اور اس کے عوام کا تعلق ہے تو یہ ایک المیہ ہے کہ یہاں تاریخی شعور میں اضافے کی بجائے کمی آرہی ہے کیونکہ ہمارے ہاں تاریخ کو جس انداز سے لکھا جارہا ہے اور جس طریقے سے پڑھایا جارہا ہے یہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے اور ان کی ذہنی نشوو نما کی بجائے انہیں روایات ' قدروں اور توہمات کا اسیر بنا رہی ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس کے ذریعے گہری اور قدیم و فرسودہ روایات کو توڑا جائے بلکہ یہ ہے کہ انہیں کس طرح محفوظ کیا جائے۔ یہ جھوٹے بتوں اور شخصیتوں کے اثرات کو ختم کرنے کی بجائے مزید ایسی شخصیتوں کو پیدا کررہی ہے' پیشہ ور مورخوں اور حکمران طبقوں کی کوشش یہ ہے کہ ماضی کی غلط تعبیرو تفسیر کو کس طرح سے برقرار رکھا جائے اور اس کے ذریعے کس طرح سے اپنا اثرو رسوخ باقی رکھا جائے اگرچہ ماضی کی معلومات میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے اور اس کے بارے میں ہماری معلومات بڑھ رہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود' ماضی کا مطالعہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں نہیں کیا جارہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ماضی ایک جگہ ٹھہر گیا ہے اور اس کے پاس ہماری راہنمائی کے لئے کچھ نہیں رہ گیا ہے یہ ہماری ذہنی سوچ کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جن لوگوں کے پاس طاقت و قوت ہے اور سیاسی و معاشی ثقافتی اقتدار ہے۔ وہ کسی تبدیلی اور ترقی کے خواہش مند نہیں ہیں۔

تاریخ کا ایک المیہ یہ ہوا کہ سیاست دانوں اور با اقتدار طبقے کے زیر اثر آکر ان کی تمام کوششیں' سیاسی و معاشی اور معاشرتی خرابیوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے استعمال ہونے لگیں ایک مرتبہ جب معاشرے میں آمرانہ طرز حکومت قائم ہوگئی اور طاقت ور ادارے اس کی مدد کی غرض سے تشکیل پاگئے تو پھر وہ تمام پہلو جو جمہوریت' لبرل ازم' سیکولر ازم اور سوشلزم کے بارے عوام کو معلومات فراہم کرتے تھے اور جن کی مدد سے وہ سیاسی و معاشی اور معاشرتی حالات کا تجزیہ کرسکتے تھے ان سب کو تاریخ کے مطالعہ سے خارج کردیا گیا اس مرحلے پر پیشہ ور اور سرکاری مورخین نے وہی کام سر انجام دیا جو ان سے پہلے درباری مورخین کیا کرتے تھے انہوں نے فوراً" اپنی خدمات حکومت کے حوالے کرکے ان کے نقطہ

نظر سے تاریخ لکھنا شروع کی اور اس عمل میں ان تمام آمرانہ اداروں اور استحصالی قوتوں کو اخلاقی جواز فراہم کئے جو عوام کے حقوق کو کچلنے اور عوام کو ان کا جائز مقام دینے میں زبردست رکاوٹ ہیں۔

چنانچہ تاریخ کے حوالوں سے اور الماوردی کی تحریروں سے اس بات کو ثابت کیا گیا کہ اگر کوئی غاصب زبردستی اقتدار پر قبضہ کرلے تو یہ اقتدار جائز ہے اور عوام کا کام ہے کہ ایسے آمر کی اطاعت کریں اور اس کی حکومت کو تسلیم کرلیں۔ تاریخ کو مسخ کرنے کے سلسلے میں او رمطلق العنانیت کی حمایت کے نتیجے میں تمام ترقی پسند نظریات کو ہمارے معاشرے کے لئے اجنبی اور غیر ملکی کہہ کر مسترد کردیا گا تبدیلی کے تمام نظریات کو رد کرکے اس بات پر زور دیا گیا کہ ہمارے ہاں جو آفاقی اور ابدی قدریں ہیں انہیں میں ہماری نجات ہے۔ تاریخ کے وہ تمام حصے جن سے ہمارے معاشرے میں شعور و آگہی پیدا ہوسکتی تھی اور جو ہماری نئی نسل میں نئی سوچ اور فکر پیدا کرسکتے تھے انہیں جان بوجھ کر تاریخ کی نصابی کتابوں سے خارج کردیا گیا مثلاً" ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہمارے عقیدے کے لئے ضرر رساں اور خطرناک ہے اس لئے اس کی تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں قدیم ہندوستان کی تاریخ سے چونکہ ہندوؤں کی ذہنی ترقی اور ان کی تہذیب کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ ہمارے لئے ناپاک اور غیر ضروری ہے اس سلسلے میں یہاں تک ہوا کہ وادی سندھ کی تہذیب اور گندھارا ثقافت کو بھی مسترد کردیا گیا کیونکہ اس کا تعلق اس دور سے ہے جب مسلمان برصغیر میں نہیں آئے تھے اور یہ قبل مسیح کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے ان کے بارے میں جاننا ان کا مطالعہ کرنا' اور ان کی شان و شوکت کو بیان کرنا یہ سب مذہب کے خلاف ہے۔

تاریخ سے ان سب کو نکال کر اور اسے انتہائی محدود کرکے زیادہ زور اسلامی تاریخ پر دیا گیا اسلامی تاریخ کا بھی المیہ یہ ہے کہ اسے فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے جو فوراً" ہی نوجوانوں کے ذہن کو نفرت اور دشمنی سے بھر دیتی ہے یہ تاریخ مسلسل اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھائی جاتی ہے جو نہ صرف ہمارے ذہن کو گھنا دیتی ہے بلکہ ہمارے نقطہ نظر کو بھی محدود کردیتی ہے اور اس کے مطالعے کے بعد نہ تو ہم ماضی کو سمجھ سکتے ہیں نہ حال کو اور نہ مستقبل کو۔

مذہبی عقائد نے بھی ہماری تاریخ پر خراب اثرات ڈالے ہیں ہماری تاریخ نویسی کی ابتداء مذہب سے ہوئی اس لئے عقیدت کی جذبات کی وجہ سے ہم تاریخی شخصیتوں اور واقعات کا تنقیدی تجزیہ نہیں کرسکتے اور تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے اسے عقیدت کے پیمانہ

سے ناپ کر اسے بالکل صحیح تسلیم کرلیتے ہیں اس کے ساتھ قومیت اور نسل کے نقطہ نظر سے جب تاریخ کو لکھا جاتا ہے اور بیان کیاجاتا ہے تو یہ نہ صرف تاریخی حقیقت کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اس کے زیر اثر تاریخ کو مسخ کیا جاتا ہے اور محض اپنی پسند کے واقعات کو جمع کرکے تعصب کے ساتھ ان کو بیان کیا جاتا ہے ظاہر ہے تاریخ' تاریخ نہیں بلکہ قصہ کہانی اور افسانہ ہوجاتی ہے جس میں تخیلاتی عنصر زیادہ ہوتا ہے اور سچائی کم۔

ہمارے مورخ جس چیز کو نظرانداز کردیتے ہیں وہ یہ ہے کہ تاریخ کا اپنا ایک راستہ ہوتا ہے اس کا اپنا بہاؤ ہے اور اس کا اپنا عمل ہے اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات کو تاریخی عمل کے پس منظر میں دیکھا جائے اور تاریخ کے جدلیاتی عمل کی روشنی میں ان کا تجزیہ کیا جائے کیونکہ جب تاریخ کو قومیت' مذہب' نسل اور ذاتی تعصب کی روشنی میں لکھا جائے گا یا دیکھا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ واقعات کو تاریخ کے بہاؤ اور عمل سے نکال کر اسے تاریخ کی جڑوں سے محروم کردیا گیا ہو۔ جب واقعات کو کاٹ کاٹ کر اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے علیحدہ کرلیا جاتا ہے اور ان کو ان کی علیحدہ حیثیت میں دیکھا جاتا ہے تو وہ اپنی اہمیت اور حیثیت کھو دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب تاریخ کو مختلف مذہبی طریقے اپنے اپنے نقطہ نظر سے لکھتے ہیں تو وہ بھی تاریخ کی سچائی کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی عقیدت تاریخی واقعات کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرکے ان کی روح اور ان کے جوہر کو مجروح کرتی ہے۔

ہماری تاریخ میں ایک اور خطرناک اور زہر میں بجھا ہوا عنصر' فرقہ واریت کا ہے جو ہم نے آزادی سے قبل ورثہ میں پایا انگریزی سامراج سے جدوجہد کے دوران ہندوستان میں ہندو اور مسلمان فرقہ پرستی کو چند طبقوں نے اپنا مفادات کی خاطر فروغ دیا اس ماحول میں مسلمان مورخوں نے فرقہ وارانہ فضا میں چند ایسی شخصیتوں کو بطور ہیرو پیش کیا جو ہندوؤں کی نظر میں ان کی دشمن تھیں ان میں محمد بن قاسم' محمود غزنوی اور اورنگ زیب قابل ذکر ہیں جو بہت جلد مسلمانوں کی عظیم ہستیاں بن گئیں اور ان کو صرف مذہبی حیثیت سے ابھارا گیا اور ان کی تاریخی حیثیت اور تاریخی کردار کو نظرانداز کردیا گیا جس کے نتیجے میں ان سے جذباتی لگاؤ بڑھ گیا اور ان کا تنقیدی تجزیہ نہیں ہوا پاکستان بننے کے بعد بھی پاکستانی مورخوں نے اس فرقہ واریت کے نقطہ نظر کو تاریخ نویسی میں جاری رکھا یہاں تک کہ ہندوستان کے نام کی جگہ "جنوب ایشیاء" کی اصطلاح کو فروغ دیا گیا ہمارے نظریاتی مورخوں کی یہ باضابطہ کوشش ہے کہ پاکستان کا ثقافتی و تاریخی رشتہ ہندوستان کی بجائے مشرق وسطی سے جوڑا

جائے۔

ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ تاریخ کو حکمران طبقوں کے مفادات کے لئے اس طرح استعمال کیا گیا کہ بہت جلد یہ عوام کے لئے غیر دلچسپ علم بن کر رہ گئی کیونکہ اس کے دائرہ کو صرف بااقتدار طبقوں تک محدود رکھا گیا اور اس میں عوام کی سرگرمیوں اور ان کے کردار کو شامل نہیں کیا گیا تاریخ میں ان شخصیتوں کو ابھارا گیا جنہوں نے اپنے اور محدود طبقے کے مفادات کے لئے کام کیا تھا چونکہ ان افراد کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ تاریخ میں ان کے لئے بہتر مقام پیدا کیا جائے اس لئے انہوں نے جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کیا اور اپنی شخصیت کو اجاگر کیا اس سلسلے میں ہمارے پیشہ ور مورخوں نے ان کی مدد کی اور ان کی خوشامد میں انہوں نے عوام کو جو تاریخ اور اس کے عمل کے صحیح روح رواں تھے نظرانداز کردیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نچلے طبقوں میں نہ تو تاریخی شعور پیدا ہوا اور نہ ہی انہیں اس تاریخ سے کوئی دلچسپی رہی کیونکہ ایسی۔ تاریخ جس میں ان کا کوئی ذکر نہ ہو جو ان کے کارناموں کو فراموش کردے ایسی تاریخ میں ان کے لئے کوئی دلچسپی اور کشش باقی نہیں رہی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ انہیں کس طرح ایک ایسی تاریخ کو پڑھنے کے لئے کہا جائے جس میں ان کے لئے سوائے حقارت کے جذبات کے اور کچھ نہ ہو اور جس میں انہیں جاہل اور ان پڑھ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔

مجموعی طور پر تاریخی شعور کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سماجی و معاشرتی اور معاشی اور دوسرے اداروں میں بے حسی کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ ان میں ایسا کوئی شوق باقی نہیں رہا کہ وہ تاریخی دستاویزات کو محفوظ رکھیں اور اپنے اداروں کی تاریخی تشکیل کے شواہد جمع کریں اس لئے اگر تو مورخ ان اداروں کی تاریخ لکھنا چاہیں اسے نہ تو ان کے بارے میں کوئی مواد ملے گا اور نہ ہی ان کی دستاویزات ترتیب کے ساتھ پائی جائیں گی۔ مثال کے طور پر پولیس' فوج' عدلیہ اور محکمہ زراعت کی تاریخ لکھنے کا اگر کوئی منصوبہ بنایا جائے تو تاریخی شہادتوں کی کمی یا نایابی مورخ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی ان تمام اداروں کو کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ اپنی تاریخی حیثیت کو برقرار رکھیں اور اپنے کارناموں کو محفوظ کریں دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے ایسے تمام انتظامی سماجی اور معاشی ادارے اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کا کردار اس معاشرے میں استحصالی اداروں کا ہے اور ان کی دستاویزات اگر محفوظ رہ جائیں گی تو اس میں سازش' رشوت بدعنوانی لالچ' بے ایمانی اور عوام کو ستانے کے سوا اور کچھ نہیں' اس لئے ان کا

مقصد تاریخی دستاویزات کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ تباہ کرنا ہوتا ہے تاکہ ان کے جرائم اور برائیوں کی تمام شہادتوں کو مٹا دیا جائے۔ ہمارے بڑے بڑے سرکاری افسران حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حکومت کے کاغذات اور دستاویزات کو بطور مال غنیمت کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تاکہ یا تو ان کو تباہ کردیا جائے اور ان کے جرائم کی کوئی شہادت باقی نہ رہے یا اس کی مدد سے وہ اپنے ماضی کے عمل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ کے ذریعے عوام میں سیاسی و سماجی اور ثقافتی شعور پیدا کیا جاسکتا ہے اگر اسے معروضی انداز اور اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے اور واقعات کے ساتھ سامنے لایا جائے یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب تاریخ کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس میں ثقافتی اور معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے تاکہ عوامی سرگرمیاں اور ان کا تاریخی کردار واضح ہوکر سامنے آئے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے جبکہ تاریخ کو مذہبی ' قومی' فرقہ وارانہ' نسلی اور سیاسی بندھنوں سے آزاد کیا جائے اسی وقت یہ عوام کو جہالت اور توہمات سے آزاد کرسکے گی اور مورخوں کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ وہ بااقتدار طبقہ کو پرشکوہ بنانے کے بجائے عوام کو تاریخ میں باعزت اور پروقار جگہ دیں۔

○○

پاکستان میں تاریخ نویسی کے مسائل

پاکستان میں ابتداء ہی سے تاریخ نویسی قدیم اور عہد وسطیٰ کی روایات کے زیر اثر رہی اور اس میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی باقتدار طبقوں نے اسے اپنے پروپیگنڈہ اور عوام میں اپنے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا اس لئے جب بھی کوئی بحران پیدا ہوا یا جنگ ہوئی اور معاشرہ مسائل سے دوچار ہوا تو ایسے موقعوں پر مورخوں کی مدد لی گئی تاکہ واقعات کو حکمران طبقوں کی مرضی اور ان کے مفادات کے مطابق بیان کیا جائے تاکہ ان کے جرائم پر پردہ پڑ جائے اور وہ تاریخ کی سزا سے بچ سکیں اس مقصد کے لئے واقعات کی سچائی کو چھپا کر حکمرانوں کی عزت اور وقار کو بچایا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں اگر پاکستان کی تاریخ نویسی اور تاریخ کے مطالعے کو دیکھا جائے تو ہمیں اس کے چند اہم مقاصد نظر آتے ہیں۔

حکمران طبقہ تاریخ کے ذریعے اپنی پسند اور اپنی مرضی کا حب الوطنی کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ماضی کو شاندار بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ جن بنیادوں پر ماضی میں بادشاہوں اور حکمرانوں نے عوام پر حکومت کی تھی ان ہی بنیادوں پر حال کے آمرانہ نظام اور ان کی شان و شوکت کو صحیح ثابت کیا جائے دوسرے ایسے ہیروؤں کی مثالیں دی جاتی ہیں کہ جنہوں نے ملک اور عوام کی خاطر جانیں قربان کیں تاکہ ان مثالوں سے عوام کے جذبات کو متاثر کیا جائے اور ان سے اپنے مفادات کی خاطر قربانیاں لی جائیں لیکن اس حقیقت کو بھلا دیا جاتا ہے کہ ایسا وطن پرستی کا جذبہ جس کی بنیاد مفروضوں پر ہو اور جس کی کوئی پختہ اور مستحکم بنیاد نہ ہو اس کا اثر زیادہ دیر پا نہیں ہوتا کیونکہ تاریخ شعور بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان مفروضوں کو پاش پاش کردے گی اور ان بنیادوں پر ڈھا دے گی تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ماضی کی صرف شان و شوکت ہی نہیں بلکہ اس کے تاریک پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرے اور حب الوطنی کے ایک ایسے تصور کو فروغ دے جس میں عوام کا بھی تحفظ ہو کیونکہ جھوٹے قسم کے تصور سے صرف آمرانہ اداروں کو تقویت ملے گی۔

چونکہ ہمارے ملک میں لوگوں کا رجحان موجودہ حکومتوں کے خلاف بڑا سرد مہری کا ہوتا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ یہ حکومتیں عوام کی نمائندہ حکومتیں نہیں ہوتیں اور انہیں انتخاب کے ذریعے اقتدار نہیں ملتا اس لئے ان کے اور عوام کے درمیان دوری اور بعد ہوتا ہے اس لئے تاریخ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں اور ان کے اداروں کے لئے لوگوں میں جذبہ ہمدردی' وفاداری اور محبت پیدا ہو اس مقصد کے لئے حکومتوں کے رفاہی اور فلاحی کاموں کی مثال دی جاتی ہے اور انہیں عوام کا ہمدرد اور خیر خواہ ثابت کیا جاتا ہے ہر نئی حکومت جب ایک مرتبہ اقتدار پر قابض ہوجاتی ہے تو وہ پچھلی حکومتوں کے مقابلے میں خود کو عوام کا ہمدرد ثابت کرتی ہے یہاں بھی مورخ ان کی مدد کے لئے آتے ہیں اور پچھلے دور کو تاریک ثابت کرکے نئی حکومت کو عوام کے لئے خدا کی نعمت ثابت کرتے ہیں۔

ہمارے عوام جنہیں نہ تو اقتدار میں شریک کیا جاتا ہے اور نہ ان کی رائے اور خواہش کا احترام کیا جاتا ہے اس نظر اندازی کے سبب ان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے اور خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے وہ خود کو مجبور اور لاچار محسوس کرتے ہیں اور انہیں اپنے وجود کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا اس لئے حال کے اس کھوکھلے پن کو مورخ ماضی کی شان و شوکت سے پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں اپنی محرومیوں کا احساس نہ ہو اور وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد نہ کریں۔

جب کبھی بھی ہمارا معاشرہ بحران سے دوچار ہوتا ہے تو بااقتدار طبقہ ان پر قابو پانے میں ناکام ہوجاتا ہے تو اس وقت ہمارے مورخ اور روایتی تاریخ لکھنے والے ان تمام مسائل اور بحرانوں کا ذمہ دار یہودیوں' ہندوؤں' کیمونسٹوں اور عالمی طاقتوں کو ٹھہرا کر بااقتدار طبقوں کو تمام ذمہ داریوں سے بری کردیتے ہیں مثلاً" بنگلہ دیش کے بحران کا ہندوؤں کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی کہ اس کا تنقیدی جائزہ لے کر حکومتی اداروں کی غلط پالیسیوں اور حکمرانوں کی ذمہ داریوں کو بیان کیا جائے۔

ہماری تاریخ اب تک اس تصور اور نظریئے کے ساتھ لکھی جاتی ہے کہ تاریخ میں صرف عظیم شخصیتیں ہی کارنامے سرانجام دیتی ہیں اس لئے خصوصیت سے ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کو عظیم شخصیتوں کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ سامراج کے خلاف جنگ کرنے والے صرف چند افراد تھے جنہوں نے اس ملک کو آزاد کرایا اور عوام شاید اس پوری جدوجہد میں محض تماشائی تھے ان شخصیات کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لئے اس قسم کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن سے ان کی قربانی' ان کی محنت

ان کے جذبے و ایثار اور لگن کا اظہار ہوتا ہے تاکہ نہ صرف عوام میں ان کے لئے احترام کا جذبہ ہو بلکہ تاریخ میں بھی انہیں اعلیٰ مقام ملے اس نتیجے میں ان افراد کے خاندانوں اور پیروکاروں نے خصوصی مراعات حاصل کر کے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیا۔ کیونکہ وہ اپنے ہیروؤں کی قربانی کے بدلے میں مادی فوائد فوری طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ہماری تاریخ میں جنگ آزادی کے مجاہدوں کی ایک فوج پیدا ہوگئی اور ان کے کردار کو وطن پرستی کے نام پر پرشکوہ بنا کر پیش کیا۔ اور ان کے پردے میں لوگوں نے مالی فوائد حاصل کرنا شروع کردیئے۔

اگر کوئی مورخ تنقیدی تجزیئے کے ذریعے ان عظیم شخصیتوں کے اصل روپ اور کردار کو ظاہر کرنا چاہے تو اس کو روکنے کے لئے قانون اور اخلاقی دباؤ کا سہارا لیا جاتا تاکہ ان پر جھوٹ کا پردہ پڑا رہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ہیروؤں میں سے اکثر بلیک میلر' اسمگلر' زمینوں پر قبضہ کرنے والے چندہ اڑانے والے اور بدعنوان قسم کے لوگ تھے۔

حالانکہ صحیح تاریخی شعور پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت کو چھپانے کی بجائے اسے ظاہر کیا جائے کیونکہ تاریخی سچائی ہی کے ذریعے تاریخ میں ان کے ضرر رساں اثرات کو زائل کیا جاسکتا ہے اور حال و مستقبل میں ان سے ہوشیار ہوا جاسکتا ہے۔

تاریخ کو عظیم شخصیتوں کے تصور کے ساتھ پیش کرنے کے نتیجے میں جمہوری اقتدار اور جمہوری روایات کو نقصان پہنچتا ہے اور عام آدمی کو اس بات کے مواقع نہیں ملتے کہ وہ معاشرے کی تشکیل اور تعمیر میں حصہ لے اور تاریخ کے عمل کو تیز تر کردے تاریخ کا یہ نقطہ نظر تاریخ میں عوام کے کردار کو کم سے کم اور غیر اہم بنا کر پیش کرتا ہے اور ان کی قربانیوں کو نظرانداز کر کے ان کے لئے حقارت کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے اس طرح معاشرے میں غیر جمہوری ادارے مضبوط ہوتے ہیں اور آمرانہ رجحان کو فروغ ملتا ہے۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے شعور کو بڑھائے اور ان کی فکر میں وسعت پیدا کرے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب تاریخ کو "عالمی اور انسانی تاریخ کی حیثیت سے پڑھایا جائے کیونکہ جب تاریخ میں عالمی انسانیت کا تصور آئے گا تو اس میں مذہب' نسل' فرقہ واریت اور قومیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی کیونکہ عالمی تاریخ اس زمین پر انسان کے ارتقاء پر بحث کرتی ہے اور اس میں انسانی معاشرے کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

عالمی تاریخ دراصل بنیاد ہے اور اسی عالمی تاریخ کے دھارے سے جب ہم تاریخ کو

ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کرلیتے ہیں تو انہے قومی تاریخ کا نام دے دیتے ہیں قوموں کی تاریخ کو مزید ٹکڑوں میں بانٹ کر ہم علاقائی تاریخ بنا لیتے ہیں اس طرح معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو عالمی تاریخ سے علیحدہ کرکے ان کا مطالعہ کرتے ہیں جیسے ثقافتی' معاشی اور معاشرتی تاریخ اگرچہ تاریخ کو ہم مختلف ادوار میں تقسیم کرلیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں تاریخ ایک مسلسل علم کی صورت میں رہتی ہے ' جس میں انسانی معاشرے کے تمام پہلو آجاتے ہیں اس لئے تاریخ کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب کہ عالمی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ یہ تاریخ انسانوں کو نفرتوں اور تعصبات سے پاک کرکے اس کے ذہن کو کشادہ کرے گی۔ کیونکہ جب تک اجتماعی انسانی سرگرمیوں' انسانی تہذیبوں کے ارتقاء اور ترقی کے بارے میں معلومات نہیں ہوں گی اس وقت تک ہم قومی' علاقائی یا ثقافتی تاریخ کو پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے کیونکہ یہ تاریخیں علیحدہ سے ارتقاء پذیر نہیں ہوتی ہیں یہ عالمی تاریخ کی زنجیر کی ایک کڑی ہوتی ہے۔

جمہوری زمانے میں تاریخ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ حکمران طبقوں کو سیاسی انتظام اور ڈپلومیسی کی تربیت دے بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو اس کے مواقع فراہم کرے کہ وہ اپنے ذہن کو جلا بخش سکیں جمہوریت نے تاریخ کو بادشاہوں اور آمروں سے آزاد کرا دیا ہے اور اب ایک عام آدمی کو بھی اس حد تک پہنچ ہوگئی ہے اس لئے ہمارے مورخوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تاریخ کو خوشامد سے پاک کرکے اسے عام آدمی کی تعلیم کے لئے استعمال کریں تاکہ وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکے۔

○○

پاکستان میں تاریخ کی تعلیم

آزادی کے بعد پاکستان کے مورخوں کے سامنے انتہائی اہم اور بنیادی مسائل تھے کیونکہ نو آبادیات کے زمانے اور جدوجہد آزادی کے دوران برطانوی سامراج نے اپنے مفادات کے تحت تاریخ کو مسخ کیا تھا اور ہندوستان کے ماضی کو تاریک عہد کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس لئے مورخوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کس طرح اپنے ماضی کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے؟ اور کس طرح سے نو آبادیاتی دور کی تاریخ کو پیش کیا جائے اور کس طرح سے عالمی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کیا جائے؟ کیونکہ ان کا تعلق ہمارے حال اور مستقبل کی تعمیر سے ہے اور جب تک یہ شعور پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک نہ حال کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ مستقبل کو۔

بدقسمتی سے پاکستانی مورخوں نے ان مسائل کی جانب کوئی زیادہ توجہ نہیں دی اور ہماری تاریخ کی تشکیل ادھوری اور نامکمل رہی۔ نہ تو ہمارے ماضی کی نئے انداز سے تعبیر و تفسیر کی گئی اور نہ ہی عالمی تاریخ کا مطالعہ بدلتے ہوئے حالات اور بدلتی ہوئی روایات کے پس منظر میں کیا گیا۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے نے کسی خاص نقطہ نظر سے کام نہیں کیا جس کی وجہ سے پاکستان کی یونیورسٹیوں میں نہ تو تاریخ کا کوئی خاص دبستان قائم ہوا اور نہ ہی کوئی ایسی تحریک چلی جو تاریخ کو ایک علمی اور جاندار علم کی حیثیت سے پیش کر کے لوگوں کے منجمد ذہنوں کو جھنجوڑتی۔ پرانی نسل کے وہ مورخ جنہوں نے برطانوی عہد دیکھا تھا اور اس عہد کے تجربات سے واقف تھے۔ انہوں نے بھی اس بات کی کوئی خاص کوشش نہیں کی کہ تاریخ کو نو آبادیاتی اثرات اور نظریات سے نجات دلا کر اسے نئے اسلوب سے لکھیں اور ساتھ ہی نئی نسل کے مورخوں کی تربیت کریں تاکہ وہ تاریخ کو نئے خطوط پر لکھ سکیں علمی کارناموں کی بجائے ان میں اکثریت یونیورسٹی کی سیاست اور سازشوں میں ملوث رہی اور جوڑ توڑ کر کے مراعات حاصل کرتی رہی انہوں نے نہ تو کوئی علمی معیار قائم کیا اور نہ ہی اخلاقی بہتری کا مظاہرہ کیا۔

دیکھا جائے تو تاریخ یا کوئی بھی علم اس وقت تک لوگوں میں بیداری اور آگہی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو ہمارے مورخ آزادی کے بعد ایک ایسے ماحول میں آگھرے جہاں مقصد کا فقدان تھا اس انتشار کے عالم میں جہاں معاشرے کا ہر فرد متاثر ہوا وہاں مورخ بھی اس کا شکار ہوا اور اس کی تحریریں بھی اسی انتشار اور بے مقصدیت کا اظہار بن گئیں اور ہماری تاریخ نویسی غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی۔

اس انتشار کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد تعلیمی اداروں میں بغیر کسی تربیت کے ایسے کورسز شروع کئے گئے جن سے نہ تو ہمارے ماضی کے بارے میں پوری معلومات ملتی تھیں اور نہ ہی عالمی تاریخ اور انسانی تہذیب و تمدن سے پوری طرح واقف ہوتی تھی ابتداء میں تو انہیں کورسز کو اختیار کیا گیا جو کہ برطانوی عہد حکومت میں پڑھائے جاتے تھے اور نصابی کتابیں بھی وہی رہیں اور امتحانی سوالات کا انداز بھی وہی رہا اس وجہ سے تاریخ کا یہ نصاب تاریخ کے بارے میں ہمارے نقطہ نظر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لایا بعد میں جاکر جب اچانک اس بات کا احساس ہوا کہ پاکستان کا ایک خاص نظریہ ہے تو تاریخ کے کورسز کو اس کی روشنی میں نئے سرے سے تشکیل دیا گیا اور اس کے نتیجے میں تاریخ کے وہ پہلو جو پاکستانی نظریئے کے خلاف جاتے تھے انہیں تاریخ کی کتابوں سے خارج کردیا گیا اور تاریخ کو محدود کرکے اسے نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا گیا مثلاً" اسلامی تاریخ کے نصاب کو محدود کرکے اسے انتہائی سہل بنادیا گیا اس میں بنیادی طور پر جو پڑھایا جاتا ہے اس میں حضورﷺ کی زندگی اور خلفائے راشدین عہد امیہ اور عباسی وہ کورسز ہیں جو اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے لئے ڈاکٹر حمید کی کتاب "تاریخ اسلام" کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایم ۔ اے تک طالب علم اسی کتاب کو پڑھ کر امتحان پاس کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ کامطالعہ کرنے والے طالب علم کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ عربی زبان سیکھے اور تاریخ کے بنیادی ماخذوں کا مطالعہ کرے اسی طرح سے عہد وسطی کے ہندوستان کے مطالعے کے لئے طالب علموں کے لئے فارسی جاننا ضروری نہیں اور نہ ہی یونیورسٹی کی اعلیٰ کلاسوں تک میں بنیادی ماخذوں کا استعمال کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے طالب علم بحیثیت مجموعی تاریخ کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں انہیں نہ تو ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں بنیادی باتیں معلوم ہیں نہ ہی عالمی تاریخ اور انسانی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہیں اور نہ تحقیق کے فن سے واقف ہیں تاریخ کے اس محدود تصور کی وجہ سے یہ علم ہماری یونیورسٹیوں میں اور کالجوں میں اپنی مقبولیت کھو بیٹھا ہے اور اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں

رہی۔

ایک زمانے تک تاریخ اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی مگر آہستہ آہستہ اسے اسکولوں سے ختم کر کے اس کی جگہ معاشرتی علوم کو متعارف کیا گیا ہے اس لئے طالب علموں کو تاریخ کے بارے میں اب کوئی معلومات نہیں رہیں چونکہ کالجوں میں یہ اختیاری مضمون ہے اس لئے یہ طالب علم کی مرضی پر ہوتا ہے کہ وہ اسے لے یا نہ لے اکثریت اس مضمون کو اس لئے اختیار نہیں کرتی کہ وہ اسکول کے زمانے میں اس سے ناواقف ہوتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ دوسرے بہت سے مسائل ہیں جنہوں نے تاریخ کی ترقی اور فروغ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ مثلاً اب تک کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی کہ ایسے کتب خانے قائم کئے جائیں جن میں تاریخ کے کسی خاص عہد کے بارے میں بنیادی ماخذ اور ثانوی مواد ہو کوئی ایسا کیٹلاگ تیار نہیں ہوا ہے کہ جس کی مدد سے معلوم ہو سکے کہ ملک کی کس لائبریری میں کون کون سی کتابیں اور مسودے ہیں اور نہ ہی اس قسم کے انتظامات ہوئے ہیں کہ انڈیا آفس لائبریری یا برٹش میوزیم میں ہماری تاریخ پر جو مواد ہے اسے حاصل کیا جائے بلکہ وہ اہم تاریخی مواد جو حکومت کے شعبوں میں پڑا ہوا ہے اس کی چونکہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں اس لئے وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے مثلاً سندھ میں چیف کمشنر کے آفس کا ریکارڈ بوریوں میں بند خستہ اور بوسیدہ ہو رہا ہے اب تک اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ اس ریکارڈ کو چھانٹ کر اسے باقاعدہ سے ترتیب دیا جائے اور اس کا کیٹلاگ بنایا جائے۔

نہ ہی پاکستان بننے کے بعد سے حکومت کی دستاویزات کو محفوظ رکھنے کے اقدامات کئے گئے ہیں اس لئے بڑے بڑے گورنمنٹ افسران کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنے اپنے محکموں کا ریکارڈ اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ تاکہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی سوانح حیات لکھ کر خود اپنی شخصیت کو ابھاریں اور اس کے ذریعے پیسہ بھی کمائیں اس لئے مستقبل کے مورخ کے لئے یہ بڑا مشکل ہوگا کہ وہ ہمارے ماضی کی تاریخ لکھ سکے کیونکہ تاریخ کی تمام شہادتوں کو یا تو جان بوجھ کر ذاتی مفاد کے تحت ضائع کیا جارہا ہے اور یا کسی کو اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہے اور اس عدم دلچسپی کی وجہ سے تاریخی ریکارڈ ختم ہورہا ہے اس کے نتیجہ میں ہمارے ہاں ایک ایسے معاشرے کا ارتقاء ہورہا ہے جس کی اپنی حالیہ تاریخ بھی مکمل نہیں ہے۔

تاریخ کے شعور کے نہ ہونے کا فائدہ ہمارے با اقتدار طبقے کو ہے کیوں کہ اس صورت میں ان کے لئے آسان ہے کہ وہ انہیں پرانے نعروں کے ذریعے اپنے اقتدار کی راہ ہموار کرلیں اور عوام کی تاریخی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر انہیں بار بار اپنے استحصال کا شکار بنائیں۔

ذریعہ تعلیم میں زبان کی تبدیلی بھی معیار تعلیم کو گھٹانے کا باعث بنی انگریزی سے اردو اور سندھی میں پڑھائی کے بعد طالب علم کی ذہنی سطح کم ہوئی چونکہ ان دونوں زبانوں میں نصابی کتابوں کی کمی ہے اور اعلیٰ معیاری کتابوں کا فقدان ہے اس نے تعلیم میں دوھرے معیار کو مزید بڑھایا۔ کیونکہ اعلیٰ طبقے کے بچے انگریزی سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں اور ان کا نصاب بھی عام تعلیمی اداروں سے مختلف ہوتا ہے اس لئے وہ مقابلے کے امتحانوں اور دوسرے امتحانوں میں اردو' سندھی میڈیم اسکول و کالجوں کے طالب علموں سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اس لئے اس تبدیلی نے معاشی و معاشرتی سطح کے ساتھ ساتھ تعلیمی سطح پر بھی اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم کو گہرا کردیا ہے۔

تاریخ بھی اس تبدیلی کے عمل سے متاثر ہوئی اور اعلیٰ اور اچھی نصابی کتابوں کے نہ ہونے کی وجہ سے طالب علموں نے تیسرے درجے کی کتابیں پڑھنا شروع کردیں تاکہ وہ امتحان پاس کرسکیں اس طرح آہستہ آہستہ تعلیمی معیار گرتا چلا گیا اس دوران میں اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ مقامی زبانوں میں اچھی اور معیاری کتابیں لکھوائی جائیں یا ترجمہ کرائی جائیں۔

تاریخ کی موجودہ نصابی کتابیں محض امتحان پاس کرنے کی غرض سے لکھی گئیں ہیں اور ان میں نہ تو موجودہ تحقیقی کام کے نتائج ضم کئے گئے ہیں نہ ہی تاریخ کو سائنٹفک طریقے سے پیش کیا گیا ہے اردو میں یورپی' امریکی ' روسی یا ہندوستان کی تاریخ پر کوئی اچھی نصابی کتاب نہیں ہے۔ کتابوں کے فقدان نے طالب علموں کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ سستی قسم کی نصابی کتابوں کا مطالعہ اور اسی مواد کو لکھ کر امتحان پاس کریں۔

جہاں تک تاریخ کی اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے کہ جس میں تاریخ کے کسی ایک خاص پہلو کا گہرائی اور بنیادی ماخذوں کے ساتھ مطالعہ کرکے تحقیق کی جائے اس سلسلے میں بھی ہم غیر ملکی یونیورسٹیوں کے محتاج ہیں یہاں تک کہ برصغیر ہندوستان کی تاریخ کا مواد بھی یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں میں ہے اور وہیں پر یہ ممکن ہے کہ حالیہ تحقیق کے فن کی مدد سے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔

تاریخ کی غیر مقبولیت کی ایک اور وجہ ہمارے معاشرے میں سیاسی و معاشی تبدیلیاں بھی ہیں کیونکہ ہر نوجوان طالبعلم اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے فوری طور پر ملازمت مل جائے چونکہ تاریخ میں ڈگری لینے کے بعد اس کی مارکیٹ میں کوئی مانگ نہیں اس لئے اکثریت اس سے دور رہتی ہے اور ایسے لوگوں کی اب کمی ہے کہ جن کی مالی حالت بہتر ہو اور وہ بغیر ملازمت کی خواہش کے محض علم کی خاطر اس کا مطالعہ کریں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا پورا نظام تعلیم فرسودہ اور بیکار ہو کر اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہے اور اس کے ساتھ تعلیم بھی زوال کا شکار ہو کر اپنی اہمیت کھو چکی ہے جب پورا نظام تعلیم ہی بوسیدہ ہو چکا ہو تو محض تاریخ کو اس گرتے ہوئے ڈھیر سے نکال کر علیحدہ سے اس کی اصلاح نہیں کی جا سکتی ضرورت اس بات کی ہے کہ پورا نظام تعلیم نئے سرے سے درست کیا جائے۔

OO

تاریخ اور سچائی

مورخ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو تاریخی واقعات کو سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور تاریخ کو اس کے حقیقی رنگ میں تشکیل دیتے ہیں دوسروں وہ جو تاریخ میں سچائی کو چھپا کر واقعات کو مسخ کردیتے ہیں وہ مورخ جو سچائی کے لئے چھان بین کرتے ہیں اور تاریخ سے جھوٹ اور دروغ کو نکالتے ہیں ایسے مورخ علمی زندگی میں انتہائی تکالیف برداشت کرتے ہیں وہ عملی زندگی میں مادی فوائد حاصل کرتے ہیں کیونکہ یہ مورخ بااقتدار طبقوں اور ان کے مفادات کے لئے انتہائی سود مند ہوتے ہیں اور تاریخ کو ان کی خواہش کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اس طرح سے دو قسم کی تاریخ متوازی طور پر لکھی اور پڑھی جاتی ہے ان میں ایک سرکاری، اواری اور روایتی ہوتی ہے جب کہ دوسری غیر سرکاری اور غیر روایتی ہوتی ہے۔

سرکاری مورخوں کی حکومت کی جانب سے پوری پوری سرپرستی کی جاتی ہے انہیں بھرپور مالی امداد دی جاتی ہے اور ان کی رسائی حکومت کی دستاویزات تک ہوتی ہے تاکہ یہ ان کے استعمال سے تاریخ کو مسخ کرنے کا کام آسانی سے سرانجام دے سکیں اور اپنے سرکاری نقطہ نظر کی مدد سے حکومتی اداروں کو سہارا دیں تعلیمی اداروں میں بھی انہیں کی کتابیں نصاب میں داخل کی جاتی ہیں اور انہیں کو اس کے مواقع ملتے ہیں کہ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آکر اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔

لیکن وہ مورخ جو تاریخ میں سچائی کے متلاشی ہوتے ہیں اور محنت کے بعد صحیح واقعات کو سامنے لاتے ہیں ان کو نہ تو سرکاری امداد ملتی ہے اور نہ ملازمتیں نہ ہی معاشرے کے آزاد طبقے ان کی مدد کے لئے آتے ہیں اور بہت جلد وہ معاشرے میں تنہائی کا شکار ہوجاتے ہیں حالت یہاں تک ہوجاتی ہے کہ پبلشرز ان کی کتابیں چھاپنے سے انکار کردیتے ہیں اور بک سیلرز ان کی کتابوں کی فروخت پسند نہیں کرتے۔

وجہ یہ ہے کہ آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں سچائی سے نفرت کرتی ہیں کیونکہ جب

تک واقعات پر جہالت کا پردہ پڑا رہے گا ان کے جرائم اور ان کی بد عنوانیاں اس پردے کے پیچھے چھپی رہیں گی۔ اس لئے تاریخی سچائی اور حقیقت کو ملک اور قوم کی عزت کے نام پر چھپایا جاتا ہے اور اس کا جواز اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ سچائی کے ظاہر ہونے سے ملک کے تحفظ کو خطرہ ہوگا یا قوم کے وقار کو دھچکا لگے گا اس لئے ملک و قوم کی عظمت اور عزت کے لئے ضروری ہے کہ سچائی کو چھپایا جائے اس سلسلے میں سب سے اچھی مثال ۱۹۳۶ء کا جرمن پینل کوڈ ہے جو اس ذہن کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے اس قانون کے تحت ایسے تمام تاریخی واقعات جن کے ظاہر کرنے سے جرمن قوم کا وقار مجروح ہو اس کی سزا قید بامشقت ہے اس ضمن میں یہ قطعی نہیں دیکھا جائے گا کہ واقعات صحیح ہیں یا غلط۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آمرانہ حکومتوں نے کس طرح اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے تاریخ کو استعمال کیا اور سچائی کو روکنے کے لئے قانون اور سنسر شپ کی مدد لی۔

بااقتدار طبقوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ تاریخ میں ان کا ایک ایسا تصور ابھرے جس میں وہ انتہائی ایمان دار اور معصوم بن کر ابھریں تاکہ اپنے اس تصور کے سہارے وہ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان پر حکومت کر سکیں یہ کام تب ہی ممکن ہے جب کہ تاریخ کو مسخ کیا جائے واقعات کو جھوٹ کے ذریعے بیان کیا جائے اور سرکاری دستاویزات کے غلط حوالے دیئے جائیں۔

حکمران طبقے اپنے اثر و رسوخ کو مستحکم کرنے کے لئے کئی طریقے استعمال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ چند شخصیتوں کو ابھارا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کو عام انسان سے بڑھا کر تقدس کا رتبہ دے دیا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ شخصیتیں ایسا روپ اختیار کر لیتی ہیں کہ ان پر کسی قسم کی تنقید یا اعتراض معاشرے کی نگاہ میں جرم ہو جاتا ہے ایک مرتبہ جب یہ شخصیتیں اس مرتبہ کو حاصل کر لیتی ہیں تو پھر ان کے اقوال نصیحتیں اور ہدایات (جو کہ اکثر جعلی ہوتی ہیں) کے ذریعے بااقتدار طبقے اپنے اقتدار مراعات اور اپنی پالیسیوں کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب کہ سرکاری مورخین کو حکومت مدد کے لئے بلاتی ہے تاکہ وہ ان شخصیتوں کے ایسے اقوال تراشیں جو موجودہ نظام کو مستحکم کریں اگر کوئی مورخ یہ کوشش کرے کہ وہ ان شخصیتوں کی حقیقت کو سامنے لائے ان کے اقوال کی سچائی کا تجزیہ کرے اور تاریخ کو اصل حقیقت میں پیش کرے تو ایسی کوششوں کو ملک دشمن و قوم کہہ کر کچل دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اکثر جھوٹ کا اتنا زوردار تحفظ ہوتا ہے کہ سچائی کو ظاہر ہونے تک کئی دہائیاں گزر جاتی ہیں اور یہ تاریخ کا جھوٹ عوام میں سچ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی حکمران طبقے اسی ذہن و دماغ کے ساتھ تاریخ کو اپنے تسلط میں رکھ کر اسے مسخ کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنی بدعنوانیوں کو صحیح ثابت کرتے ہیں' ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو یا تو بالکل ختم کردیا جائے یا انہیں اس طرح سے پیش کیا جائے کہ وہ جھوٹ کے لبادے میں روپوش ہوجائیں وہ اپنے وقار اور عزت کو جھوٹی روایات کی بنیاد پر باقی رکھنا چاہتے ہیں پاکستان میں اس کی مثال حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سے دی جاسکتی ہے جسے عوام کے اصرار کے باوجود اس بہانے کی بنیاد پر نہیں چھپا گیا کہ اس میں ملک کے بارے میں ایسی حساس معلومات ہیں کہ ان کے ظاہر ہونے سے اس کے تحفظ کو خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ چونکہ اس میں بااقتدار طبقوں کی غلطیاں اور حماقتیں ہیں اس لئے یہ ان کے مفاد میں نہیں کہ اس کی اشاعت ہو اور وہ اپنی غلط پالیسیوں کی وجہ سے عوام میں رسوا ہوں ایک دوسری مثال قائد اعظم محمد علی جناح کی ہے کہ جن کی تقاریر سے صرف انہیں اقتباسات کو پیش کیا جاتا ہے جو حکمران طبقوں اور حکومتی اداروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور ان کے قیام کے جواز کو صحیح ثابت کرتے ہیں اور ان کی وہ تمام تقریریں جن میں جمہوریت سیکولر ازم یا لبرل ازم کا ذکر ہے انہیں باضابطہ طور پر چھپا دیا گیا ہے انہیں جس قائد اعظم کی ضرورت ہے صرف اسے ہی اجاگر کیاجاتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب تاریخ کو مسخ کردیا جائے تو پھر اسے اس کے اصلی رنگ و روپ میں لانے کے لئے کئی نسلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تاریخ کو سمجھ کر غلط فہمیوں کو دور کرکے اور مفروضوں کو پاش پاش کرکے تاریخ کو نئے سرے سے تعمیر و تشکیل کریں تاریخ میں مسلسل جھوٹ کو جب ذرائع ابلاغ عامہ اور نصابی کتابوں کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے تو یہ طالب علموں اور عوام کے ذہن و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کو صحیح تسلیم کرکے اس سے جذباتی لگاؤ پیدا کرلیتے ہیں اس لئے جب تاریخ سے جھوٹ نکال کر سچ پیش کیا جاتا ہے تو ان کے ذہن اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں اور اس عمل میں مورخوں کو اور ایسے مورخوں کو جو اس ماحول میں رہتے ہوئے سچ کو پیش کرنے کی جرات کریں ایک تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس جھوٹ کو قوم کی اجتماعی یاداشت سے نکالنے کے لئے جرات و ہمت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مسخ تاریخ نسلوں کو تباہ کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں نفرت و تعصب پروان چڑھتا ہے ذہنی ارتقا رک جاتا ہے اور زندگی کے بارے میں محدود نقطہ نظر پیدا ہوجاتا ہے فرقہ واریت چھوٹی قومیت اور فاشزم کی طاقتیں معاشرے میں پھیل جاتی ہیں اور عوام ان تضادات کے درمیان اس طرح سے گھر جاتے ہیں کہ وہ اپنے اصلی اور

بنیادی مسائل کو بھول جاتے ہیں۔

اکثر ایک بات کہی جاتی ہے کہ ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے اگر یہ بات روایتی تاریخ' یا اس تاریخ کے بارے میں کہی جائے کہ جس میں صرف حکمران طبقوں کی تعریف و توصیف ہوتی ہے تو صحیح ہے کیونکہ سرکاری تاریخی واقعات کچھ نہیں سکھاتے اس میں سوائے جھوٹ دروغ اور غلط بیانی کے کچھ نہیں ہوتا یہ معاشرے کی انتہائی گندگی اور غلیظ تصویر پیش کرتی ہے لیکن وہ تاریخ جو روایت سے ہٹ کر ہو اور جو عوامی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہو اور جس میں تاریخی واقعات کو سچائی اور حقیقی روپ میں پیش کیا گیا ہو ایسی تاریخ نہ صرف ذہن کو کشادہ کرتی ہے بلکہ یہ قوم کے شعور میں بھی اضافہ کرتی ہے اور یہ وہ تاریخ ہے جس سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے کے بعد بہرحال یہ واضح ہوتا ہے کہ سچائی میں طاقت ہے بلاوجود اس کے کہ اسے کچلا جائے' چھپایا جائے' مٹایا جائے اور اسے نظروں سے اوجھل کیا جائے مگر آخر میں یہ جھوٹ کو ختم کرکے اپنی حیثیت کو تسلیم کرالیتی ہے۔ مثلاً" گلیلیو' رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے سامنے شکست کھاگیا اور سچائی کو تسلیم نہ کراسکا لیکن جہاں گلیلیو کو شکست ہوئی وہاں تاریخ کامیاب رہی اور آخر میں سچائی کو نہ صرف تسلیم کرلیا گیا بلکہ گلیلیو کو ایک عظیم ہستی کی حیثیت دی گئی اور آخر بیسویں صدی میں جاکر چرچ کو بھی اس کا احساس ہوا کہ وہ غلط تھا اور گلیلیو سچا تھا اگرچہ جھوٹ کو مٹانے اور سچ کو ثابت کرنے میں صدیاں گزر گئیں مگر بالاخر سچ جھوٹ پر غالب آیا۔

سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ اگر ہم اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو تسلیم کرلیں تو اس بات کا ہمیشہ امکان رہے گا کہ ہم ان کا علاج دریافت کرلیں گے اور تجربات کی روشنی میں ان غلطیوں کا بار بار اعادہ نہیں کریں گے کیونکہ ناواقفیت اور جہالت بار بار انہیں غلطیوں کی جانب لے جاتی ہے اور قوموں کو تاریخ سے کچھ سیکھنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔

○○

المیہ تعلیم

عام طور پر قومیں تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتیں اور ان غلطیوں کو دھراتی ہیں جن کی وجہ سے دوسری قومیں زوال پذیر ہوئی تھیں اگر معاشرے میں زوال کے آثار نظر آتے ہیں تو دستور یہ ہے کہ اس کا ذمے دار پورے معاشرے کو قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر معاشرے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور اس کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ اجتماعی طور پر کوئی معاشرہ خرابیوں کا ذمہ دار نہیں ہوتا کیونکہ جو خرابیاں معاشرے کو تباہی کی جانب لے جاتی ہیں ان میں بدعنوانی' عدم استحکام' اقلیت میں دولت اور اقتدار کا محدود ہونا اور اکثریت کا محرومی کا شکار ہونا اہم وجوہات ہیں جو کہ معاشرے کے زوال کے عمل کو تیز کرتی ہیں اس لئے ان وجوہات کی ذمہ داری حکمران اقلیتی طبقوں پر آتی ہے کیونکہ ایک مرتبہ جب یہ طبقے دولت و اقتدار حاصل کرلیتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے اکثریت کے حقوق کو کچل کر انہیں اپنے زیر نگیں رکھیں اور خود ساری قوت و طاقت کے مالک بن جائیں۔

ایک مرتبہ جب یہ حکمران طبقے مراعات حاصل کرلیتے ہیں تو ان کی یہ خواہش شدید ہوجاتی ہے کہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ بالکل شریک نہ ہو اس لئے یہ خود میں اور عوام میں ایک حد فاصل قائم کرکے خود کو ان سے علیحدہ کرلیتے ہیں اور اپنا طبقاتی تشخص پیدا کرکے دوسرے طبقوں سے تمام تعلقات توڑ لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ طبقاتی علیحدگی زندگی کے ہر شعبے اور پہلو میں بڑھتی جاتی ہے مثلاً" ان کے رہائشی علاقے' ان کے بچوں کے لئے تعلیمی ادارے' ہسپتال' کھیلوں کے کلب ثقافتی ادارے اور تفریحی جگہیں علیحدہ علیحدہ ہوجاتی ہیں جہاں دوسرے طبقوں کے لوگوں کو نہ تو آنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ وہ مالی طور پر اس کی استطاعت رکھتے ہیں معاشرے میں طبقاتی علیحدگی یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ حکمران طبقوں کی ثقافت' رسم و رواج' ادب و آداب' تہوار' زبان' لباس اور طور طریق بالکل مختلف ہوجاتے ہیں اپنی اس علیحدگی کو اور ساتھ میں اپنی مراعات اور حیثیت کو برقرار رکھنے

کے لئے یہ اپنے قوانین اور ادارے تخلیق کرتے ہیں جن کی مدد سے انہیں مضبوط اور مستحکم کیا جائے اور ان کے خلاف ہر کوشش و جدوجہد کو ختم کردیا جائے لیکن تاریخ سے بہرحال یہ سبق ملتا ہے کہ یہ حکمران طبقے اپنی دولت' طاقت' اقتدار اور مراعات کو ہمیشہ قائم نہیں رکھ سکتے ہیں کیونکہ دولت کا ایک جگہ جمع ہوجانا اور تمام مراعات کو چھین کر چند طبقوں میں محدود کرنے سے معاشرے میں محرومیت کااحساس بڑھ جاتا ہے اور یہ محرومیت جرائم بدعنوانی' لاقانونیت' جہالت' بیماری اور وباء کی شکل میں پوری سوسائٹی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ حکمران طبقوں نے جس طرح معاشرے کو ٹکڑے کیا ہوتا ہے وہ معاشرے کے اتحاد ہم آہنگی اور یگانگت و ختم کرکے' تفریق' نفرت' عداوت اور خود غرضی میں مبتلا کردیتا ہے۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جو طبقاتی لحاظ سے بٹا ہوا ہے جس میں اتحاد کی علامتیں ختم ہوچکی ہیں اور جو اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا ایسے معاشرے میں ہم صرف تعلیم کی اصلاح کرسکتے ہیں؟ ظاہر کہ اس کاجواب یہ ہے کہ تعلیم کوئی علیحدہ چیز نہیں کہ جسے معاشرے سے علیحدہ کرکے صرف اس کی اصلاح کردی جائے یہ معاشرے کا ایک حصہ ہے اس کا اٹوٹ انگ ہے اس لئے جب تک معاشرے کے پورے ڈھانچے اور اس کے پورے نظام کو تبدیل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک صرف تعلیم میں کوئی بھی اصلاح نہیں ہوسکے گی۔ کیونکہ اس وقت تعلیم کی پسماندگی کی شکایت صرف وہ کر رہے ہیں کہ جن کے بچوں کو اچھے اسکول' کالج و یونیورسٹی میسر نہیں لیکن جن طبقوں کے بچے اور ٹوپہ' گھوڑا گلی' حسن ابدال اور بڑوں شہروں کے گرامر و مشن اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں یا انگلستان و امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا یہ مسئلہ نہیں ہے وہ تعلیم کی پس ماندگی کی شکایت صرف اس وقت کرتے ہیں جب انہیں اچھے کلرک' ٹائپسٹ اور اسٹینو گرافر نہیں ملتے ورنہ اگر تعلیم کا زوال ہو جہالت بڑھے اور لوگوں میں اس کے ساتھ ہی شعور کی کمی ہو تو یہ ان حکمران طبقوں کے لئے اچھی علامتیں ہیں کیونکہ جاہل لوگوں پر حکومت کرنا اور انہیں دبا کر اور کچل کر رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں تعلیم کا یہ دوھرا معیار کوئی نئی بات نہیں کیونکہ اس کا تعلق طبقاتی معاشرے سے ہوتا ہے مگر اس کو مزید طاقتور بنانے میں برطانوی اقتدار کا مفاد بھی تھا لیکن آزادی کے بعد بھی معاشرے میں اس تفریق کو برقرار رکھا گیا کیونکہ اس صورت میں ان کی حیثیت مستحکم اور مضبوط رہی اس دوہرے معیار کو مزید اس وقت اور تقویت ملی جب تعلیم کو مکمل طور پر اسلامی بنانے کا فیصلہ ہوا اور یہ اسلامی تعلیم عام اسکولوں اور تعلیمی

اداروں تک محدود ہے جبکہ حکمران طبقوں کے تعلیمی ادارے اس سے محفوظ ہیں کیونکہ ان میں اکثر انگلستان کے تعلیمی اداروں سے منسلک ہیں اور وہیں کا انصاب ان میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس طرح سے اسلام کے نام پر ایک طرف عوام کو خوش کردیا گیا تو دوسری جانب جدید تعلیم سے ان کا تعلق ختم کرکے انہیں اتنا پسماندہ بنا دیا گیا کہ وہ انگریزی میڈیم اسکولوں کے بچوں سے مقابلہ نہ کرسکیں۔

اگر ہمارے حکمران طبقوں میں تاریخ سے کچھ سیکھنے کا ارادہ ہے تو یہ وقت ہے کہ وہ تاریخ سے سبق سیکھیں کیونکہ ایک مرتبہ جب معاشرے میں زوال کا عمل شروع ہوجاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں امیر اور غریب دونوں ہی تباہ ہوتے ہیں کیونکہ کوئی طبقہ اس تباہی سے خود کو نہیں بچا سکتا معاشرے کے تحفظ اور بقاء کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں میں مفاہمت ہو اور ان میں ہم آہنگی کے جذبات ہوں' اور یہ اتحاد اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جبکہ معاشرے کے ہر طبقے اور فرد کو یکساں مواقع ملیں اور مراعات میں دوہرے معیار کو ہر سطح اور ہر جگہ سے ختم کرنا انتہائی ضروری ہے۔

بہرحال جب اہم اپنے معاشرے میں تعلیم کی حالت زار کو دیکھتے ہیں تو اس سے دکھ اور تکلیف کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باضابطہ طریقوں سے تعلیم کو یہاں تک پہنچایا گیا ہے تاکہ ان تمام کوششوں کو جن کے نتیجہ میں معاشرہ خود کو جہالت' مفلسی غربت بیماری اور بدعنوانی سے نجات پاسکتا تھا انہیں ختم کردیا گیا ہے کیونکہ معاشرے میں شعور و آگہی صرف تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور تعلیم ہی انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے آگاہ کرتی ہے اور اس میں یہ شدید خواہش پیدا کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے بنیادی حقوق حاصل کرلے بلکہ معاشرے میں ایک جمہوری معاشرے کے قیام کی جدوجہد کرے جو معاشرے کے ہر فرد کو یکساں موقع فراہم کرسکے تعلیم ہی سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ آمرانہ اور مطلق العنان ادارے اس کے وجود اور اس کی صلاحیتوں کے لئے زہر قاتل ہیں اس لئے ان کی جگہ ایسے ادارے اور روایات قائم ہوں جن میں عوام کی اکثریت کی نمائندگی ہو اور وہ اپنے معاملات خود طے کرسکیں ان تمام خواہشوں اور ارادوں اور امنگوں کو صرف اسی صورت میں ختم کیا جاسکتا تھا کہ تعلیم کی جڑیں کاٹ دی جائیں اور جہالت کو فروغ دیا جائے۔

تعلیم ایک مہذب معاشرے کا انتہائی اہم حصہ ہوتی ہے اور جب تعلیم کا نصاب بنایا جاتا ہے تو اس وقت معاشرے میں جو بھی معاشی و سیاسی مسائل ہوتے ہیں ان کی مناسبت

سے اس کو ترتیب دیا جاتا ہے تاکہ یہ معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرسکے اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ عالمی صورت حال کیسی ہے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا رخ کس طرف ہے؟ تاکہ ان کی روشنی میں ہم کس طرح سے اپنے معاشرے کے مفادات کا تحفظ کرسکیں ترقی کی رفتار جو دوسرے معاشروں میں ہے اگر اس کا ساتھ نہیں دیا گیا تو یقیناً" ہمارا معاشرہ پس ماندہ رہ جائے گا اور ترقی کی رفتار کا ساتھ اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب تک کہ تعلیم کو زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلا جائے اگر اپنی قومیت ضروریات اور عالمی رجحانات کو نظرانداز کیا گیا اور اس سے علیحدہ ہٹ کر تعلیم کا نظام تشکیل دیا گیا تو اس صورت میں یہ ناممکن ہوگا کہ ہم جدید چیلنجوں کا سامنا کرسکیں اور ایسے ذہن پیدا کرسکیں جو بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے اہل ہوں۔

خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے تعلیم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ انہیں نہ صف خود کو نوآبادیاتی اثرات سے چھٹکارا پانے کی ضرورت ہے بلکہ سامراج کی نئی شکل سے مقابلہ بھی کرنا ہے جوانہیں معاشی اور ثقافتی طور پر غلام بنانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنے اندرونی مسائل کو بھی حل کرنا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ تعلیم کو ایسے خطوط پر ڈھالا جائے جو ان تمام ضروریات کو پورا کرے۔

اس سلسلے میں یورپ کے ملکوں اور امریکہ و روس کی مثال دی جاسکتی ہے جو اپنے نظام تعلیم کو مسلسل ضروریات کے تحت بدلتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے متعین وقت پر نظام تعلیم کا جائزہ لیا جاتا ہے نصاب کو دیکھا جاتا ہے اور اس کو وقت اور ضرورت کے تحت بدلا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے یہ اب اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ نصاب کو بار بار تبدیل کیا جائے اور جو بھی نئی تحقیق ہو اسے نصاب میں شامل کیاجائے اسی لئے یورپ' امریکہ اور روس نہ صرف سائنسی بلکہ سماجی علوم میں تیسری دنیا کے ملکوں سے بہت آگے ہیں۔

تیسری دنیا کے ملکوں اور خصوصیت سے پاکستان کاالمیہ یہ ہے کہ یہاں تعلیم کو نظرانداز کیاگیا ہے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ یہاں عوام کو تعلیم دی جائے اور معاشرے سے جہالت کا خاتمہ کیا جائے بدقسمتی سے پاکستان ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں خواندگی کی شرح بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے ہمارے ہاں کبھی بھی اس قسم کی کوششیں نہیں ہوئیں کہ تعلیم کو معاشرے کی ضروریات کے تحت تشکیل دیا جائے کیونکہ اگر تعلیم کو معاشرے کے علمی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے تو ایسا نظام تعلیم اپنی موت آپ مرجاتا ہے

برطانوی دور میں ہمارے معاشرے میں جو نظام تعلیم نافذ تھا وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس لئے ختم ہوگیا کہ اس میں جنگ کے بعد تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے کی ضروریات کے لئے کچھ نہ تھا اس کے بعد ہندوستان میں جو نیا شعور پیدا ہوا اس نے نظام تعلیم کی اہمیت کو ختم کردیا کیونکہ یہ نظام تعلیم صرف بابو پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا تھا لیکن آلیہ یہ ہے کہ اس کے زوال کے بعد اور آزادی کے بعد اس کی جگہ پر کرنے کے لئے کوئی نظام تعلیم تشکیل نہیں ہوا اور ہم اس قابل بھی نہیں رہے کہ کم از کم پڑھے لکھے بابو ہی پیدا کرسکیں اور اسی وجہ سے حکمران طبقوں کو نظام تعلیم کی پسماندگی کا خیال آیا اور ناممکن اصلاحات کے ذریعے اسے بہتر بنانے کا عمل شروع ہوا۔ لیکن اصلاحات کی ان کوششوں کی وجہ سے نہ صرف نظام تعلیم اور بگڑا بلکہ اس نے پورا معاشرے کو متاثر کیا اور خرابیاں و بدعنوانیاں معاشرے کے ہر پہلو میں تیزی سے نمودار ہونا شروع ہوگئیں۔

ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ جب بھی حکومت کی جانب سے نظام تعلیم کی اصلاح کی گئی تو اساتذہ سے نہ تو مشورہ کیا گیا اور نہ ہی انہیں اعتماد میں لیا گیا بلکہ یہ اصلاح کا پروگرام اعلیٰ افسران نے سرانجام دیا جو اس کو اپنی ذمہ داری اور مراعات سمجھتے تھے کہ معاشرے کے ہر پہلو میں ان کا عمل دخل ہو اس لئے ایوب خان کے زمانے سے لے کر اب تک جتنی تعلیمی اصلاحات ہوئیں اسی کے نتیجے میں رہا سہا تعلیمی نظام بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم کی اصلاح کرنے والوں کا تعلق جس طبقے سے تھا اس کی جڑیں ملک کے عوام سے کٹی ہوئی تھیں اس لئے وہ عوامی ضروریات اور عوامی مفادات کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے اس لئے ان کا تشکیل دیا ہوا نظام تعلیم ہماری سوسائٹی کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکا اور نئے نصاب کی تیاری میں جو خطیر رقم خرچ ہوئی اور جو کوششیں کی گئیں وہ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئیں۔

تعلیم کے زوال کے اسباب میں ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم عوامی امنگوں کی عکاسی نہیں کرتا اس میں نہ تو بنیادی حقوق کا تصور ہے اور نہ ہی جمہوری روایات کے فروغ کی گنجائش ہے اس لئے رد عمل کے طور پر ابتداء میں ہمارے تعلیمی اداروں میں آمرانہ طرز حکومت اور مطلق العنان اداروں کے خلاف طلبہ نے تحریکیں چلائیں تاکہ عوامی دباؤ کو تشکیل دے کر جمہوریت کی راہیں ہموار کی جائیں ان تحریکوں سے گھبرا کر حکمران طبقوں نے آہستہ آہستہ تعلیمی اداروں میں ایسے اقدامات کئے کہ طلباء میں بدعنوانی اور تعلیم سے دوری بڑھتی جائے، طلبی یونینوں پر پابندی عائد ہوئی، ثقافتی اور کلچر پروگرام ایک ایک

کرکے بند کیئے گئے مباحثوں کے موضوعات پر سنسرشپ عائد کی گئی سیاست کو تعلیمی اداروں میں شے ممنوع بنا دیا گیا اور طلباء کو رشوتیں دے کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء مختلف گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئے اور ایک طرف وہ سیاست دانوں کے ہاتھوں بطور ہتھیار استعمال ہوئے تو دوسری جانب حکومت کے اداروں نے انہیں پورا پورا بدعنوان بنایا اور آہستہ آہستہ طلباء کی پاکیزگی' ایمانداری' ہمت و بہادری اور نظم و ضبط کو چھین کر ان کا ایک ایسا تصور بنایا کہ جس میں طالب علم لٹیرا' بدمعاش اور غیرمہذب بن کر ابھرا اور اس کے ساتھ طلباء اور عوام میں اور طلباء اور اساتذہ میں جو محبت کا رشتہ قائم تھا وہ ختم ہوگیا تھا اور طلباء پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جانے کے بعد ان کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ عوام کی کسی بھی تحریک میں اپنے ساتھ ملائیں اس لئے تعلیمی ادارے جہاں سے ذہنی و فکری تحریکیں اٹھتی ہیں وہ بنجر اور ویران ہوگئے ' جمہوریت' آزادی اور حقوق کی باتیں عقل و فہم سے دور ہوگئیں طلباء میں کوئی ایسی صلاحیتیں باقی نہیں بچیں کہ وہ جمہوریت اور بنیادی حقوق کے لئے کوئی تحریک چلاسکیں۔ کس نے کھویا اور کس نے پایا؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ڈھونڈنے کی ہمیں ضرورت ہے۔

۱۹۷۷ء کے بعد سے تعلیم کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کا عمل شروع ہوا اور اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک کے نصاب میں تبدیلی کی گئی خصوصیت سے اسکول کے نصاب تعلیم کو یکسر بدل دیا گیا اور ہر مضمون میں چاہے وہ اردو ہو یا انگریزی' معاشرتی علوم ہو یا سائنسی علوم' ان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مضامین شامل کئے گئے۔ مثلاً" اردو کی چھٹی کتاب میں ۸ سبق مذہب کے بارے میں ہیں۔ اور باقی مضامین کا تعلق پاکستان کے حوالے سے ہے۔ نظموں میں زیادہ تر ملی نغمے ہیں یہ سلسلہ ہر جماعت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً" ساتویں جماعت کی اردو کی کتاب میں ادب اور زبان کے متعلق سبق ہوا کرتے تھے تاکہ طالب علم میں ادب و شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو اور وہ زبان کی خوبیاں اور اس کی لطافتوں کو سمجھ سکے ایک اور بات جس کا خیال رکھا جاتا تھا وہ یہ کہ زبان کو ابتدائی جماعتوں میں انتہائی سہل رکھا جاتا تھا اور ذخیرہ الفاظ میں آہستہ آہستہ اضافہ کیا جاتا تھا مگر ان نصابی کتابوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس کے نتائج ہمارے سامنے موجود ہیں کہ طالب علم اب نہ تو صحیح زبان لکھ سکتا ہے اور نہ اس کا تلفظ ہی ٹھیک رہا ہے۔

۱۹۷۷ء کے بعد سے تعلیم میں اسلام اور پاکستان کے بارے میں جو مواد شامل کیا گیا اس کی ابتداء نرسری جماعتوں سے شروع ہوجاتی ہے۔ اور یہی معلومات یونیورسٹی اور پروفیشنل

کالجوں میں انہیں بار بار دی جاتی ہیں ابتدائی کلاسوں میں اس کا اثر یہ ہوا کہ طالب علموں کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہوگیا کیونکہ کم عمر طالب علم اپنی ذہنی ترقی اور ارتقاء کے ساتھ ایسی چیزیں پڑھنا چاہتے تھے جس سے انہیں دلچسپی ہوتی ہے بچے ابتدائی دور میں فطرت سے متاثر ہوتے ہیں وہ پھولوں' درختوں اور جانوروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور جیسے جیسے وہ بڑھتے ہیں اور اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی لئے اگر فطرت اور ماحول سے ہٹ کر انہیں باتیں بتائی جائیں تو اس میں ان کی دلچسپی ختم ہوتی چلی جائے گی خصوصیت سے نرسری کے بچے جن کی عمر چار سال ہوتی ہے انہیں یہ خشک باتیں پڑھائی جائیں گی تو تعلیم سے ان کی دلچسپی کا ختم ہونا لازمی امر ہے۔

دوسرا اس کا نقصان یہ ہے کہ ہم بچے کو دوسری اہم معلومات جن کا تعلق عملی زندگی سے ہے۔ وہ نہیں پڑھاتے اور نہ ہی عالمی صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے دنیا میں جو کچھ ہوا ہے اور ہورہا ہے اس کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں لہٰذا اس کے دو نتائج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایسی نسل تیار ہورہی ہے جسے اپنے اردگرد اور دنیا کے بارے میں کچھ پتا نہیں مثلاً" انہیں اس کا تو علم ہوگا کہ قائد اعظم کو کون سا پھول پسند تھا؟ مگر اسے یہ پتہ نہیں کہ اسپین کے وزیراعظم حکومت کا کیا نام ہے۔ اور یا کہ اسپین کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس نظام تعلیم نے ان کو تنگ نظر فرقہ پرست اور بنیاد پرست بنا دیا ہے کیونکہ انہیں اور دوسری معلومات دی ہی نہیں گئی اس لئے ان کے ذہن کی ترقی کو محدود تعلیم کے ذریعہ روک دیا گیا ہے۔

نظام تعلیم کا یہ المیہ کہاں لے جائے گا؟ اور کیا اسے روکا جاسکتا ہے؟ اور اگر روکا جاسکتا ہے تو کس طرح یہ وہ اہم سوالات ہیں جن پر ہمیں اور ہر اس شخص کو جسے اس ملک اور معاشرے سے دلچسپی ہے۔ جسے اس ملک میں رہنا ہے اور جسے اپنے بچوں کو اس ملک میں پڑھانا ہے غور و فکر کرنا ہوگا اور ان کے حل اور جوابات کو تلاش کرنا ہوگا۔

OO

تاریخ اور مطالعہ پاکستان

ہندوستان کی سیاست میں جب بھی مسلمانوں کو متحد کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو ان کے معاشی' سماجی اور معاشرتی مسائل کی بنیادوں کو یک جا کرنے کی کوششیں نہیں ہوئیں اور نہ ہی ان مسائل کو زیادہ اہمیت دی گئی بلکہ مذہب کو علامت بنا کر برصغیر کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو جمع کیا گیا اس لئے تحریک پاکستان میں بھی مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر متحد کیا گیا اور تحریک کو موثر بنانے کے لئے ان میں مذہبی جوش و ولولہ زیادہ سے زیادہ پیدا کیا گیا۔

پاکستان بننے کے فوراً" بعد مسلمان اس مذہبی جذبے سے سرشار تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے قربانیاں دیں تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں اور اس امید پر سارے دکھ سہے کہ ان سے جس جنت ارضی کا وعدہ کیا گیا ہے وہ جلد ہی وجود میں آنے والی ہے لیکن ان کے یہ جذبات اس وقت آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونا شروع ہوگئے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے نئے حکمران برطانوی حکمرانوں سے زیادہ مختلف نہیں ان کے طور طریق عادات و اطوار اور رہن سہن بھی اسی طرح کا ہے جس کا تجربہ انہیں نو آبادیاتی دور میں ہوچکا تھا اور پھرا ہوا بھی یہی کہ جمہوری اداروں کے قیام اور مساوات کی بنیادوں پر مثالی معاشرے کی بجائے یہاں بیوروکریسی 'فوج اور سرمایہ دار طبقوں نے آپس میں مل کر عوام کے خلاف ایک طاقت ور محاذ بنایا اور اس میں کامیاب ہوگئے کہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اس ملک پر حکومت کرسکیں۔ اس لئے جابرانہ نو آبادیاتی ادارے' قوانین اور روایات اسی طرح سے برقرار رکھی گئیں' کیونکہ ان کی مدد سے حکومت کرنے میں سہولت اور آسانی تھی۔

حکمران طبقوں کی اس فرعونیت کے خلاف عوام میں تلخ جذبات پیدا ہوئے یہ تلخی اور مستقبل سے مایوسی اس سے اور بڑھی جب یہ عوام کے معاشی و سماجی مسائل حل کرنے میں ناکام ہوگئے اور جب ملک سے جمہوری روایات اور قدروں کو ختم کرنے کا عمل شروع ہوا' دستور ساز اسمبلی ٹوٹی' ملک کا وزیراعظم برطرف ہوا اور اس فیصلے کی توثیق ہماری عدالت عالیہ نے کی۔ سیاستدانوں کے درمیان اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کی دوڑ شروع ہوئی اور آئے دن

حکومتیں بدلنی شروع ہوئیں تو اس سیاسی عمل سے ملک میں عدم تحفظ کا احساس ہوا اور پھر جب ملک میں ایوب خان کا پہلا مارشل لاء نافذ ہوا تو اس نے ملک سے جمہوریت انسانی عزت و وقار اور آزادی کی تمام قدروں کو نیست و نابود کرنے کا عمل شروع کردیا اس کے بعد سے آنے والی تمام جابرانہ و آمرانہ حکومتیں معاشرے کی بنیادی خرابیوں کو ختم کرنے میں ناکام رہیں' غربت و مفلسی جہالت و بے روزگاری اور بیماری و لاقانونیت میں کمی کی بجائے مسلسل اضافہ ہوا۔

ہماری نئی نسل جس نے اس سیاسی' معاشی اور سماجی ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں اپنے عہدے کی ناآسودگی' پریشانی بے اطمینانی اور بے چینی پوری طرح سرایت کرگئی لیکن اس ذہنی انتشار اور بے چینی نے اس میں سیاسی شعور اور معاشی و سماجی حالات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی دی اس لئے اس میں یہ احساس پیدا ہوا کہ جن بنیادوں پر اس ملک کو حاصل کیا گیا تھا۔ اور جن نعروں کے سہارے اسے اب تک زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے یہ کھوکھلے اور بے جان ہیں اور ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ عوام پر فکر و آگہی کے دروازے بند کئے جائیں۔ اس لئے ان مسائل میں پروان چڑھنے والی اس نسل نے ان بنیادوں کو چیلنج کرنا شروع کردیا جن پر اس ملک کی بنیاد تھی اس نے ان تمام روایات و اقدار کے خلاف بغاوت کی جن کے سہارے ہمارے حکمران طبقے اپنی قوت و طاقت اور اقتدار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہمارے حکمرانوں کی جانب سے جو رد عمل ہوا وہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی نئی نسل کی بغاوت' شورش اور بے چینی کا سدباب کرنے کے لئے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا کہ نظام تعلیم میں تبدیلی کی جائے اور اس میں اسلام اور پاکستان کے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد شامل کیا جائے تاکہ اس سے نوجوان نسل کے ذہنوں کو تسخیر کرکے انہیں قابو میں کیا جاسکے اس پس منظر میں "نظریاتی سرحدوں" کے تحفظ کا تصور تشکیل دیا گیا اور اسی مقصد کے لئے "اسلامیات و مطالعہ پاکستان" کے دو نئے مضامین اسکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح پر لازمی کئے گئے تاکہ "صالح مسلمان" اور "محب وطن پاکستانی" پیدا کئے جائیں اس سلسلے میں "یونیورسٹی گرانٹ کمیشن" نے جو نوٹیفکیشن جاری کیا اس میں کہا گیا کہ :۔

مطالعہ پاکستان کا مضمون لازمی طور پر تمام بیچلرز کی ڈگری حاصل کرنے والوں کو پڑھایا جائے اور کسی طالب علم کو اس وقت تک ڈگری نہیں ملے گی جب تک کہ وہ مطالعہ پاکستان

میں کامیابی حاصل نہ کر لے اس سلسلے میں یہاں تک کیا گیا کہ پروفیشنل کالجوں میں بھی مطالعہ پاکستان کو لازمی مضمون قرار دیا تاکہ انجینیرز اور ڈاکٹر اپنی پیشہ وارانہ قابلیت میں ماہر ہوں یا نہ ہوں مگر یہ کہ وہ ایک "محب وطن پاکستانی" ضرور ہوں۔

اس کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ ناشروں اور پبلشروں کی بن آئی جنہوں نے نام نہاد تجربہ کار پروفیسوں اور دانش وروں سے مطالعہ پاکستان پر راتوں رات کتابیں لکھوا کر خوب دولت کمائی۔ ظاہر ہے ایسی کتابوں کی اشاعت کا مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا اس لئے ان کی چھپائی اور خوبصورتی پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا کہ کتاب میں زبان و بیان' واقعات کی تشریح اور تاریخ کی تعبیر و تفسیر وہ ہو جس سے حکمران طبقوں کے مفادات کا تحفظ مل سکے۔ اور پاکستان بننے کے بعد سے اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کو صحیح ثابت کیا جاسکے اسکے علاوہ اس موضوع پر حکومت کے تحقیقی و تعلیمی اداروں کی جانب سے بھی کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جو مواد اور انداز کے اعتبار سے ان سے مختلف نہیں ہیں۔

برصغیر ہندوستان کی تحریک آزادی پر اس دوران میں ہندوستانی بیرونی ملک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں بہت کام ہوا ہے نئے تحقیقی مواد کی روشنی میں بہت سے پرانے مفروضے ختم ہوچکے ہیں برطانوی حکومت کے سرکاری کاغذات ' اس عہد کی نامور شخصیتوں کی ڈائریاں' سوانح حیات اور نجی خطوط کی روشنی میں بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں وقت کے گزرنے کے بعد جن حالات پر پردہ پڑا ہوا تھا جو واضح اور صاف نہیں تھے اب نئی تحقیق کے بعد ان واقعات کی تہہ میں ہونے والے عوامل صاف نظر آنے لگے ہیں اس لئے ان نئے انکشافات نے برصغیر کی جدید تاریخ کو یکسر بدل دیا ہے۔ مثلاً" ایک زمانے تک ہنٹر کی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کی بنیاد پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو پس ماندہ خیال کیا جاتا تھا لیکن اب نئی تحقیق و اعداد و شمار کے بعد یہ ثابت کردیا گیا ہے کہ ہنٹر کے مشاہدات صرف بنگال کی حد تک صحیح تھے اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی حالت اس قدر پسماندہ نہیں تھی یا تقسیم بنگال کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے جب کہ نئے مواد کی روشنی میں اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس کے پس منظر میں بنگال کے انقلابیوں کی طاقت کو ختم کرنا اور ہندو مسلم یک جہتی کو توڑنا تھا اور یہ کہ ہندو مسلمان متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے لئے یہ تقسیم مالی لحاظ سے نقصان دہ تھی اور اس لئے اس کی انہوں نے مخالفت کی یا ۱۹۰۶ء کے شملہ وفد کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں

مسلمانوں کے نمائندوں نے مسلمان قوم کی نمائندگی کی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وفد کے اراکین کو کیا کسی انتخاب کے ذریعے مسلمانوں نے منتخب کیا تھا یا یہ کسی اور ذریعے سے انہیں اپنا نمائندہ چنا تھا یا یہ کہ انہوں نے خود کو زبردستی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا نمائندہ فرض کرلیا تھا اس طرح "قرار داد پاکستان" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے متفقہ طور پر پاس کیا گیا تھا لیکن یہ کہیں نہیں ملتا کہ کیا لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے حق میں ووٹ دیا یا باآواز بلند سب نے "ہاں" کہہ کر اس کی توثیق کی یا یہ محض فرض کرلیا گیا اور اسے پاس قرار دے دیا گیا اس طرح دوسرے موضوعات پر جن دانشوروں نے نئے انداز سے روشنی ڈالی ان میں سے ایف رابن سن' پیٹر ہارڈی' پروفیسر محمد مجیب' تارا چند' گوپال' خالد بن سعید' مشیر الحق' پی براس اور این کے چین قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے برصغیر ہندوستان کی تاریخ آزادی کو نئی بنیادوں پر لکھا اور نئے سرے سے اس کی تشکیل کی۔

تاریخ نے نظریات میں ان تمام تبدیلیوں کے باوجود ہمارے مورخ اور دانشور اب تک تاریخ کو مذہبی فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھ رہے ہیں اور ہر تاریخی واقعہ کی توضیح و تشریح مذہبی تنگ نظری سے کرتے ہیں تاریخ کا تجزیہ اور واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس عہد کے معاشی و سماجی اور معاشرتی رجحانات و اثرات کو بالکل فراموش کردیتے ہیں اور اس حقیقت سے پردہ نہیں اٹھاتے کہ مسلمان معاشرے کے مختلف طبقوں کے مفادات کیا تھے؟ اور تحریک پاکستان کن طبقوں کے مفادات کو پورا کرنے کی غرض سے چلائی گئی تھی۔ تاریخ کا یہ طبقاتی نقطہ نظر ظاہر ہے ہمارے حکمران طبقوں کے لئے انتہائی خطرناک ہے کیونکہ یہ نقطہ نظر عوام میں صحیح تاریخی شعور پیدا کرے گا اور وہ اس کی روشنی میں ماضی میں ہونے والے واقعات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے اور یہی شعور ان کی راہنمائی کرے گا کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے یہ ماضی میں ہونے والے واقعات کا منطقی نتیجہ ہے۔

○○

مسلم شناخت

ابتدائیہ

برصغیر ہندوستان میں مسلم شناخت کو سماجی' سیاسی اور مذہبی شعور کی بنیادوں پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اور انہیں بنیادوں پر اس کا تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سماجی طور پر مسلمان معاشرے کا تعلق ہے تو یہ کبھی بھی ہندوستان میں متحدہ نہیں رہا' اسی طرح مذہبی طور پر بھی مسلمانوں کے اتحاد کو وقتاً" فوقتاً" سیاسی ضرورتوں کے تحت ابھارا جاتا تھا۔ مثلاً" جب مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں سے جنگ کرنی پڑتی تھی تو اس وقت وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے مذہبی نعرے بلند کرتے تھے اور حکمران طبقے عام مسلمانوں کے جذبات کو اس طرح ابھارتے کہ جیسے ان کی حکومت اور تخت و تاج نہیں بلکہ اسلام اور اس کے ماننے والے خطرے میں ہیں۔ لیکن جیسے ہی خطرات ٹلتے تو وہ اسلام اور شریعت کو بھول جاتے تھے اور جب بھی شریعت ان کے مطلق العنان طرز حکومت میں رکاوٹ بنتی تو یہ اسے فراموش کردیتے تھے۔ اس لئے برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت موجود تو تھی۔ لیکن اسے صرف سیاست کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور ضرورت ختم ہونے کے بعد اس سے غفلت برتی جاتی تھی۔

جہاں تک مسلمانوں میں سیاسی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ برطانوی دور حکومت میں پیدا ہوئی کہ جب ہندوستان میں جمہوری ادارے' روایات اور قدریں آئیں اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں شدت کے ساتھ یہ احساس بھی ہوا کہ جمہوری نظام حکومت میں وہ اقلیت میں رہتے ہوئے کبھی بھی اقتدار حاصل نہیں کرسکیں گے' اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ اس لئے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں ان کے سامنے اقلیت اور اکثریت کا سوال تھا اور اسی نے آگے چل کر اقلیت کے کمپلکس سے نجات دلا کر' دو قومی نظریے کو پیدا کیا کیونکہ اقلیت' اکثریت کے مقابلے میں کبھی بھی اہمیت اختیار نہیں

کر سکتی تھی۔ مگر جب انہوں نے خود کو ایک قوم کہا تو پھر مساوی بنیادوں پر انہوں نے حقوق کا مطالبہ کیا۔ اور یہی مطالبہ آگے چل کر ہندوستان کی تقسیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔

کیونکہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی' اس لئے ایک طویل اقتدار کی وجہ سے یہاں کے طبقہ امراء' اشراف اور طبقہ اعلیٰ کے لوگوں نے ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی راہنمائی کی۔ اور اپنے سیاسی و معاشی اور سماجی مفادات کے تحت انہوں نے مسلم شناخت کے اصول متعین کئے۔ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں نے ذہنی طور پر ان کی راہنمائی کو قبول کرتے ہوئے ان کے منصوبوں پر عمل کیا اور مختلف تحریکوں میں ان کی حمایت کی۔

سلطنت اور مغل دور میں مسلم شناخت

ہندوستان میں مسلمان معاشرہ تین عناصر پر مشتمل تھا۔ فاتحین' مہاجرین اور مقامی مسلمان۔ ان میں فاتحین خود کو سب سے برتر اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے فتوحات کے ذریعے اقتدار قائم کیا تھا اس لئے ملک کے ذرائع میں ان کا حصہ سب سے زیادہ تھا اس لئے وہ حکمران طبقے بن گئے تھے اس کے بعد وہ لوگ تھے کہ جو ہجرت کر کے آئے تھے چونکہ ان کا تعلق ایران وسط ایشیا سے تھا۔ اس لئے نسلی طور پر وہ فاتحین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انتظامیہ میں ان کی مدد کرتے تھے۔ ایک مرحلے پر فاتحین اور مہاجرین آپس میں مل کر ایک ہوگئے اور مساوی طور پر انہوں نے سماجی تعلقات قائم کرلئے مگر وہ مسلمان جو مقامی تھے' اور اپنے قدیم مذاہب کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں آئے تھے' ان کے اور غیر مقامی حکمران طبقوں کے درمیان کبھی بھی سماجی طور پر مساوی بنیادوں پر تعلقات قائم نہیں ہوئے اور انہیں مسلمان معاشرے میں کم تر درجے پر رکھا گیا۔

اس لئے سلطنت حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمان معاشرہ نسلی بنیادوں پر بٹا ہوا تھا' اور ابتدائی مسلمان فاتحین جنہوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ (۱۲۰۶ء) میں اپنی شناخت پر فخر کرتے تھے۔ یہ اس لئے بھی کہ وہ حکومت اور معاشی مراعات دوسرے مسلمان گروہوں کو دینے پر تیار نہیں تھے۔ یہی صورت حال ترکوں کے بعد بھی جاری رہی۔ اور جب افغانوں نے بہلول لودھی (۱۴۸۹-۱۴۵۱) کی سربراہی میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے اقتدار اور مراعات کو صرف افغانوں میں محدود کردیا اس لئے بہلول لودھی نے افغانستان سے افغان قبائل کو اپنی مدد کے لئے بلایا' اور پہلے سے موجود مسلمانوں پر جو نسلی

طور پر ان سے علیحدہ تھے ان پر اعتماد نہیں کیا۔

اس سارے عمل میں مقامی مسلمانوں کو اقتدار اور مراعات سے بالکل محروم رکھا گیا اور نہ تو انہیں حکومت میں اعلیٰ عہدے و منصب دیئے گئے اور نہ سماجی طور پر ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا گیا' ضیاء الدین برنی (۱۴ ویں صدی کے ایک مورخ) نے اپنی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں اس کی مثالیں دیں ہیں کہ جب دہلی کے سلاطین نے مقامی مسلمانوں کو ان کی ذہانت و قابلیت کے باوجود اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں کیا۔ برنی نے جو کہ خود بھی نسلی برتری کا زبردست قائل تھا اپنی ایک اور کتاب "فتاویٰ جہانداری" میں مسلمان حکمرانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ نسلی طور پر کم تر مسلمانوں کو انتظامیہ میں اعلیٰ عہدے نہ دیں' بلکہ کم تر ذات کے مسلمانوں کو یہ اجازت بھی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ کیونکہ تعلیم ان کے دماغ کو خراب کردے گی۔ اس لئے ان کے لئے صرف معمولی مذہبی تعلیم کہ جس کا تعلق نماز' روزہ اور معمولی مسئلہ و مسائل سے ہو۔ وہ ان کو دی جائے تاکہ اس کے ذریعے وہ مسلمان رہ سکیں۔

سلطنت کے دور میں نسلی برتری کا نظریہ' اور نسلی شناخت اس لئے پیدا ہوئی کہ ترکوں نے جو علاقے فتح کئے تھے۔ وہ محدود تھے۔ اور اس سے ملنے والی آمدنی بھی کم تھی اور ایک محدود گروہ کے مصارف کے لئے کافی تھی' اس وقت تک انتظامیہ بھی زیادہ وسیع نہیں ہوئی تھی' اور اس میں کم لوگوں کو اعلیٰ عہدے مل سکتے تھے۔ اس لئے ترک فاتحین نے مراعات کو اپنے لئے محفوظ کرلیا' اور دوسرے مسلمانوں کو ان سے محروم کردیا۔

جب ہندوستان میں مغلوں نے حملہ کیا تو انہوں نے ایک مسلمان حکمران خاندان کو شکست دے کر حکومت حاصل کی (۱۵۲۶ء) مگر ان کی آمد اور ان کی فتوحات ہندو اور مسلمانوں دونوں حکمرانوں کے لئے خطرے کا باعث ہوئیں۔ اس لئے مسلمان افغان' اور ہندو راجپوت مغلوں کے خلاف متحد ہوگئے اور کنواہہ کی جنگ میں (۱۵۲۷ء) دونوں مل کر مغلوں کے خلاف لڑے۔ جب ہندوستان میں مغلوں نے اپنی حکومت قائم کرلی تو اس کے نتیجے میں مسلمان معاشرے کے سماجی ڈھانچے میں زبردست تبدیلی آئی۔ کیونکہ مغلوں کے بعد شمال مغربی سرحدیں کھل گئیں اور ایک بڑی تعداد میں ایرانی کلچر اور فارسی زبان جو افغانوں کے دور میں روبہ زوال تھی۔ اس کو دوبارہ نئی زندگی مل گئی' اور اس کلچر کی بنیاد پر غیر ملکی مسلمانوں نے اپنا طاقت ور گروہ تشکیل دیا کہ جنہوں نے مقامی مسلمانوں کو بالکل خارج کردیا۔ یا انہیں اس ڈھانچے میں کم تر مقام دیا۔ چنانچہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر باہر کے

لوگوں کا تقرر ہونے لگا۔

مغل اپنے سفید رنگ کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس لئے رنگ کی بنیاد پر بھی وہ خود اور مقامی مسلمانوں کو جو کالے ہوتے تھے' امتیاز کرتے تھے۔

جب مسلمان معاشرے میں غیر ملکی ہونا باعث فخر ہوگیا' تو مقامی مسلمانوں نے بھی اپنے رشتے ایرانی و عرب خاندانوں سے جوڑنا شروع کردیئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف مذہب کی تبدیلی سے ان کا سماجی مقام نہیں بڑھتا تھا اور معاشرے میں ان کے ساتھ غیر مساوی سلوک ہوتا تھا۔ اس لئے وہ نسلی طور پر کوشش کرتے تھے کہ حکمران طبقوں میں شامل ہوجائیں۔

مغل معاشرے کا سماجی ڈھانچہ اس وقت بدلا کہ جب مغل سلطنت فتوحات کے نتیجے میں پھیل گئی۔ اور اسے انتظامیہ کے لئے اور زیادہ لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۰) نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ سلطنت کو صرف غیر ملکی مسلمانوں کی مدد سے زیادہ عرصہ نہیں چلایا جا سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ مغل سلطنت کو ہندوستانی بنایا جائے اور مغل امراء کے طبقے کو وسیع کیا جائے۔ اس مقصد کے تحت اس نے راجپوتوں کو مغل سلطنت میں شامل کرکے انہیں مغل امراء کا ایک خاصہ بنالیا۔ لیکن اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ جب تک غیریت اور فرق کی علامتیں ختم نہیں ہونگی اس وقت تک ان میں اپنائیت کا احساس نہیں ہوگا۔ اس لئے اس نے ہندوؤں پر سے مذہبی ٹیکس ختم کئے۔ اور فرق کی جو جو علامتیں تھیں انہیں ختم کیا تاکہ یہ ملاپ مساوی سطح پر ہو۔ لیکن اس کے سماجی ڈھانچے میں نہ تو مقامی مسلمانوں اور نہ ہی نچلے ذات کے ہندوؤں کے لئے کوئی جگہ تھی۔ مغل امراء کے لئے راجپوت امراء کا ملاپ قبول تھا' مگر وہ نچلی ذات کے مسلمانوں کو برابر کی سطح پر لانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اکبر کے بعد اس کی اس پالیسی کو اس کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ اورنگ زیب نے بھی کہ جو ہندوؤں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ انہیں مغل انتظامیہ میں رہنے دیا۔ اگرچہ اس نے اس بات کی ضرور کوشش کی مذہبی اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں میں یک جہتی پیدا کرے۔ مگر اس کی وہ تمام کوششیں کہ مذہبی بنیادوں پر مسلم شناخت قائم ہو۔ ناکام ہوگئیں۔

سلاطین اور مغلوں کے عہد میں ایسی کوئی علامت نہیں تھی کہ جو مسلمان معاشرے کو متحد کرکے رکھے۔ اور چونکہ معاشرے کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں کوئی معاشی مفادات بھی مشترک نہیں تھے۔ اس لئے ان میں اشتراک پیدا نہیں ہوا' اور معاشرہ برادریوں' ذاتوں

' پیشوں اور طبقوں میں بٹا رہا۔ اگر چہ اس پورے دور میں یہ ضرور ہوا کہ علماء مسلمانوں کی شناخت کو مذہبی بنیادوں پر ابھارنے کی کوشش میں مصروف رہے' اور ہندوستان کے معاشرے کو انہوں نے مومن و کافر میں تقسیم کئے رکھا۔ اور مسلمانوں کو تنبیہ کرتے رہے کہ وہ ہندوؤں کی رسومات کو اختیار نہ کریں۔ اور اپنے مذہب و ثقافت کو خالص رکھیں۔ مگر اس میں بھی انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

علماء کا رویہ ان مقامی مسلمانوں کی طرف کہ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر بہت سی ثقافتی و سماجی رسومات و عادات کو باقی رکھا' بڑا مخالفانہ تھا' اور وہ انہیں آدھا مسلمان اور آدھا ہندو سمجھتے تھے۔ علماء کی دلیل یہ تھی کہ اصل اسلام کو صرف عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے' اس لئے مقامی مسلمانوں کو پورا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا مقامی کلچر مکمل طور پر ترک کریں' عربی و فارسی کلچر اختیار کریں۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے غیر ملکی مسلمان خالص اور صحیح اسلام کے پیرو کار تھے جب کہ مقامی مسلمان مذہب میں ملاوٹ کا شکار تھے۔ اور مسلمان ہونے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتے تھے۔

چونکہ اس دور میں (۱۷۰۷ء تک) ہندوستان میں مسلمان طاقت اپنے عروج پر تھی' اور انہیں کسی اندرونی خطرات کا بھی سامنا نہیں تھا۔ اس لئے حکمران طبقوں نے اس بات کو ضروری نہ سمجھا کہ مذہبی' سیاسی' یا سماجی بنیادوں پر علیحدہ مسلم شناخت کو قائم کیا جائے۔ صرف اکبر کے زمانے میں کہ جب اس نے راجپوتوں کو حکومت میں شامل کیا تو اس پر کچھ علماء نے اس کی مذہبی' سیاسی' اور سماجی اصلاحات کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ معاشرے ہیں۔ مگر چونکہ حکمران طبقوں کے مفادات اکبر اور اسکی پالیسی سے وابستہ تھے اس لئے انہوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا' اور نہ مسلمان عوام میں کوئی بغاوت ہوئی۔

اگر چہ اورنگ زیب نے اپنے طور سے یہ کوشش ضرور کی کہ مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کو ایک فقہ کے تحت متحد کر دیا جائے۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے علماء کے ایک بورڈ کے ذریعے فتاویٰ' عالمگیری کی تدوین کرائی مگر اس کے بعد جو سیاسی انتشار کی لہر شروع ہوئی تھی' اور جو ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ تھا' اس میں یہ کوشش ڈوب کر رہ گئی۔

آخری عہد مغلیہ

آخری عہد مغلیہ میں جبکہ سیاسی طاقت روبزوال تھی' تو اس کے ساتھ ہی مسلمان امراء

کے اقتدار میں بھی دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔ ایران وسط ایشیا سے جو اب تک مہاجرین مغل دربار میں آتے تھے ان کے آنے کا سلسلہ بھی بند ہوگیا کیونکہ اب دربار اس حالت میں نہیں تھا کہ ان کی سرپرستی کرسکے۔ ان کی آمد کے بند ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک ایرانی ثقافت اور فارسی زبان کو جو نئی زندگی ملتی رہتی تھی' اس کا خاتمہ ہوا فارسی زبان کا اثر کم ہوا۔ اور اس کی جگہ مسلمان امراء نے اردو زبان کو دی۔ اس کے ساتھ ہی اب تک غیر ملکی مسلمانوں کا جو اقتدار قائم تھا وہ ٹوٹا اور مقامی مسلمانوں نے بھی اپنا سماجی رتبہ بڑھایا اور ان کے مقابلے پر آئے اور اس فرق میں جو اب تک شدت سے قائم تھا کمی آئی۔ اسی دوران میں ہندوستان کے سیاسی حالات میں زبردست تبدیلی آئی' ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مسلمان امراء کو کمزور کرنا شروع کردیا اور پلاسی (۱۷۵۷ء) بکسر (۱۸۰۳ء میں) انگریزی کا دہلی پر قبضہ ہوا' تو مغل بادشاہ کی حیثیت ایک کھلونے کی ہو کر رہ گئی۔ ان حالات میں شاہ غلام دوم (۱۸۰۶) کے بعد ہندوستان میں یہ رسم چلی کہ مسجدوں میں عثمانی خلیفہ کا نام پڑھا جانے لگا' اگرچہ خلیفہ کا نام اس سے پہلے بھی خطبے میں پڑھا جاتا تھے مگر اس وقت اس کی حیثیت دوسری تھی' اکثر سلاطین اپنی حکومت کو جائز بنانے کے لئے خلیفہ کا نام خطبے میں پڑھواتے تھے۔ مگر مغلوں کے زمانے میں یہ دستور ختم ہوگیا تھا۔اب دوبارہ اس کے شروع ہونے سے مسلمان معاشرے میں اس ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ مغل بادشاہ کی کمزوریوں کے بعد اپنے تحفظ کے لئے اور دین کے دفاع کے لئے عثمانی خلیفہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک دوسری تبدیلی جو اس زمانے میں آئی وہ یہ کہ سیاسی طاقت کی غیر موجودگی میں علماء کا اثر رسوخ اور طاقت بڑھی' اور انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کی وجہ ان کی مذہب سے دوری کو قرار دیا۔ اور مسلمان معاشرے کو جو خطرات درپیش تھے ان کے پیش نظر انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ملکی حالت کو سنبھالا جائے' ان کی اصلاح کی جائے اور ان میں اتحاد پیدا کیا جائے تاکہ وہ ان خطرات کا مقابلہ کرسکیں۔

اس سلسلے میں سید احمد شہید (۱۸۳۱ء) کی جہاد تحریک اور حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک قابل ذکر ہیں' انہوں نے اسلام کے احیاء کی غرض سے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمان معاشرے میں جو ہندو رسومات آگئی ہیں اور جو توہمات جڑ پکڑ گئے ہیں' انہیں نکال کر خالص اور اصلی اسلام کو لایا جائے' ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے اسلامی ریاست کا قیام انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ ان دو تحریکوں کی وجہ سے ہندوستان کے

مسلمانوں کی اسلامی بنیاد پر شناخت ابھری۔

اس کے علاوہ دو باتوں نے اور مسلمانوں میں مذہبی بنیاد پر علیحدہ شناخت کو ابھارنے میں مدد دی: ان میں ایک تو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں تھیں' اور دوسری ہندوؤں میں احیاء کی تحریکیں تھیں۔ ان دونوں سرگرمیوں نے مسلمان معاشرے کو خطرے میں ڈال دیا ایک تو یہ ڈر کہ انہیں عیسائی بنا لیا جائے گا اور دوسرا یہ ڈر کہ اب ہندو اگر بیدار ہوگئے تو وہ ان پر حکومت کرنے لگیں گے۔ اس لئے ان دو خطروں نے انہیں اتحاد اور اشتراک پر مجبور کیا۔ اور اس صورت حال میں علماء کا اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا اور انہوں نے مسلمان معاشرے کی راہنمائی کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھال لیا۔ اس لئے اس عہد میں مسلمان سیاسی و سماجی و معاشی مسائل کے حل کے لئے علماء سے رجوع کرتا تھا اور ان سے فتویٰ لیتا تھا' مثلاً" یہ کہ انہیں انگریزی پڑھنی چاہئے یا نہیں' ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی جائے یا نہیں اور یہ کہ ہندوستان سے دارالحرب ہے یا دارالاسلام - یہ بیرونی و اندرونی خطرات تھے کہ جنہوں نے مسلمان معاشرے کے تمام طبقوں کو بیدار کردیا۔ اور ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان میں مذہبی بنیادوں پر اپنی علیحدہ شناخت کو قائم کیا۔ اس لئے اس زمانے میں مدرسہ' مسجد اور خانقاہ مسلمانوں کی شناخت کی علامتیں بن گئیں۔

لیکن مذہب کے احیاء اور سیاسی طاقت کے قیام کی تمام امیدیں اس وقت ختم ہوگئیں جب سید احمد شہید کو بالا کوٹ کے مقام پر شکست ہوئی' اور جہاد تحریک کے پیرو کار برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ فرائضی تحریک کو اس طرح سے کچلا گیا کہ بنگال کے مسلمانوں میں جدوجہد کے تمام جذبات ختم ہوگئے' اور ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں مسلمانوں پر ایسی افتاد پڑی کہ ان میں مزاحمت کے تمام ولولے ختم ہوگئے۔

برطانوی دور

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد تمام ہندوستان پر اداسی کی لہر چھاگئی۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ انہیں بری طرح کچلا گیا اور ستایا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خود کو انتہائی مجبوری' لاچاری اور ستم زدگی کی حالت میں پایا۔ ابھی وہ اس سے پوری طرح سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ برطانوی اسکالرز کی طرف سے ایک نیا چیلنج آیا انہوں نے اسلام پر تنقید کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ موجودہ زمانے کے مطابق نہیں اور یہی

مسلمانوں کی پس ماندگی کی وجہ ہے۔

اب تک مسلمان اس قسم کی تنقید کے عادی نہیں تھے کیونکہ جب تک ہندوستان میں ان کی حکومت رہی اسلام پر اس قسم کے اعتراضات کسی نے نہیں کئے تھے' لیکن جب اس کی شدت اور دلائل کے ساتھ اعتراضات کئے گئے تو اس نے دہشت زدہ کردیا' اور مسلمان تعلیم یافتہ طبقے نے دوبارہ اس تنقید کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ کیا اور تاریخ بھی پڑھی۔ تاریخ کے اس مطالعے نے سنہرے ماضی کو دریافت کیا اور انہوں نے مغرب کو جواب دیتے ہوئے جو نقطہ نظر اختیار کیا وہ یہ تھا کہ یورپ کی ترقی اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ انہوں نے مسلمان سائنس دانوں اور اسکالرز سے سیکھا۔ مسلمانوں نے اپنے پورے دور حکومت میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مذہبی طور پر انہیں کبھی بھی ہراساں نہیں کیا۔ مسلمانوں نے ادب' سائنس' فنون اور فن تعمیر میں جو اختراعات کیں ان کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن نے ترقی کی۔ تاریخ کے اس نقطہ نظر کو مقبول بنانے کی غرض سے تاریخی ادب تخلیق ہوا' جس میں سستے ناول اور کتابوں سے لے کر تحقیقی مقالے تک سب ہی شامل تھے۔ اس سنہرے ماضی کی دریافت نے مسلمان معاشرے کو پناہ دی۔ عباسیوں کی شان وشوکت ' اور اسپین کے مسلمانوں کے کارناموں نے ان کی شکست کے زخموں کو بڑی حد تک مندمل کیا' اور ان میں اعتماد اور فخر کو پیدا کیا۔ لیکن ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے عہد سلاطین اور مغلیہ دور کو کوئی اہمیت نہیں دی' ان کے لئے وہ ماضی جو ان سے دور تھا وہ زیادہ جاذب اور دلکش تھا بمقابلہ اس ماضی کے جو انہیں ورثے میں ملا تھا' اور جس کے وہ شکار تھے۔ یہ بعد میں ہندوستانی قومی تحریک کے نتیجے میں ہندو مورخوں کی وجہ سے منظر عام پر آیا۔

اسلامی ماضی کی محبت اور فخر کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان خود کو اسلامی دنیا کا ایک حصہ سمجھنے لگے' اور عظیم مسلم شناخت نے ان کی ہندوستان شناخت کو مدھم کردیا اسلامی دنیا سے ان کے تعلق اور جذبات کا اظہار عثمانی ترکی سے محبت اور لگاؤ کی صورت میں ہوا۔ اگرچہ اس وقت تک بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ترکی کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں تھی' لیکن مغلوں کہ جگہ بہت جلد عثمانی ترکی نے لے لی۔ سید احمد خان نے مسلمانوں کے ان جذبات کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ :" جب مسلمانوں کی بہت سے ریاستیں تھیں' تو ہمیں اس وقت کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا' جب کہ ان میں کوئی ایک ختم ہوجاتی تھی' لیکن اب اگر ترکی کی فتح کرلیا گیا تو ہمیں سخت صدمہ ہوگا' کیونکہ یہ ہماری آخری بڑی طاقت

ہے۔"

بلقان کی جنگوں کے دوران (۱۹۱۱-۱۲) جب کہ ترکی کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا' تو اس وقت عظیم مسلم شناخت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس کا اظہار مولانا محمد علی جوہر کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کا دل فیفی کے شہری کے ساتھ تہران کے ایرانی کے ساتھ اور استنبول کے ترک کے ساتھ دھڑکتا ہے" اس زمانے میں الہلال' زمیندار' ہمدرد' کامریڈ اور اردوئے معلی میں جذباتی مقالات و مضامین کے ذریعے مسلمانوں میں مذہبی جوش و خروش پیدا کیا گیا' اس کا اثر یہاں تک ہوا کہ بہت سے سیکولر مسلمان بھی مذہبی ہوگئے اور انہوں نے داڑھیاں رکھ کر اور مذہبی رسومات ادا کرکے اپنے مذہبی ہونے کا ثبوت دیا۔

جب ہندوستان میں خلافت تحریک چلی تو اس نے عظیم مسلم شناخت کو متوسط طبقے اور نچلے طبقے تک پھیلادیا اور ساتھ ہی علماء اور مغربی تعلیم یافتہ دونوں متحد ہوگئے اور ۱۹۱۸ء کے اجلاس میں مسلم لیگ نے ہندوستان کے مشہور علماء کو دعوت دی۔ اس موقع سے علماء نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ان کے اثر و رسوخ میں کمی آگئی تھی اور ان کا دائرہ صرف مذہبی و سماجی معاملات تک محدود ہوکر رہ گیا تھا'اب جب انہیں سیاست میں آنے کو موقع ملا تو انہوں نے خلافت تحریک کی راہنمائی سنبھال لی۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک چلائی (۱۹۱۹-۲۰ء) تو خلافت اور یہ دونوں تحریکیں متحد ہوگئیں اور اس کے نتیجے میں وقتی طور پر ہندو مسلم اتحاد ابھرا' لیکن جب عدم تعاون کی تحریک کو اچانک ختم کیا گیا اور ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس نے ایک طرف تو ہندو مسلم اتحاد کو ختم کردیا اور دوسری طرف مسلمانوں میں سخت نا امیدی اور مایوسی کو پیدا کیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام ازم اور خلافت کی تحریک کی اس لئے حمایت کی تھی کہ برطانوی دور میں جو مسلمانوں میں متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا اسے اپنی شناخت کی ضرورت تھی' اس لئے انہوں نے جغرافیائی شناخت کو رد کرکے اپنا اسلامی دنیا سے ناطہ جوڑا تاکہ اپنی اقلیت کی کمزوری کو اسلامی طاقت میں ظاہر کریں' اور ایک قوت اور اعتماد کے ساتھ سیاسی مطالبات کے لئے جدو جہد کریں' لیکن خلافت کے خاتمے نے ایک طرف تو ان کے مسلم دنیا سے تعلقات کو کمزور کردیا اور دوسری طرف ان کی غیر جغرافیائی قوم پرستی کا خاتمہ ہوا۔

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے طبقہ اعلیٰ نے یہ محسوس کرلیا اگر انہیں اپنے مطالبات منوانے ہیں تو انہیں ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنی علیحدہ شناخت قائم کرکے اسے تسلیم کرانا

ہے۔ پر بھاؤکشت کے الفاظ ہیں " خلافت تحریک نے اس درمیانی مرحلے کا کام کیا کہ جس میں ایک اقلیت نے قوم کی شکل اختیار کی۔"

دو قومی نظریہ

جب مسلمانوں کی جانب سے ایک علیحدہ قوم کا نظریہ پیش کیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان کا تصادم ہندوؤں سے ہوا۔ اس سے پہلے وہ واقعات اور وجوہات جن کی بنیاد پر دو قومی نظریے کو ابھارا گیا ان میں مغربی تعلیم کو ہندوؤں میں مقبول ہونا جس کی وجہ سے وہ حکومت کی ملازمتوں میں بھی زیادہ آئے اور سیاسی طور پر بھی انہوں نے زیادہ مراعات حاصل کیں۔ اس وجہ سے ان میں اور مسلمانوں میں ذہنی فرق پیدا ہوگیا۔ ہندو اور اردو کے تنازعہ نے ان دونوں میں تلخی پیدا کی اور تقسیم بنگال نے مسلمانوں میں احساس کو پیدا کیا کہ ہندو ان کی ترقی کے حامی نہیں۔ مسلمانوں نے جب اپنے لئے علیحدہ انتخابات اور نشستوں کی بات کی تو اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا ہندوؤں پر اعتماد نہیں۔ اس طرح حکومت کی ملازمتوں میں انہیں ہندوؤں کے مقابلے میں حصہ نہیں دیا گیا۔ان وجوہات نے ان دونوں معاشروں میں کھچاؤ تو پیدا کر ہی رکھا تھا مگر جب خلافت تحریک کے بعد ۱۹۲۸ء میں ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلائیں تو مسلمانوں نے ان کے جواب میں تبلیغ اور تنظیم قائم کیں۔ تاکہ مسلمان کسانوں کو ہندو ہونے سے روکا جائے۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں مسلمان مبلغ دور دراز کے گاؤں میں گئے اور وہاں سادہ مسلمان کسانوں میں کہ جنہیں اسلام کے بارے میں بہت کم واقفیت تھی مذہبی بنیادوں پر مسلم شناخت کو بیدار کیا اور ان میں اکثر نے شاید پہلی مرتبہ اپنی مسلم شناخت کو دریافت کیا' جس کے نتیجے میں ان کے ہندو کسانوں سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔

اس مذہبی مسلم شناخت کو مسلمان سیاست دانوں نے اپنے مفادات کے لئے پورا پورا استعمال کیا' کیونکہ اس طرح انہوں نے اپنے مطالبات جن میں حکومت کی ملازمتیں اور سیاسی نمائندگی شامل تھی۔ مسلمانوں کی تعداد سے فائدہ اٹھایا۔ اس لئے دو قومی نظریہ سیاسی مفادات کی وجہ سے طاقت ور ہوا اور مسلمان سیاست دانوں نے پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اجاگر کیا۔ یہ اختلافات نہ صرف سیاسی تھے بلکہ سماجی' ثقافتی اور تاریخی معاملات میں بھی دونوں قوموں کو بالکل علیحدہ کردیا گیا اور یہ تاثر قائم کیا گیا کہ یہ دو قومیں اس قدر مختلف ہیں کہ یہ ایک ساتھ مل کر نہیں رہ سکتی ہیں۔

اس کے بعد مسلمان دانشوروں نے دو قومی نظریے کو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور سب سے پہلے دونوں کی تاریخ کو علیحدہ کیا گیا وہ مسلمان فاتحین کہ جنہیں کبھی کا فراموش کر دیا گیا تھا۔ انہیں دوبارہ تاریخ کے صفحات سے نکال کر زندہ کیا گیا اور انہیں بطور ہیرو پیش کیا گیا۔ ان کے کارناموں کے ذریعے مسلمان قوم میں فخرو اعتماد پیدا کیا گیا۔ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کہ جن کا تعلق سترھویں اور اٹھارویں صدی سے تھا اور جن کی شہرت خود اپنے زمانے میں بڑی محدود تھی۔ انہیں ہندوستان کے متوسط طبقے نے اپنی سیاسی ضروریات کے لئے استعمال کیا اور ان کی تحریروں کے ذریعے دو قومی نظریے کا جواز تلاش کیا گیا۔ احمد سرہندی کا تعلق ان علماء سے ہے کہ جنھوں نے شدت کے ساتھ علیحدگی پر زور دیا اور ہندوستان میں خاص طور سے گائے کی قربانی کو شریعت کا اہم فریضہ قرار دیا۔

ان بنیادوں پر بڑی تعداد میں لٹریچر کی تخلیق ہوئی کہ جو تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت جلد مقبول ہوگیا۔ عبدالحلیم شرر کے ناول' حالی اور اقبال کی شاعری' مولانا محمد علی کے مضامین۔ انہوں نے مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ اور جوش پیدا کردیا اور ان کی مسلم شناخت کو مضبوط کردیا' لیکن دیکھا جائے تو اس شناخت کی بنیادیں عقل سے زیادہ جذبات پر تھیں۔

علماء نے بھی اس شناخت کو مضبوط بنانے میں پورا پورا حصہ لیا اور عام لوگوں میں مذہبی جذبات کو ابھارا۔ اس مقصد کے لئے میلاد کی محفلیں منعقد ہوئیں اور یہ عہد کیا گیا کہ قرآن اور رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرکے دوبارہ اسلام کی شان و شوکت کو لایا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے سیاسی اور مذہبی معاملات میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کردیا۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں جو سیاسی واقعات ہوئے اس نے دو قومی نظریے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عمل کو اور تیز کردیا۔ مسلم لیگ کا پروپیگنڈا' ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی کامیابی اور اس سے مسلمانوں کی مایوسی' اور جناح کا مسلمانوں کے واحد راہنما کی حیثیت سے تسلیم کرانا' اس نے دونوں قوموں کو علیحدہ علیحدہ کردیا اور بالآخر ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔

اختتامیہ

مسلمانوں کی تاریخ کے ابتدائی دور میں جب کہ مسلمان حکمران اور امراء کی سیاسی طاقت مستحکم تھی۔ تو اس وقت مذہبی بنیادوں پر مسلم شناخت کو نہیں ابھارا گیا اور اسے خوابیدہ رہنے دیا گیا۔ لیکن اس وقت جب کہ ان کی سیاسی حیثیت خطرے کا شکار ہوئی تو وہ

مسلم شناخت کو مذہبی بنیادوں پر ابھارتے رہے جیسے کہ بابر نے کنواہہ کی جنگ میں کیا اور مسلمانوں کو جہاد کے لئے شہادت کے لئے تیار کیا کہ وہ جنگ ہندو راجپوتوں کے خلاف تھی' لیکن جیسے ہی ایسے بحران ختم ہوتے وہ اسلام اور مسلم اتحاد کو فراموش کردیتے تھے اور اس کی جگہ نسلی تفاخر اور حسب و نسب کی بات کرکے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی و سیاسی مراعات حاصل کرتے۔

دوسرے دور میں جب کہ مسلمان حکمران طبقوں کا سیاسی اقتدار مغلوں کے زوال کی وجہ سے کمزور ہوا تو اس وقت ماضی کی شان و شوکت کی بحالی کا کام علماء نے سرانجام دیا۔ سید احمد شہید اور شریعت اللہ کی تحریکیں اگرچہ مذہبی تھی مگر اس کے پیچھے سیاسی و معاشی مقاصد پنہاں تھے مگر ان کے راہنما خلوص کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ صرف خالص اسلام کے آنے کے بعد ہی دنیاوی اور مادی کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے ان تحریکوں کی نمایاں خصوصیات مذہبی پاکیزگی اور سیاسی مقاصد دونوں تھے۔

تیسرے دور میں مسلمانوں کے متوسط طبقے نے خود کو پان اسلام ازم کی تحریک سے اس لئے وابستہ کیا تاکہ مسلم دنیا کی حمایت سے خود میں قوت و طاقت پیدا کی جائے اور ہندو اور برطانوی چیلنجوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس دور میں علماء اور یورپی تعلیم یافتہ مسلمان دونوں متحد ہوگئے اور سامراج کے خلاف پالیسی نے ان کا اتحاد ہندوؤں کے ساتھ بھی کردیا' اور اس اتحاد کی خاطر انہوں نے گائے کی قربانی وغیرہ سے بھی مسلمانوں کو روکا۔ لیکن جیسے ہی پان اسلام ازم کی تحریک کا خاتمہ ہوا اس کے ساتھ ہی ہندو و مسلم اتحاد بھی ٹوٹ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی مسلم شناخت ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے قائم کی اور اس میں مذہب کا سیاسی طور پر پورا پورا استعمال ہوا۔

اس طرح آخری دور میں مسلم شناخت کو مذہبی مقاصد کے لئے نہیں بلکہ سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس وقت مسلمان راہنما نجی طور پر سیکولر تھے مگر عوام میں یہ مذہب کی باتیں کرتے تھے' اس نے اس منافقت کی بنیاد ڈالی کہ جو سیاست دانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی۔

ہندوستان کی تقسیم نے مسلم شناخت کو علیحدہ تسلیم کرلیا لیکن آگے کے حالات نے ثابت کیا کہ اس علیحدہ شناخت نے پاکستان' ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے لئے بہت سے مسائل کو پیدا کیا۔

OO

بنیاد پرستی

چونکہ اس وقت مغربی تہذیب نے ایک عالمی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس لئے یہ مغربی اسکالرز کے مفاد میں ہے کہ دنیا میں اٹھنے والی ہر نئی تحریک اور نئے نظریات کا بغور مطالعہ کریں۔ اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا تجزیہ کریں' ان کی اس تحقیق کے نتیجے میں نئی علمی اصطلاحات اور الفاظ پیدا ہوتے ہیں اور پھر کثرت سے علمی دنیا میں استعمال ہوتے ہوئے مقبول عام ہوجاتے ہیں۔ اکثر یہ اصطلاحات مغربی معاشرے کے تاریخی پس منظر اور ان کے تجربات کو ظاہر کرتی ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ ایشیاء و افریقہ کے دانشوروں کے پاس اپنا علمی سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے وہ اس پر مجبور ہیں کہ ان اصطلاحات کو جنہیں مغربی دانشوروں نے وضع کیا ہے' استعمال کیا جائے' بعض اوقات یہ اصطلاحات ہمارے لئے بڑی مفید بھی ہوجاتی ہیں اور ان کا استعمال فوری طور پر مخصوص مفادات کے تحت مقبول بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے ساؤتھ ایشیاء یا جنوب ایشیاء کی اصطلاح' اس کا استعمال ہمارے نصاب اور ذرائع ابلاغ میں فوراً" ہونے لگا۔ کیونکہ اس طرح سے ہمیں انڈیا' یا ہندوستان کا نام نہیں لینا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں فنڈا مینٹل ازم یا بنیاد پرستی کی اصطلاح ہے۔ مغرب میں یہ اصطلاح انیسویں صدی کے آخر میں چند عیسائی فرقوں کے لئے استعمال ہونے لگی تھی مگر عالمی طور پر اس کا مقبول عام استعمال تب ہوا جب ایران میں شاہ کی حکومت کا تختہ الٹا گیا اور جو مذہبی گروہ برسر اقتدار آئے انہوں نے مغرب کی مخالفانہ پالیسی کو اختیار کیا' اور ساتھ ہی اندرونی طور پر مذہب کے نام پر جابرانہ اقدامات کے ذریعے نہ صرف تمام مخالفوں کو ختم کیا بلکہ جدیدیت کے تمام آثار و علامات کو مٹا کر رکھ دیا۔

اس اصطلاح پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا اطلاق مسلمانوں پر اس لئے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان اسلام کے بنیادی عقائد پر ایمان رکھتا ہے اور ایک بنیاد پرست مسلمان ہوتا ہے۔ اس اعتراض کے باوجود میرا خیال ہے کہ مغرب میں بنیاد پرستی کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اس میں اور اسلام کی بنیاد پرستی و احیاء کی تحریکوں میں بہت مماثلت

ہے اس لئے ہم اس اصطلاح کے ذریعے مسلمان معاشروں میں اٹھنے والی مذہبی تحریکوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

بنیاد پرستی کی اصطلاح سب سے پہلے شمالی امریکہ میں بپٹسٹ (Baptists) پریس بائی ٹیرین (Presbytenian) اور ایسے عیسائی فرقوں کے لئے استعمال ہونا شروع ہوئی جو ان پانچ بنیادی عقائد پر ایمان رکھتے ہیں۔

۱۔ بائبل تمام غلطیوں سے پاک ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

۳۔ انہوں نے سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

۴۔ وہ مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ پیدا ہوئے۔

۵۔ بائبل کے تمام معجزے سچے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ نظریہ ارتقاء کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے' اور اس کی بجائے مذہبی نظریہ تخلیق کو مانتے تھے۔ ان فرقوں کی اہم خصوصیات یہ تھیں کہ یہ اپنے عقائد میں انتہائی پرتشدد اور سخت تھے' اور اس لئے ان عقائد کے خلاف کسی قسم کی تنقید سننا یا ان میں کسی ترمیم کی بات کرنا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ عقائد پر سختی کے ساتھ ایمان ہونے کی وجہ سے ان کے رویہ اور عمل میں جارحانہ خصوصیات تھیں' اور یہ کسی بھی تبدیلی کے سخت خلاف تھے' اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ذہنی طور پر رجعت پرست تھے' اور ہر نئی چیز کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تھے چونکہ یہ اپنے عقائد کو سچا اور آفاقی سمجھتے تھے اس لئے یہ ان کا فرض تھا کہ دنیا سے ان کی حقانیت کو تسلیم کرائیں۔ اپنے عقائد کی تبلیغ اور پرچار کے لئے یہ طاقت و قوت کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے۔ اور یہ ان کا ایمان تھا کہ ان کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں آئیں' انہیں نہ صرف دور کریں بلکہ ضرورت پڑے تو ان کے خلاف جنگ بھی کریں اور ہر صورت میں اپنے عقائد کو پھیلائیں اور ان کا نفاذ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عمل میں ان کا تصادم ان نظریات و خیالات سے ہوا جو کہ ان کے عقائد کے بالکل خلاف تھے۔ اور جن کی موجودگی مقبولیت اور اثرات ان کے لئے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے' اس لئے انہوں نے خصوصیت سے لبرل ازل' سیکولر ازم اور جمہوریت کی مخالفت کی اور ان کے خلاف محاذ آرائی کی پالیسی کو اختیار کیا۔

اپنے نظریات کے نفاذ کے لئے انہوں نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ یہ تھا کہ سب سے پہلے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ چرچ کے تعلیمی اداروں سے اپنے عقائد کے

مخالفوں کو نکال دیا جائے اور صرف ان اساتذہ کو باقی رکھا جائے کہ جو ان کے عقائد پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے امریکہ کی مختلف ریاستوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ تعلیمی نصاب سے نظریہ ارتقاء کو خارج کردیں اور اس کی بجائے مذہبی عقیدے کے مطابق "تخلیق کائنات" کو نصاب میں شامل کریں۔ ان کے اس دباؤ کے تحت ۱۹۲۵ء میں ٹے نے سی کی قانون ساز اسمبلی نے یہ قانون پاس کردیا کہ تعلیمی اداروں میں نظریہ ارتقاء نہ پڑھایا جائے۔ ۱۹۳۱ء میں اس نے اس قانون کی توثیق کردی۔ اس قسم کے قانون کو پاس کرانے کی کوشش امریکہ کی دوسری ریاستوں میں بھی ہوئی۔ مگر اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

امریکہ میں بنیاد پرستی کی اس تحریک سے جو نتائج سامنے آئے وہ یہ تھے:-

۱ - اس تحریک کی بنیادی خصوصیت میں سب سے اہم عقل اور دلیل سے انکار تھا۔ اس کے پیروکار اپنے عقائد کو محض جذبات کے سہارے پھیلانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ان ذرائع کو اختیار کیا کہ جن کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا جائے اور پھر اس طرح سے اپنے عقائد کو مقبول بنایا جائے۔

چونکہ اس تحریک کو ماننے والے انسانی عقل پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اور اسے ناپائدار و متزلزل سمجھتے تھے اس لئے ان کا بھروسہ اور انحصار الٰہی قوت و طاقت پر تھا کہ جس کے ذریعے انسان راہ راست پر آسکتا ہے اور اس کی نجات ہوسکتی ہے۔

۳ - اپنے نظریات میں ان کی پختگی اس حد تک تھی کہ یہ ان پر کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے۔

۴ - یہ خود کو حق پر سمجھتے تھے اور جو بھی ان کی مخالفت کرتا تھا' اسے اپنا دشمن گردانتے تھے۔

۵ - اپنے عقائد پر ایمان اور حقانیت کی وجہ سے یہ اپنے نظریات کی خاطر جان دینا اور مخالفوں کی جان لینا ثواب سمجھتے تھے۔ حق پر اجارہ داری کے اس نظریئے کی بناء پر یہ دوسرے تمام لوگوں کو گناہ گار' بھٹکے ہوئے اور معتوب ٹھہراتے تھے۔

۶ - جب انہوں نے صرف اپنے فرقے کو حق پرست قرار دے دیا تو ان کے علاوہ دوسرے گمراہ ہوئے۔ اس وجہ سے ان میں جمہوری روایات اور اس کے اداروں کی کوئی عزت نہیں رہی اور نہ ان کے لئے انسانی حقوق اہم رہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی مساوات کے تمام جذبات ان میں سے بالکل ختم ہوگئے اور انہوں نے انسانوں کو اعلیٰ و برتر پاکیزہ گناہ گار درجوں میں تقسیم کردیا۔

امریکہ میں بنیاد پرستی کی یہ تحریکیں چند ریاستوں میں محدود رہی اور اسے اپنی تنگ نظری اور انتہاء پسندی کی وجہ سے مقبولیت نہیں ہو سکی۔ مگر ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ امریکی طرز حیات اور ان کا نظام سیاست و معیشت تھا۔ امریکہ کی بڑھتی و پھیلتی صنعتی ترقی، سائنسی و فنی ایجادات، اور دنیا پر سیاسی تسلط کی راہ میں بنیاد پرستی کے نظریات و عقائد رکاوٹ بنتے اور اس سے ان کے جمہوری اداروں، روایات اور انسانی حقوق کمزور ہوتے۔ اس لئے یہ بنیاد پرست تحریکیں امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں جو زراعتی اور پس ماندہ تھیں۔ وہاں تک محدود رہیں اور بحیثیت مجموعی امریکی معاشرے پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔

بنیاد پرستی اور احیاء

بنیاد پرستی کی تحریکوں کو مزید تقویت احیاء کی تحریکوں سے ملتی ہے۔ احیاء کی تحریکوں کی بنیاد سنہرے ماضی کے تصور پر ہوتی ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق مذہب کے ابتدائی دور میں جب کہ وہ اصلی اور حقیقی شکل میں تھا، اس وقت معاشرے میں امن و امان، خوش حالی اور مسرت تھی، مگر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، مثالی معاشرہ تبدیلیوں کے نتیجے میں بدعنوانیوں سے آلودہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی اصلی شکل مسخ ہو گئی۔ اور اس کی پاکیزگی گناہوں، اور نئی تبدیلیوں کی گندگی میں دب کر گم ہو گئی۔ اس لئے ان کے نزدیک معاشرے کی تمام برائیوں کا حل یہ ہے کہ دوبارہ سے واپسی کا سفر کیا جائے یہاں تک کہ ماضی کا کھویا ہوا سنہری دور پھر سے ڈھونڈ لیا جائے۔ اس لئے احیاء کی تحریکوں میں ماضی کی شان و شوکت اور مثالی معاشرے کی خوبیوں کو بیان کرکے لوگوں کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا اصلی مقصد بھی ماضی کی تلاش اور اصلی جڑوں کی طرف جانا ہوتا ہے، اس لئے یہ بنیاد پرستی سے جاکر مل جاتی ہیں۔ اس طرح سے دونوں تحریکوں کے عقائد اور نظریات ایک ہوجاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ مذہبی کتابوں کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھنا
۲۔ جو ان عقائد سے منکر ہوں ان کا شمار مشرکوں اور کافروں میں کرنا اور ان کے خلاف تشدد کا رویہ اختیار کرنا۔
۳۔ اپنے طریقہ زندگی پر سچائی کے ساتھ مکمل ایمان۔
۴۔ سیاست کے نقطہ نظر کو اپنانا

یہ یقین کہ یہ دنیا برائیوں کی جگہ ہے، اور اسے ایک دن ختم ہوجانا ہے، جو لوگ کہ

خدا کے احکامات سے انکار کرتے ہیں ان پر عذاب الٰہی ضرور نازل ہوتا ہے اس لئے خدا کے قہر سے ڈرتے رہنا چاہئے' اس لئے دنیا کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ ان تمام تہواروں' تقریبات اور خوشی و مسرت کے جذبات سے دور رہا جائے۔ یہ موسیقی ' آرٹ' ادب اور ہر اس چیز کی مخالفت کرتے ہیں کہ جس سے دنیا اور فطرت کی خوبصورتی ' دلکشی اور جاذبیت اجاگر ہوتی ہے اس کی بجائے ان کی تمام تر توانائیاں مذہبی تبلیغ اور پرچار پر صرف ہوتی ہیں' اس میں یہ اس قدر الجھاتے ہیں کہ ان کے سماجی تعلقات' اور خاندانی رشتے تک کی حیثیت ثانوی ہوجاتی ہے۔

ان رویوں کی وجہ سے یہ معاشرے کے دوسرے لوگوں سے کٹ جاتے ہیں' اور اپنے عقائد کے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنا ایک علیحدہ فرقہ بنالیتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ یہ معاشرے کے بہاؤ میں شامل نہیں رہتے' اور اس وجہ سے یہ ملک اور معاشرے کے لئے کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتے ' بلکہ ان کی تمام توانائیاں صرف اپنے فرقے اور ہم عقائد لوگوں کی بہبود کے لئے وقف ہوجاتی ہیں۔ اور یہ وجہ ہوتی ہے کہ اکثریت کا رویہ ان کی جانب سے شک و شبہ کا ہوجاتا ہے اور وہ ان کی سرگرمیوں کو اپنے لئے نقصان کا باعث سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اکثر انہیں معاشرے کے بحرانوں کا ذمہ دار گرداننے لگتے ہیں۔

جہاں تک بنیاد پرستی اور احیاء کی تحریکوں کا تعلق ہے یہ پس ماندہ اور غریب ملکوں اور علاقوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ یا ایسے معاشرے میں کہ جہاں حکومتوں نے عوام کو دبا کر اور کچل کر رکھا ہوتا ہے ان حالات میں جب یہ تحریکیں دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ انہیں تمام پریشانیوں سے نجات دلائیں گی اور ان کے مسائل کو حل کریں گی تو فطری طور پر یہ فوری طور پر مظلوم ' کچلے ہوئے اور ان پڑھ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرلیتی ہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ معاشرے کے جو سماجی و معاشی اور سیاسی مسائل ہوتے ہیں وہ ان کی عقل اور سمجھ اور طاقت سے دور ہوتے ہیں اس لئے جلد ہی ان کی ناکامیاں سامنے آجاتی ہیں اور جب لوگوں کی یہ آخری امید اور آخری سہارا بھی چھن جاتا ہے تو وہ خود کو پہلے سے زیادہ بے کس اور مجبور پاتے ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا جذبہ بالکل ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔

مغرب کی مخالفت

مسلمان ملکوں میں جن عوامل کی وجہ سے بنیاد پرستی پھیل رہی ہے۔ ان میں سب سے بڑا عنصر تہذیب کی مخالفت ہے۔ اکثر مسلمان ممالک ایک طویل عرصے تک مغرب کی نوآبادی

رہے' اور انہوں نے اپنی آزادی کے لئے مغربی ملکوں سے مزاحمتیں کیں' اس لئے ان میں مغربی استعمار اور مغربی طاقتوں کے خلاف زبردست رد عمل پایا جاتا ہے۔ اس رد عمل کو پیدا کرانے میں ان ملکوں کی سیاسی لیڈر شپ کا بھی بڑا دخل ہے کہ وہ مغرب کی مخالفت کی بنیاد پر اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں یہ عوامی سطح پر مغرب کی مخالفت کرتے تھے وہاں دوسری جانب انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے آزادی کے بعد مغربی اداروں اور روایات کو باقی رکھا۔ کچھ نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے ملکوں میں جمہوریت' سیکولر ازم' لبرل ازم' اور قوم پرستی کی روایات کو گہرا کیا جائے اور ان کی مدد سے نہ صرف یہ کہ قوم کو متحد کیا جائے۔ بلکہ ملک کو جدید بنانے کے عمل کو تیز کیا جائے۔

کچھ لیڈروں نے یہ تجربہ کیا کہ سوشل ازم کے نظریات کے ذریعے سے اپنے ملکوں کی پس ماندگی کو دور کیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ سیاسی راہنماؤں کی نا اہلی' بدعنوانی اور جذبے کی کمی کی وجہ سے یہ تمام تجربات ناکام رہے۔ اور لوگوں کے بنیادی مسائل حل کرنے کی بجائے انہوں نے اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کرنے پر توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے بنیادی مسائل جوں کے توں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان ملکوں میں جہالت' غربت' بے روزگاری' مہنگائی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔

جب سیاسی راہنما' مغربی سیاسی نظاموں کے ذریعے معاشرے کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہوگئے۔ اور ان کا سیاسی اقتدار خطرے میں پڑ گیا تو انہوں نے پھر دوسرا راستہ اختیار کیا' وہ راستہ یہ تھا کہ اسلام کو بطور سیاسی ہتھیار کے استعمال کر کے اپنے اقتدار کو بچایا جائے۔ چنانچہ مغرب کی مخالفت میں اسلامی جمہوریت اسلامی معیشت' اسلامی نیشنل ازم اور اسلامی سوشل ازم کے ذریعے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

اسلام کو مزید سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہوئے اکثر ملکوں میں حکومتوں نے ریڈیو اور ٹی وی پر اذانوں اور نمازوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ مذہبی تہواروں پر چھٹیاں دی جانے لگیں۔ مزاروں پر چادریں چڑھانے اور دعائیں مانگنے کی روایات مقبول ہوگئیں۔ مسجدوں اور مزاروں کی تعمیر کے لئے حکومت کی جانب سے عطیات دیئے جانے لگے۔ اس طرح سے مذہب کو سیاست میں لانے کا کام سب سے پہلے سیکولر ازم راہنماؤں نے کیا۔ ایک مرتبہ جب مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جائے لگا تو آگے چل کر سیاسی جماعتوں نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس کا پروپیگنڈہ کیا کہ مغربی نظریات و افکار اسلام کے دشمن ہیں۔ اس لئے ہماری نجات اس میں ہے کہ ہم مغربی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ ہمارے

اکثر مفکرین جن میں اقبال بھی شامل ہیں یہ پیغام دیتے رہے کہ مغربی تہذیب اور اس کے نظریات اپنی توانائیاں کھو چکے ہیں اس لئے وہ اس قابل نہیں رہے کہ ہماری راہنمائی کر سکیں۔ اس لئے بنیاد پرست تحریکوں نے جمہوریت، سیکولر ازم، سوشل ازم اور قوم پرستی کی نفی کرنے اور انہیں رد کرنے کے بعد مذہب کے نفاذ، اور ماضی کی جانب واپسی کو معاشرے کی برائیوں و خرابیوں کا آخری علاج قرار دیا۔

اس لئے بنیاد پرست تحریکوں میں سب سے زیادہ تنقید سیکولر لیڈروں پر کی جاتی ہے اور انہیں موقع پرست، بد دیانت اور بدعنوان کہا جاتا ہے حکومت کے اعلیٰ عہدے دار، غدار، شرابی اور زانی کہے جاتے ہیں، تاکہ ایک مرتبہ جب عوام میں ان کا کردار داغدار ہو جائے تو ان کی جگہ لینے کے لئے بنیاد پرست آسکیں۔

ایک عام آدمی کو مغرب اور مغربی تہذیب سے اس لئے بھی نفرت ہوجاتی ہے کہ نو آبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب طبقہ اعلیٰ میں محدود ہوکر رہ گئی۔ اس وقت مغربی تہذیب اور اس کی مراعات سے وہ طبقہ آرام اور آسائش حاصل کر رہا ہے۔ جو سیاسی اور معاشی طور پر طاقت ور ہے۔ مثلاً" مغربی تعلیم، مغربی فیشن، مغربی طرز رہائش اور مغربی عادات و اطوار ایک عام آدمی کی پہنچ سے دور ہیں۔ اس لئے ملک کی اکثریت جو نہ صرف غریب اور مفلس ہیں بلکہ جاہل اور محرومیت کا شکار ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ ایک طرف اقلیت مغربی تہذیب کی آسائشوں سے لطف اندوز ہورہی ہے اور ان پر حکومت کر رہی ہے تو ان میں مغربی تہذیب کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ عورتوں کی آزادی، مغربی تعلیم، رقص و موسیقی اور فنون لطیفہ کے مخالف ہوجاتے ہیں وہ جن چیزوں سے محروم ہیں اور جو ان کی دسترس میں نہیں ہیں انہیں تہس نہس کرکے اپنے جذبات سرد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ان جذبات کی نمائندگی بنیاد پرست جماعتیں کرتی ہیں۔ اس لئے ان جماعتوں میں انہیں اپنے مقاصد کا حصول نظر آتا ہے۔

بنیاد پرست جماعتوں کا طبقاتی ڈھانچہ

ایک اور اہم عنصر جو بنیاد پرست جماعتوں کو مضبوط کر رہا ہے وہ مسلمان ملکوں میں شہری آبادی کا بڑھنا ہے۔ دیہاتوں میں بے روزگاری اور معاشی محرومیوں کی وجہ سے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ملازمت اور اچھے و سنہرے مستقبل کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتی ہے۔ شہروں میں آنے کے بعد دیہات کی زندگی کا تضاد اچانک انہیں ششدر کرکے رکھ دیتا ہے

اور لوگوں کے ہجوم و جم غفیر میں وہ خود کو تنہا اور کھویا ہوا پانے لگتے ہیں۔ بے روز گاری بھوک' بیماری اور غربت انہیں مسلسل خوف و ہراس کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ اور ان کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے ایک ڈوبتا ہوا شخص سہارے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ ایسے وقت میں بنیاد پرست جماعتیں اور ان کے عقائد انہیں سہارا دیتے ہیں اور جدیدیت و مغربیت سے نفرت انہیں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ایک ایسے معاشرے کا تصور کہ جس میں مساوات ہوگی اور جہاں ہر شخص کے ساتھ انصاف ہوگا یا انہیں بنیاد پرستی کی جانب لے جاتی ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو بنیاد پرستی کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

بنیاد پرست جماعتوں کے اراکین اور ان کے ہمدردوں کے طبقاتی عنصر کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تقریباً" یہ تمام جماعتیں متوسط یا نچلے طبقوں کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں جہاں تک امراء اور طبقہ اعلیٰ کا تعلق ہے تو وہ ان جماعتوں سے دور رہتے ہیں ان میں سے چند لوگ ان جماعتوں کی مالی امداد کرتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی بنیاد پرست جماعت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے اثر سے آزاد نہیں ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ جماعتیں تو وہ ہوتی ہیں کہ جو متوسط طبقے میں راہنمائی کا کام کرتی ہیں۔ اور کچھ جماعتوں میں نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں اس طبقاتی فرق کی وجہ سے ان بنیاد پرست جماعتوں کا مذہبی نقطہ نظر اور لائحہ عمل بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ وہ منشور اختیار کرتے ہیں کہ جو ان کی طبقاتی تضادات کو پورا کرسکے۔

مثلاً" پاکستان' مصر اور عراق و شام میں جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون متوسط طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ مغربی تہذیب اور مغربی افکار کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو ایک متبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے سکالرز اور علماء اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کو ایک جدید اور متحرک مذہب کے طور پر پیش کریں کہ جس میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ مغرب کے چیلنجوں کا جواب دے سکتا ہے یہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں ایک ایسا سیاسی نظام ہے کہ جو جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس لئے یہ سیاسی اقتدار کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں اور غیر اسلامی حکمراں طبقوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ ان کے منشور کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے کیونکہ صرف اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ اپنے منصوبوں کو پورا کرسکیں گے اور معاشرے کو اسلامی بنا سکیں گے۔

چونکہ ان جماعتوں کے اراکین اور ہمدرد تعلیم یافتہ متوسط طبقہ سے ہوتے ہیں اس لئے یہ عقائد کو جدید سائنسی و عقلی بنیادوں پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب انہیں اپنے عقائد کی سائنسی بنیادیں مل جاتی ہیں تو اس سے ان کا اعتقاد اور مضبوط ہوجاتا ہے اور ان کے ذہن مزید بند ہوجاتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ذہنوں کو کھول کر تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو سمجھ سکیں۔

متوسط طبقے میں مختلف گروہوں کے مختلف مفادات ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر، انجنیئر وکیل اور استاد مذہب کی ترقی پسند نظریہ کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن چھوٹے تاجر دست کار اور صنعت کار جن کے پاس نہ تو اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ پڑھیں اور نہ ان میں اتنا شعور ہوتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کو سمجھ سکیں اس لئے یہ ایسی جماعتوں کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ جن کے راہنما پڑھنے اور سمجھنے کا کام کریں اور ان کی راہنمائی کرسکیں۔ پاکستان میں اس وقت یہ کام ڈاکٹر اسرار احمد اور طاہر القادری کی جماعتیں کر رہی ہیں۔

اس کے بعد نچلے طبقوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ کہ جن میں یا تو معمولی تعلیم ہوتی ہے یا بالکل تعلیم سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دلیل سے عقل سے دور ہوتے ہیں اور صرف جذبات کی بنیاد پر انہیں ابھارا اور مشتعل کیا جاسکتا ہے۔ خصوصیت سے مذہبی جذبات ان لوگوں کی راہنمائی پاکستان میں اس وقت سپاہ صحابہ اور ختم نبوت جیسی جماعتیں کر رہی ہیں جو وقتاً فوقتاً ایسے مذہبی مسائل کو کھڑا کرتی ہیں کہ جن سے لوگوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات یا مذہبی جھگڑے ہوتے ہیں اور ان کے نتیجے میں ان جماعتوں کی حیثیت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

ان دو مختلف قسم کی جماعتوں کے اثرات بھی مختلف ہو رہے ہیں۔ مثلاً متوسط طبقوں کی نمائندگی کرنے والی جماعتیں ریاست اور اس کے اداروں کو اپنے خیالات کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جب کہ نچلے طبقوں کی جماعتیں جھگڑوں اور فسادات کے ذریعے انتشار اور بے چینی کو پیدا کر رہی ہیں۔

بنیاد پرستی و بیرونی عناصر

بنیاد پرستی کو اندرونی عناصر کے ساتھ ساتھ کچھ بیرونی عناصر نے بھی پھلنے پھولنے کا موقع دیا امریکہ اور مغربی ممالک کی یہ پالیسی تھی کہ سوشل ازم کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہبی جماعتوں کی سرپرستی کی جائے اور اس سرپرستی کو اس وقت فروغ ملا جب سعودی عرب اور

خلیج کی ریاستیں تیل کی دولت سے مالا مال ہوگئیں چونکہ یہ ریاستیں بمقابلہ دوسرے عربیہ ملکوں کے پس ماندہ اور پیچھے تھیں اس لئے ان کے ہاں مذہبی عقائد کی جڑیں گہری تھیں۔ تیل کی دولت کے بعد سے ان ملکوں کے حکمران طبقوں نے اس بات کی کوشش کی کہ نہ صرف ان کے ملکوں میں بلکہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی بنیاد پرست جماعتوں کی مدد کی جائے۔

ان ملکوں کی جانب سے مالی امداد اور فراخدلانہ چندوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مسلمان ملکوں میں مذہبی جماعتوں کا ایک ریلہ آگیا اور چونکہ ہر جماعت کو کچھ نہ کچھ کرنا تھا اس لئے نئے نئے مدرسے کھلنا شروع ہوگئے جگہ جگہ مسجدیں بننے لگیں یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں میں سعودی عربیہ اور خلیج کی ریاستوں کے چندوں سے مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ (مصنف نے سندھ کے شہر بدین میں ایسی ہی دو خوبصورت مسجدیں دیکھیں ہیں) اس کے علاوہ ان جماعتوں کی مذہبی سرگرمیاں بڑھ گئیں مذہبی اجتماعات' جلسے اور مذہبی تہواروں اور خاص خاص دنوں پر جلوس نکالنے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی ہونے لگا کہ خاص دنوں میں چھٹیاں ہوں پھر اپنے عقائد کی تبلیغ اور پھیلاؤ کے لئے نئے نئے مذہبی رسالے ' اخبارات ' پمفلٹ اور کتابیں چھپنا شروع ہوگئیں اور اب تک عام لوگوں میں جو مذہبی جذبات چھپے ہوئے اور سوئے ہوئے تھے' ان سرگرمیوں نے ان جذبات کو دوبارہ سے زندہ کردیا اور بہت سے وہ مذہبی مسئلے مسائل جو ختم ہوچکے ہیں اس ماحول میں ان کو نئی زندگی مل گئی۔

ان جماعتوں کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کی آمدنی ان سے منسلک ہوگئی۔ خصوصیت سے عہدے داروں کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ یہ جماعتیں بن گئیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کی مالی حالت بہتر ہوئی بلکہ انہیں معاشرے میں ایک باعزت مقام بھی مل گیا' ان مفادات کے تحفظ کی خاطر یہ لوگ نہ صرف جماعت کے انتہا پسند پیرو کار ہوگئے' بلکہ عوام میں اپنے اثر و رسوخ کی خاطر بھی انہوں نے ہر طریقے کو اختیار کیا جن میں مذہبی اجتماعات سے لے کر پریس کانفرنسیں وغیرہ سب شامل ہیں۔

اگرچہ اب عالمی طور پر صورت حال بدل گئی ہے روس اور مشرقی یورپ میں حالیہ تبدیلیوں کے بعد امریکہ اور مغربی طاقتوں کا اب یہ مفاد نہیں رہا کہ وہ ان مذہبی جماعتوں کی مزید سرپرستی کریں اور خلیج کی جنگ کے بعد سعودی عربیہ اور دوسری ریاستیں بھی مالی بحران میں مبتلا ہوگئی ہیں۔ مگر اس عرصے میں یہ جماعتیں اس قابل ہوگئیں ہیں کہ وہ ملک کے

اندرونی ذرائع سے مالی امداد حاصل کرتی رہیں۔ اس لئے اگرچہ ان کی حالت تھوڑی بہت کمزور ہوگئی ہے مگر یہ ختم نہیں ہوگی۔

اس کے برعکس روس اور مشرقی یورپ کی تبدیلیوں نے انہیں مزید دلیل دی ہے کہ سوشل ازم کی ناکامی کے بعد اور مغرب کی مادیت کی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے اسلام ہی صرف ایک راستہ بچا ہے کہ جس میں مسلمانوں کے لئے نجات ہے۔

ایک اور اہم عنصر جس کی وجہ سے بنیاد پرستی کے جذبات کو تقویت ملی' وہ مسلمان ملکوں کو فوری شکستیں ہیں جو کہ انہیں اپنے ہمسایوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں' مثلاً' مشرقی وسطی میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر' اردن' شام اور لبنان کی شکست۔ ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کی شکست۔ اور حالیہ خلیج کی جنگ میں عراق کی شکست۔ ان شکستوں نے مسلمان عوام میں ایک زبردست مایوسی' دل شکستگی اور بے چارگی کے احساسات کو پیدا کردیا ہے اس طرح رد عمل کے طور پر ان میں مغرب کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ اس صورت حال میں یہ جذبات تقویت پارہے ہیں کہ صرف اسلامی تشخص کے ذریعے دنیا میں باعزت مقام مل سکتا ہے اور وہ اپنی ذلت و شکست کا بدلہ لے سکتے ہیں۔

بنیاد پرستی اور جمہوریت

بنیاد پرست جماعتیں اپنے انتہا پسند نظریات کی بنا پر عوام میں مقبول نہیں ہوتی ہیں۔ یہ جماعتیں اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ تبدیلی اوپر سے لائی جائے' نیچے سے نہیں۔ اس لئے یہ عوام کو بنا بنایا' منصوبہ دینا چاہتے ہیں کہ جس میں ان کی مرضی و خواہشات کو کوئی دخل نہیں ہوتا' اور یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان کا بنا ہوا منشور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ہے۔ عوام کی اس لاتعلقی اور دوری کی وجہ سے یہ انتخابات اور عوامی رائے کے ذریعے طاقت و اقتدار میں آنے پر یقین نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح ریاست کے اداروں پر قبضہ کرکے پھر ریاستی قانون اور جبر کے ذریعے عوام پر اپنے خیالات و نظریات کو مسلط کیا جائے۔

بنیاد پرست جماعتوں کا یہ لائحہ عمل نیا نہیں ہے۔ اس سے پہلے ماضی میں بھی یہ اس پر ہی عمل کرتے تھے' اور بادشاہت کے زمانے میں ان کی کوشش ہوتی تھی کہ طاقتور اور بااثر امراء کی حمایت حاصل کرکے دربار میں اپنے اثر رسوخ کو بڑھائیں۔ اور پھر اس ذریعے سے شریعت کو نافذ کریں۔ مثلاً' اکبر و جہاں گیر کے زمانے میں یہ کوشش احمد سرہندی نے کی'

اور بعد میں شاہ ولی اللہ نے اپنے وقت کے طاقتور امراء سے رابطہ کرکے اپنے خیالات کے نفاذ کی جدو جہد کی۔

آج کے زمانے میں بنیاد پرست جماعتیں کوشش کرتی ہیں کہ اگر انہیں کسی آمر کی حمایت حاصل ہوجائے تو وہ اس کی مدد سے ریاست کے اداروں کو اپنے خیالات کے نفاذ کے لئے استعمال کرسکیں گے۔ اس لئے اکثر ملکوں میں جن میں پاکستان کی مثال ہے ضیاء الحق کے زمانے میں بنیاد پرست جماعتوں نے اس کی حمایت کی اور اس کے ذریعے کوشش کی کہ ریاستی اداروں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھائیں' خصوصیت کے ساتھ تعلیم اور ذرائع ابلاغ میں۔ ضیاء الحق نے ان بنیاد پرست جماعتوں کا اس لئے ساتھ دیا کہ اسے اپنی حکومت کے لئے کوئی اخلاقی جواز چاہئے تھا اور یہ جواز اس نے اسلامی مشن میں تلاش کیا کہ جسے پورا کرنا اس کی حکومت کا فرض تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں اب تک جو تھوڑی بہت کوششیں اسے جدید اور لبرل بنانے کی ہورہی تھیں' وہ دم توڑ گئیں' اور معاشرے پر بنیاد پرستی کے نظریات کو مسلط کردیا گیا۔

ان بنیاد پرست جماعتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکثر صرف مذہبی اور سیاسی مسائل کو اٹھاتے ہیں۔ اور معاشرے کے سماجی مسائل پر نہیں بولتے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ جب یہ اقتدار میں آجائیں گے تو اس وقت غربت' بیماری' اور پس ماندگی سب کو دور کردیں گے۔

ان بنیاد پرست جماعتوں کا اپنا تنظیمی ڈھانچہ جمہوری نہیں ہوتا بلکہ یہ اعلیٰ و ادنیٰ یا عوام و خواص پر مبنی ہوتا ہے۔ جماعت کے تمام اراکین کو فیصلہ کرنے میں شمولیت نہیں کرنی ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ جماعت کا اعلیٰ ادارہ جیسے مجلس شوریٰ کرتی ہے۔ ایک عام رکن کے لئے ان فیصلوں کی پابندی بغیر کسی تنقید کے لازمی ہوتی ہے۔ امیر یا جماعت کے سربراہ کو وسیع اختیارات ہوتے ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل سب کے لئے لازمی ہوتی ہے۔

اس لئے جن جماعتوں کا اپنا ڈھانچہ نہ ہو' ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ جمہوری روایات کو فروغ دیں گی۔ اس کے برعکس یہ سب سے پہلے ان روایات کو ختم کرکے ملک میں آمرانہ نظام کو قائم کرتی ہیں کیونکہ صرف اسی نظام میں یہ اپنے نظریات کو نافذ کرسکتی ہیں۔

بنیاد پرستی: تبلیغ اور تشدد

مسلمان ملکوں میں جہاں جہاں بنیاد پرستی کی تحریکیں اٹھیں' ان کے پس منظر میں ان ملوں کے اپنے سیاسی' معاشی اور سماجی حالات تھے۔ اس لئے بنیاد پرستی کی شکلیں بھی ہر ملک میں مختلف رہیں۔ لیکن ان خیالات کے باوجود ان تحریکوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً" اس بات پر یہ سب متفق ہیں کہ اس وقت کسی بھی مسلمان ملک میں شریعت کا عمل نہیں اور اس لئے کوئی بھی حکومت اسلامی نہیں ہے اور ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی کہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی تھی۔ یہ مسلمان حکمران اگرچہ مسلمان ہیں مگر کردار کے اعتبار سے یہ منافق اور ناقابل اعتبار ہیں اور اس لئے ضروری ہے کہ ان کا خاتمہ کیا جائے۔ اور معاشرے میں ایسے قوانین کو نافذ کیا جائے کہ جس کے بعد صاحب ایمان لوگ حکمرانی کے فرائض سرانجام دیں تاکہ معاشرہ برائیوں سے پاک ہوسکے۔ اسی ذہنیت کے تحت پاکستان بننے کے فوراً" بعد جماعت اسلامی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک حکومت اسلامی نہ ہو اس وقت تک سرکاری ملازمین حلف وفاداری نہ اٹھائیں اور نہ لوگ فوج میں بھرتی ہوں۔

معاشرہ کو برائیوں سے کیسے پاک کیا جائے؟ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بنیاد پرست جماعتیں دو راستے اختیار کرتی ہیں۔ تبلیغ کا اور اگر اس کے ذریعے لوگ راہ راست پر نہ آئیں۔ تو دوسری صورت تشدد اور طاقت کے استعمال کی ہے۔ کہ جس کے ذریعے مخالف قوتوں کا صفایا کردیا جائے' یا انہیں طاقت کے ذریعے دبا کر رکھ جائے۔ اس لئے مصر میں اخوان المسلمون ناصر نے عرب نیشنل ازم کی مخالفت کی۔ اور کوشش کی کہ اسے قتل کرکے اس تحریک کی جڑیں کاٹ دی جائیں۔ انور سادات نے جب اپنی پالیسی بدلی اور اسرائیل سے دوستی کی تو اس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

تبلیغ کے سلسلے میں ان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنے خیالات اور نظریات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے دو قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ پہلے طریقے میں اخباروں' رسالوں' پمفلٹوں' اور کتابوں کی اشاعت کے ذریعے اور دوسرے طریقے میں انفرادی رابطے۔ کانفرنسیں' جلسے' اور اجتماعات کے ذریعے۔ تبلیغ کو موثر بنانے کے لئے یہ طالب علموں' خواتین' ادیبوں' اور مزدوروں کے علیحدہ علیحدہ ونگ بناتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے ان خاص گروہوں میں اپنے خیالات کو پھیلاتے ہیں۔ اسی طرح مسجد کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسجدوں پر قبضہ کیا جائے اور اس طرح سے محلّے کے لوگوں کی حمایت حاصل کی جائے۔

تبلیغ کے ساتھ ساتھ یہ تشدد کا طریقہ ان لوگوں کے لئے یا ان جماعتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ جو ان کی مخالف ہیں' اور جن سے ان کے نظریاتی اختلافات ہیں۔ کیونکہ تبلیغ ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو کہ غیر جانبدار ہوتے ہیں اور تشدد ان کے لئے کہ جو ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ نظریاتی طور پر ان کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ملحد' خدا کے دشمن' اور گمراہ لوگ ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی سزا موت ہے۔ ابتداء میں یہ ایسے افراد کو ڈرا دھمکا کر عملی زندگی سے ہٹا کر انہیں خاموش کردیتے ہیں اور جو پھر بھی باز نہ آئیں انہیں یہ قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کی مثال سلمان رشدی کی ہے کہ جس کی موت کا فتویٰ خمینی نے دیا اور رشدی کی معافی کے باوجود یہ فتویٰ اسی طرح سے باقی ہے۔

بنیاد پرست سازش کی تھیوری پر یقین کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ یہودی' فرنگی' کیمونسٹ' اور سیکولر سوچ رکھنے والے اسلامی معاشروں کے خلاف مسلسل سازش کر رہے ہیں اور انہیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پاکستان میں ان دشمنوں میں ہندو بھی شامل ہیں۔ اسی لئے مسلمان ملکوں میں یہ بحران اور ہر مسئلہ ان کی سازش قرار پاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بحرانوں اور مسائل کا نہ تو تجزیہ ہوتا ہے اور نہ ان کی اصلی وجوہات کو دیکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے کو بہتر بنانے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے اور اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرنے کی بجائے اصل جنگ باہر کے دشمنوں سے لڑنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے اپنے معاشرے کے سماجی و سیاسی اور معاشی مسائل پر کوئی غور نہیں کیاجاتا ہے۔

بنیاد پرستی کی فضا اور اس کا ماحول جذبات پر ہوتا ہے اور جب نوجوان ان جذبات سے متاثر ہوتے ہیں تو وہ اپنے طرز زندگی کو بدل لیتے ہیں' مثلاً" نوجوان لڑکیاں برقعہ اوڑھنے لگتی ہیں یا چادر کا استعمال کرتے ہوئے عورتوں کے لئے پردے کے فوائد بیان کرنے لگتی ہیں' نوجوان داڑھیاں بڑھا لیتے ہیں' اور اپنی عمر سے پہلے سنجیدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ عبادات اور رسومات کی ادائیگی میں سرگرم ہوجاتے ہیں۔ مذہبی سرگرمیاں مذہب کے بارے میں تجسس کو پیدا کرتی ہیں جس کی وجہ سے مذہبی کتابوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی جھگڑے اور مناقشے پیدا ہوجاتے ہیں۔

یہ ماحول جب پیدا ہوتا ہے تو معاشرے میں فنون لطیفہ کی سرگرمیاں کمزور ہوجاتی ہیں۔ اور ثقافتی سرگرمیاں اس گھٹے ماحول میں پروان نہ پاتے ہوئے ختم ہوجاتی ہیں جس کی وجہ

سے پورا معاشرہ ایک گمبھیر خاموشی کا شکار ہو جاتا ہے کہ جس میں جذبہ امنگ اور جوش و ولولہ نہیں رہتا ہے۔

بنیاد پرستی اور اقلیتیں

بنیاد پرستوں کا پہلا حملہ مذہبی اقلیتوں پر ہوتا ہے۔ وہ ان اقلیتوں کو اس لئے اپنا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ یہ سیاسی طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ اور اکثریت میں ان کے خلاف تعصب ہوتا ہے۔ اس لئے بنیاد پرست جماعتیں اقلیتوں کے خلاف اقدامات کے بعد خود کو فاتح سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ان کی مثال بنا کر دوسرے مخالف گروہوں اور جماعتوں میں دہشت و خوف پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے یہ اپنا دائرہ بڑھاتے جاتے ہیں۔ اور اپنے مخالفوں کو ختم کر کے اپنی اجارہ داری اور تسلط کے لئے راہیں ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثلاً" پاکستان میں ان جماعتوں کا شکار احمدی ہیں۔ ان کے خلاف اول یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ ملک دشمن ہیں۔ سازش کے ذریعے حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور یہودیوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ جب اکثریت کو ان کے خلاف بدظن کردیا تو حکومت سے مطالبہ کیا کہ انہیں غیر مسلم قرار دیا جائے۔ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد مطالبہ ہوا کہ انہیں حکومت کی ملازمتوں سے نکالا جائے اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے' پھر ان کے گھروں اور آبادیوں پر حملے شروع ہوئے اس نے انہیں مایوس اور ناکارہ بنا دیا۔ یہی کچھ پروپیگنڈہ یہ جماعتیں سندھ میں ہندوؤں کے بارے میں کرتی ہیں۔ اور سندھ میں ہونے والی سیاسی بے چینی کا ذمہ دار انہیں ٹھہراتی ہیں اور انہیں ہندوستان کے ایجنٹ کہتے ہوئے ملک کا غدار قرار دیتی ہیں۔

ایران میں بھی شاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوا ان میں خصوصیت سے بہائیوں کے ساتھ ظلم و ستم روا رکھا گیا اور انہیں سزاؤں کے بعد بڑی تعداد میں حکومت کی ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ مصر میں بھی یہ جماعتیں قبطیوں کے خلاف ایسے ہی سخت اقدامات کے مطالبے کر رہی ہیں۔

بنیاد پرست نظریات کے مطابق مذہبی اقلیتوں کو برابر کے حقوق نہیں مل سکتے اور انہیں اکثریت کا تابع بن کر رہنا ہوگا اس طرح یہ نہ صرف جمہوری حقوق کے خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ انسانی حقوق کو بھی پامال کرتے ہیں اور مساوات کے نظریئے کی نفی کرتے ہوئے معاشرے کو مراعات و غیر مراعات یافتہ طبقوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔

بنیاد پرستی اور عورتیں

بنیاد پرستوں کا نظریہ عورتوں کے بارے میں روایتی مرد کی افضلیت کا ہے کہ جس میں عورت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ناقص العقل ہے۔ اور صنف نازک ہے اس لئے ان کی حفاظت کی ضرورت۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی راہنمائی کی جائے اور دنیاوی معاملات میں اسے ہدایات دی جائیں۔ ان کی نگاہوں میں عورت کا اصل مقام گھر ہے اور اس کا سب سے بڑا فرض بچے پیدا کرنا اور ان کی تربیت کرنا ہے گھر سے باہر کی دنیا مرد کی ہے اور اس دنیا پر مرد کی اجارہ داری ہے۔ لہٰذا یہ عورتوں پر پابندی لگاتے ہیں وہ گھر کی چار دیواری سے قدم باہر نہ نکالیں۔ اور مرد کی دنیا میں داخل نہ ہوں۔ اس کا گھر سے نکلنا آزادانہ گھومنا' بات چیت کرنا اور اس دنیا کو دیکھنا' مرد کے علاقوں پر جارحانہ حملہ تصور کیا جاتا ہے اس لئے وہ عورت کو حملہ آور سمجھتے ہوئے اسے سخت سزا دینا چاہتا ہے۔

گھر کی چار دیواری میں قید رہ کر عورت نہ تو اس قابل ہوتی ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرسکے۔ اور نہ یہ اعلیٰ ملازمتوں اور عہدوں کے لئے وہ مردوں سے مقابلہ کرسکتی ہے اس طرح سے عورت مردوں کی دنیا سے خارج ہوجاتی ہے اور اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ مردوں کی افضلیت کو چیلنج کرسکے۔

بنیاد پرست اس کے علاوہ عورتوں کی زیب و زینت' اور آرائش کے بھی خلاف ہوتے ہیں اس لئے یہ پابندی عائد کرتے ہیں کہ عورتیں ان سے پرہیز کریں۔ اور خود کو چادر میں لپیٹے ہوئے چھپا کے رکھیں۔ یعنی مرد کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ ان کے حسن اور خوبصورتی سے متاثر ہو۔ عورتوں سے چوری' اور ان کی جانب سے منفی رویہ بنیاد پرستوں کو خشک اور انتہائی سنجیدہ کردیتا ہے۔ اور ان کے لئے عورت سوائے جنسی تسکین کے لئے اور کچھ نہیں رہتی۔

بنیاد پرستی اور روشن خیالی

بنیاد پرست جماعتیں روشن خیالی' لبرل اور سیکولر ذہن رکھنے والے دانشوروں اور فن کاروں کو اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ کیونکہ ان کے خیالات و نظریات اور ان کی سرگرمیاں ان کے راستے میں زبردست رکاوٹ بنتی ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں ڈرا دھمکا کر اور تشدد کے ذریعے خاموش کردیا جائے یا انہیں ملازمتوں سے محروم کرکے

مالی وسائل محدود کرکے اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ وہ کوئی چیز تخلیق کر سکیں۔ ان لوگوں کے خلاف جو مہم چلائی جاتی ہے اس میں ان لوگوں کو ملک دشمن، غدار اور مذہب کے خلاف کہا جاتا ہے۔ اور اگر انہیں یعنی پابندی بنیاد پرستوں کو حکومت کی حمایت حاصل ہو۔ تو اس صورت میں ان کی تحریر و تقریر پر پابندی لگوائی جاتی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ان کا داخلہ بند کردیا جاتا ہے۔ سرکاری ملازمتوں کا حصول ان کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو ناشر ان کی کتابیں چھاپنے سے انکار کردیتے ہیں۔ کتاب فروش ان کی کتابیں فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوتے، اور نہ ہی اخبارات اور رسالوں میں ان کی تحریروں کے لئے کوئی جگہ رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں تک ان کے خیالات و نظریات پہنچنے کے تمام راستے بند ہوجاتے ہیں۔

بنیاد پرست جماعتوں کا مشن

مسلمان ملکوں میں سب سے پہلے جو جماعت نو آبادیاتی نظام، مغربی تہذیب اور جدیدیت کے خلاف مسلمان معاشروں میں اسلامی روح پیدا کرنے کے لئے منظم ہوئی وہ مصر کی اخوان المسلمون ہے۔ کہ جس کا بانی حسن البناء تھا، اس نے ۱۹۲۹ء میں مصر کے شہر اسماعیلیہ کی بنیاد رکھی۔ بعد میں جب تنظیم مستحکم ہوئی تو اس کا صدر مقام قاہرہ آگیا۔ حسن البناء نے جماعت کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھا کہ :

(۱) مذہبی مناظروں اور جھگڑوں سے پرہیز کیا جائے۔

(۲) جماعت میں اہم اور مشہور شخصیات کے اثر و رسوخ کو بڑھنے نہ دیا جائے۔

(۳) ایسی جماعتوں سے دور رہا جائے کہ جو تفرقہ پیدا کرتی ہیں۔

(۴) جماعت کے ہر پروگرام اور منصوبے کو مرحلہ وار پورا کیا جائے، اور اس طرح سے اسے تکمیل تک پہنچایا جائے۔

(۵) جماعت کے مقاصد اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں کہ جب سیاسی طاقت اور اقتدار ہو، اس لئے سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ چاہے اس کے لئے مسلح مزاحمت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

(۶) سیاسی اقتدار کے فوراً بعد مذہبی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اور پھر حکومتی اداروں کے ذریعے تعلیم، قانون اور عدلیہ کو مذہبی قوانین کے ذریعے منظم کیا

(۷) جماعت اس بات کی کوشش کرے گی کہ عرب اور دوسرے غیر عرب مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔

(۸) ان تمام ملکوں کے خلاف جدوجہد کی جائے کہ جو مسلمان ملکوں کے خلاف ہیں۔

اخوان کا اثر نہ صرف مصر میں رہا بلکہ یہ شام' عراق اور دوسرے عرب ملکوں میں بھی سرگرم رہے مصر میں ناصر اور سادات کے زمانے میں یہ بحران کا شکار رہے۔ کیونکہ انہیں حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے سرکردہ راہنما حکومت کی جانب سے پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ اس بحران کی وجہ سے ان کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ جس کے نتیجے میں مصر میں دوسرے کئی گروہ جو اخوان سے زیادہ پرتشدد ہیں وہ ابھرے ان میں التکفیر و الہجرہ' حزب التحریر الاسلامی اور جماعت الجہاد' قابل ذکر ہیں۔

جان اسپوسی ٹو (JOHN ESPOSITO) نے اپنی کتاب "اسلام اور سیاست" جو نیویارک سے ۱۹۸۴ء میں چھپی ہے۔ بنیاد پرستوں کے مختلف گروہوں کے خیالات و نظریات کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

(۱) مسلمانوں کا مقصد اس دنیا میں صرف ایک ہے اور وہ خدا کے مشن کی تکمیل۔

(۲) خدا ہی فرد اور معاشرے پر حکمران ہے۔

(۳) خدا کے مشن کی تکمیل شریعت کے نفاذ کے ذریعے ہو سکتی ہے اور شریعت کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔

(۴) اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے کہ جس میں مذہب' سیاست' ریاست اور معاشرے کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ اس لئے اسلام کے ذریعے خدا کی حکمرانی قائم کرنی چاہئے۔

(۵) شریعت کے قیام کا مطلب ہے' مغربی قوانین اور طرز زندگی کا مکمل خاتمہ۔

(۶) مغربی سیاسی نظاموں' قوانین اور طرز حیات نے مسلمان معاشرے میں سیاسی' سماجی اور معاشی بدعنوانیوں کو پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ دوبارہ جاہلیت کے دور میں پہنچ گئے۔ اس لئے مغربیت اور جدیدیت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

(۷) مغرب کی صلیبی جنگوں کی ذہنیت اب مغربی استعمار اور صیہونیت کی شکل میں مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے۔

(۸) اسلامی حکومت وہی ہوتی ہے کہ جو شریعت کو نافذ کرے۔ اس لئے اگر کوئی حکومت جو مسلمانوں کی ہو مگر شریعت کی پابند نہ ہو۔ تو ایسی حکومت غیر اسلامی اور

غیر قانونی ہے اور اس کے خلاف جہاد فرض ہے۔ مسلمانوں کو اپنی ایسی حکومتوں کو الٹ دینا چاہئے' اور ان مسلمان کے خلاف بھی لڑنا چاہئے جو اس جنگ میں ان کا ساتھ نہ دیں۔

(۹) منکروں اور کافروں کے خلاف جہاد فریضہ ہے اور ان کی جائیدادوں کی ضبطی جائز ہے۔ اہل کتاب بھی اب منکروں میں ہیں اس لئے غیر مسلم اقلیتوں کو دبا کر رکھا جائے۔

(۱۰) وہ علماء جو غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ ہیں۔ ان کی زندگی پاکیزہ نہیں' اس لئے وہ مسجدیں بھی کہ جن پر حکومتوں کا تسلط ہے وہ غیر اسلامی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔

بنیاد پرست جماعتیں صرف ان مسلمان ملکوں تک محدود نہیں کہ جہاں جمہوری اور سیکولر ادارے اپنی بقاء کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ سعودی عرب میں بھی موجود ہیں کہ جو قدیم بنیاد پرستی کے نظریات پر عمل کر رہا ہے۔ یہاں کے حکمران طبقوں میں اس وقت تبدیلی آئی جب تیل کی دولت کے بعد وہ بدعنوانیوں اور عیاشیوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے اس رویے کے خلاف ایسے خفیہ گروہ موجود ہیں کہ جو موجودہ حکومت کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ انہیں میں عبداللہ القحطانی کا گروہ تھا کہ جس نے ۱۹۷۹ء میں مکہ پر قبضہ کر لیا تھا' اور یہ اعلان کیا تھا کہ سعودی عرب میں بدعنوانیوں کے خاتمہ کے لئے سعودی خاندان کا تختہ الٹنا ضروری ہے۔

بنیاد پرستی کی لہر اس وقت تمام مسلمان ملکوں میں موجود ہے' ترکی میں بھی کہ جو ایک سیکولر ملک ہے' وہاں بھی نوجوان لڑکیاں چادر اوڑھنے اور نوجوان لڑکے داڑھیاں بڑھا کر بنیاد پرستی کے اثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔ مغرب اور امریکہ کہ جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے ان میں بھی مغرب سے نفرت کے رد عمل میں بنیاد پرستی کے جراثیم جڑ پکڑ رہے ہیں۔ اور وہ اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے مذہبی جماعتوں میں شامل ہو رہے ہیں۔

بنیاد پرستی اور سائنسی ایجادات

اس وقت سائنس کی ایجادات کا مرکز امریکہ اور مغربی دنیا ہے اور ان کے ہاں جو نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ وہ معاشرے کی ذہنی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کا عام زندگی اور معیار میں ایک ترقی پسند کردار ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی سائنس اور فنی

ایجادات پس ماندہ معاشروں میں آتی ہیں۔ تو ذہنی پس ماندگی کے سبب ان کا کردار بھی رجعت پرست ہوجاتا ہے۔ بلکہ یہ پس ماندگی اور رجعت پرستی کی جڑیں مضبوط کرتی ہیں۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر، ٹیپ، ویڈیو، فلم، ریڈیو اور ٹی وی ایجادات ہیں۔ کہ جنہوں نے مغرب میں معاشرے کی ذہنی ترقی میں حصہ لیا اور ان کے ذریعے سے انہوں نے دنیا کے بارے میں معلومات کو پھیلا کر ایک عام آدمی تک پہنچا دیا۔ مگر جب یہی ایجادات پسماندہ ملکوں میں آئیں تو ان کا استعمال آمروں، مطلق العنان و نظریاتی حکومتوں نے اپنے مقاصد کے لئے کیا اور لوگوں کو دنیا کے معاملات سے بے خبر رکھنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ جب یہ ایجادات بنیاد پرست جماعتوں نے استعمال کرنا شروع کیں تو انہوں نے ان کے ذریعے اپنے خیالات و نظریات کی تشہیر کی۔ لاؤڈ اسپیکر کا مسجدوں میں استعمال جس طرح پاکستان میں ہو رہا ہے اس کا اندازہ ہر شہری کو ہے۔ یہی حال ٹیپ اور وڈیو کا ہوا ہے کہ تمام بنیاد پرست جماعتیں اپنے راہنماؤں کی تقریریں ٹیپ کرکے یا ان کی ویڈیو فلمیں بنا کر ملک کو کونے کونے میں پہنچا دیتی ہیں۔ ایران میں خمینی کی مقبولیت میں ویڈیو فلموں اور ٹیپ ریکارڈز کا بڑا دخل ہے۔ اور یہی صورت حال آج پاکستان میں ہے کہ ہر مذہبی جماعت اپنے جلسوں اور جلوسوں کی ویڈیو فلمیں بنا کر اس کے ذریعے اپنے خیالات کی تشہیر کرتی ہیں۔ اس طرح سے یہ ایجادات ہمارے ملکوں میں ترقی کی بجائے بنیاد پرستی کے خیالات کو مضبوط کر رہی ہیں۔

برصغیر میں بنیاد پرستی کے رجحانات

اس پس منظر کے بعد میں ضروری سمجھتا ہوں کہ برصغیر ہندوستان میں بنیاد پرستی کے رجحانات پر مختصر روشنی ڈالوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہی مسلمان معاشرے میں بنیاد پرستی اور احیاء کی تحریکیں بھی آئیں۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں سماجی تعلقات بڑھے اور اس کے نتیجے میں انہوں نے ہندوؤں کی بہت سی ثقافتی رسومات کو اختیار کرلیا، تو اس مرحلے پر علماء نے اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ اور ہندو رسومات کو اختیار کرنے پر تحریکیں شروع کیں۔ اور اس بات پر زور دیا کہ اسلام کا احیا ہونا چاہئے۔ ان علماء میں خاص طور سے شیخ یحیٰی منیری، مہدی جونپوری، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، اور سید احمد شہید قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ یہ تحریکیں اور ان علماء کے خیالات محدود رہے اور یہ کبھی بھی عوامی مقبولیت حاصل نہ کرسکے۔ مگر انہوں نے اپنے وقت میں خاص خاص گروہوں کے مفادات کے لئے کام کیا۔ اور آخر میں اپنے خیالات کی وجہ سے یہ مسلمان معاشرے سے

کٹ کر ایک علیحدہ فرقہ بنتے چلے گئے۔

ہندوستان میں علماء ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اس وقت منظم ہوئے کہ جب مغل حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی اور انگریزی اقتدار نے مسلمان معاشرے کو سیاسی' سماجی اور معاشی بحرانوں سے دوچار کر رکھا تھا۔ جب تک مسلمان حکمران سیاسی طور پر طاقت میں رہے ان کے معاشرے اور مذہب کو بیرونی طور پر کسی چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہندو مذہب چونکہ کوئی تبلیغی مذہب نہیں اور اس میں تبدیلی مذہب کی کوئی گنجائش نہیں' اس لئے وہ اسلام کے مقابلے میں نہیں آیا' کسی چیلنج کے نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کا مسلمان معاشرہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ گیا۔ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور بکسر (۱۷۶۴ء) کی جنگوں نے جب مسلمانوں کی سیاسی قوت کو توڑ کر رکھ دیا تو اس کے بعد سے وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکے اور مسلسل پسپا ہوتے چلے گئے۔

حکمرانوں کی اس ناکامی کے بعد ہندوستان میں علماء نے مذہبی بنیادوں پر تحریکیں چلائیں تاکہ وہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں مدد دے سکیں' ان میں خصوصیت سے سید احمد شہید (وفات ۱۸۳۲ء) کی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو مشرکانہ رسومات سے پاک کرکے ایک ایسی اسلامی ریاست کو قائم کیا جائے کہ جو قرون اولی کے ماڈل پر ہو۔ بنگال میں فرائضی تحریک اور جنوبی ہندوستان میں موپلہ تحریک کو مذہبی نعروں کے ساتھ اٹھایا گیا تاکہ مسلمانوں کے سیاسی و معاشی مسائل کو حل کیا جائے۔ مگر یہ تمام تحریکیں ناکام ہوئیں۔ اس کے بعد سب سے بڑا المیہ ۱۸۵۷ء کا تھا کہ جس میں مسلح جدوجہد کے ذریعے سیاسی تبدیلی کی تمام امیدیں ختم ہوگئیں اور اس ناکامی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی نے مسلمان معاشرے پر گہری اداسی طاری کردی۔ مایوسی' نا امیدی' بے چارگی' خستگی و کہنگی کا احساس ٹوٹ پھوٹ اور شکستگی سے دوچار ہونے کے بعد معاشرے میں دو قسم کے رجحانات پیدا ہوئے۔

(۱) علماء نے مسلمان معاشرے کے زوال اور اس کی شکست کی ذمہ داری لوگوں پر ڈالدی جنہوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات و اصولوں سے انحراف کیا۔ اور اس کے نتیجے میں زوال سے دوچار ہوئے۔ مرض کی اس تشخیص کے بعد بنیاد پرست جماعتیں منظم ہونا شروع ہوئیں تاکہ معاشرے میں اسلامی تعلیمات کو مقبول کیا جائے اور مسلمانوں میں اسلامی روح کو پیدا کیا جائے اور ان میں دیو بندی' فرنگی محل اور جماعت اہل حدیث وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) دانشوروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ایسا تھا کہ جنہوں نے بنیاد پرستی و احیاء کی بجائے اس بات پر زور دیا کہ اسلام کو جدید اور ترقی پسند قوتوں کے ساتھ مل کر آگے بڑھنا چاہئے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اسلام میں یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ خود کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیل کرے۔ چونکہ ان کے سامنے مغربی دنیا کی ترقی تھی، اس لئے وہ مغربی روایات اور اقدار کو اسلامی رنگ میں ڈھال کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ان خیالات کو مقبول بنانے والے ہندوستان میں سرسید احمد خاں تھے۔

بنیاد پرستی اور ترقی پسندی کی تحریکوں میں جو فرق تھا وہ یہ تھا کہ بنیاد پرست مغربی تہذیب و روایات سے نفرت کرتے تھے اور ان کا رویہ علیحدگی پسندی کا تھا جب کہ ترقی پسند تحریکیں مغربی روایات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ان کے ذریعے اصلاح چاہتی تھیں۔ دوسرا بنیادی فرق یہ تھا کہ بنیاد پرست تحریکیں مسائل کا حل ماضی میں تلاش کرتی تھیں' جب کہ ترقی پسند ماضی کی بجائے حال اور مستقبل کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔

برصغیر ہندوستان میں ترقی پسندی کی تحریکیں جو سرسید سے لے کر قیام پاکستان تک کئی شکلوں میں وجود میں آئیں' سب ناکام ہوگئیں اور بنیاد پرستی و احیاء کی تحریکیں کسی نہ کسی صورت میں برابر فعال ہیں اور ہمارے معاشرے کی زندگی پر مسلسل اثر انداز ہورہی ہیں۔ اس کی بھی کئی وجوہات ہیں: اول ہمارا معاشرہ جاگیردارانہ ثقافت کا حامل ہے اس لئے اس میں جہالت اور توہم پرستی کا غلبہ ہے' اور اس ماحول میں ترقی پسند نظریات کی کوئی پذیرائی نہیں ہوسکتی ہے۔ ترقی پسند تحریکیں جب اٹھتی ہیں۔ تو صنعتی ثقافت کے فقدان کی وجہ سے یہ اپنی کوئی بنیادیں بنانے نہیں پاتیں۔ اس لئے وقتی طور پر ابھرتی ہیں اور ایک محدود گروہ پر اثر انداز ہوکر ختم ہوجاتی ہیں۔ جیسے سرسید احمد کی تحریک صرف مسلمان انگریزی تعلیم یافتہ اور تنخواہ دار طبقوں تک محدود رہی۔ کیونکہ اس وقت یہ ان کے مفادات میں سے تھا کہ راسخ العقیدگی اور مذہبی علیحدگی سے چھٹکارا پایا جائے اور انگریز کی ملازمت اختیار کی جائے۔ مذہب کا ترقی پسند نظریہ ان کے لئے یہ راہیں ہموار کرسکتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وقتی طور پر غلام احمد پرویز کو بھی ایک محدود تعلیم یافتہ طبقے میں مقبولیت ہوئی۔ مگر اس کے مقابلے میں بنیاد پرست جماعتیں اس لئے کامیاب رہیں۔ اور آج بھی ہیں کہ انہیں پس ماندہ عوام اور جاگیردار طبقے سے مدد ملتی رہتی ہے۔

ہندوؤں میں بنیاد پرستی

برصغیر میں بنیاد پرستی اور احیاء کی تحریکوں کو سمجھنے کے لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ

ہندو مذہب میں اٹھنے والی تحریکوں کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ دراصل انگریزوں کی آمد اور ان کے اقتدار کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ ان عوامل پر غور کیا جائے کہ جن کی وجہ سے ان کا معاشرہ پس ماندہ اور جاہل رہ گیا تھا اس پس ماندگی کو کیسے دور کیا جائے اصلاح کے ذریعے یا احیا کے و بنیاد پرستی کے ذریعے؟ ہندو معاشرے کو یہ وقت پیش آئی کی ان میں اس وقت تک "سنہری ماضی" کا کوئی وجود نہیں تھا اس کی غیر موجودگی میں ان کے ہاں اصلاح کی تحریکیں زیادہ سرگرم رہیں۔

ہندوؤں میں سنہری زمانے کا تصور اٹھارویں صدی میں رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کے بعد پیدا ہوا۔ جبکہ انگریز سکالرز نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں کو شائع کرنا شروع کیا ان کی تحقیق کے ذریعے سنسکرت زبان کی اہمیت اجاگر ہوئی اور انہوں نے ہندو فلسفے کے ۶ مکاتب فکر کو مرتب کیا' منو کے شاستر جو قدیم مسودوں میں سے تھے انہیں تلاش کیا اس کے علاوہ ہندو متھ اور علامات کے بارے میں نئے نئے انکشافات کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی قدیم تاریخ کی تشکیل تو ہوئی اور ساتھ ہی "ماضی کے سنہری دور" کا تصور پیدا ہوا کہ جس کی طرف واپسی ہندو بنیاد پرستوں کا آئیڈیل بن گئی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوؤں میں بنیاد پرستی اور احیا کی تحریکیں صرف برہمنوں اور اونچی ذات والوں میں محدود رہیں کیونکہ احیا سے نچلی ذاتوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صدیوں سے برہمنوں کے نظام میں ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے ذلت و خواری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے برعکس انگریزی دور میں جو سیکولر نظام قائم ہوا' اس میں انہیں پہلی مرتبہ تھوڑی بہت آزادی ملی' اور اونچی ذات والوں نے اپنی کچھ مراعات کھوئیں۔ اس لئے یہ ان کے مفاد میں تھا کہ وہ ہندو بنیاد پرستوں کی تحریکوں کو فعال بنائیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قدیم ہندو رسومات کا احیا کیا اور خاص طور پر دیوی و دیوتاؤں کے جلوس نکالنے شروع کئے۔ گنگادھر تلک نے سب سے پہلے گنیش کے تہوار کو دھوم دھام سے منانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد یہ پورے ہندوستان میں مقبول ہو گیا۔ پھر جیسے جیسے نئی جماعتیں بنتی رہیں اسی طرح سے نئے نئے تہواروں اور رسومات کو منانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

آج ہندوستان میں یہ بنیاد پرست جماعتیں ووٹ حاصل کرنے اور انتخابات جیتنے کے لئے مذہبی علامتوں اور مذہبی دیومالائی عقیدوں کا سہارا لے رہی ہیں۔ اس کی ایک کڑی رام جنم بھومی' بابری مسجد ہے۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہندوستان کا

ابھرتا ہوا صنعتی اور بورژوا طبقہ ان فرقہ وارانہ فسادات کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کرے گا کیونکہ ان فسادات کے نتیجے میں جو ہنگامے ہوتے ہیں ہڑتالیں ہوتی ہیں اور کرفیو لگتے ہیں اس سے صنعتی پیداوار بری طرح متاثر ہوتی ہے اس لئے ہندوستان کے بڑھتے ہوئے معاشی نظام کے لئے ضروری ہے کہ یہ فسادات ختم ہوں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں علمی و عملی تحریکیں فرقہ واریت اور بنیاد پرستی کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اور سیکولر روایات کو مستحکم کرنا چاہتی ہیں تاکہ ہندوستان کے تمام فرقے آزادی سے اس کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔

پاکستان میں بنیاد پرستی

قیام پاکستان کے بعد یہاں نہ تو بنیاد پرست جماعتیں مقبول تھیں اور نہ ہی یہ موثر سیاسی طاقت تھیں۔ مگر جیسے جیسے پاکستان میں جمہوری ادارے کمزور ہوئے اور جمہوریت کی بجائے آمرانہ شخصی نظام حکومت مستحکم ہوا۔ تو ویسے ویسے سیاست میں عوام کی شرکت ختم ہوگئی۔ چند طبقے حکومت اور ریاست کے تمام ذرائع پر قابض ہوکر ان سے فائدہ اٹھانے لگے جب کہ عوام کے لئے جہالت' غربت اور بیماریوں کے نہ حل ہونے والے مسائل چھوڑ دیئے۔

۱۹۷۱ء کے انتخابات میں عوام نے ذوالفقار علی بھٹو کو روٹی ' کپڑا اور مکان کے نام پر ووٹ دیا مگر بھٹو کا سوشل ازم عوام کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے پاکستان میں سب سے پہلی حکومت کی جانب سے بھٹو نے بنیاد پرستی کی حوصلہ افزائی کی اور اس کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات ' احمدیوں کو جمہوری طریقے سے غیر مسلم قرار دینا۔ اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے لئے جمعہ کی چھٹی' تعلیمی اداروں میں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو لازمی قرار دینا' امام کعبہ کو بلوا کر اس کے پیچھے لوگوں کو نماز پڑھوانا۔ اور قرآت کانفرنسوں کا انعقاد یہ سب اس دور کی یادگاریں ہیں۔

معاشرے کو اسلامی بنانے کا جو عمل بھٹو نے شروع کیا تھا اس کو ضیاء حکومت نے آگے بڑھایا۔ حدود قصاص و دیت' زرعی اصلاحات کا خاتمہ ' اور شرعی عدالتوں کا قیام اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ موجودہ حکومت نے (۱۹۹۱ء) میں شریعت ایکٹ کو نافذ کرکے معاشرے کو اسلامی بنانے کا عمل جاری رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ریاستی اداروں کی سرپرستی میں بنیاد پرستی

کی تبلیغ سے اس ملک کی ترقی پسند اور روشن خیال جماعتیں اور گروہ انتہائی کمزور ہوگئے ہیں۔ اور ان کے لئے یہ مشکل ہوگیا ہے کہ وہ ان چیلنجوں کا جواب دے سکیں۔ علماء و مشائخ اور حکمران طبقوں کی موقع پرستی نے ترقی و سیکولر سوچ کی راہوں کو بند کردیا ہے اور ملک پوری طرح سے بنیاد پرستوں کی گرفت میں ہے۔

اثرات

پاکستان معاشرے میں بنیاد پرستی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم عنصر تشدد کا ہے۔ بنیاد پرست جماعتیں طاقت و قوت کے ذریعے اپنے نظریات کو لوگوں پر مسلط کرنا چاہتی ہیں۔ اس لئے ذرا سے اختلاف پر یہ ایک دوسرے کے راہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کرنے میں مصروف ہیں۔ اس تشدد کا شکار مذہبی اقلیتیں ہیں کہ جن کے وقتاً" فوقتاً" ہنگامے رہتے ہیں۔

بنیاد پرستی کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت مذہبی جھگڑوں' مناظروں اور مناقشوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اور معاشرے کے اہم سماجی مسائل جن میں غربت' بیماری' جہالت اور کم غذائیت شامل ہیں۔ ان پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ ملک کے وہ ذرائع کہ جو ان مسائل کو دور کرنے پر صرف ہو' وہ پولیس' فوج اور خفیہ اداروں کی نظر ہوجاتے ہیں۔

ہنگاموں اور فسادات کی وجہ سے زرعی و صنعتی پیداوار میں کمی ہورہی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ پس ماندہ ہوتا جارہا ہے۔ سماجی طور پر بنیاد پرستی معاشرے سے ہم آہنگی اور یگانگت کے تمام جذبات کو ختم کردیا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا تعلیمی نظام جو بنیاد پرستی کے زیر اثر نافذ کیا گیا ہے وہ ایسے نوجوان پیدا کر رہا ہے جو تنگ نظر اور متعصب ہیں جو تشدد کے ذریعہ مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ' جمہوریت ' روشن خیالی اور سیکولر ازم کے بجائے ' فاشزم' آمریت اور انتہاء پسندی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

○○

جاگیردارانہ جمہوریت

کسی بھی ایسے معاشرے میں کہ جہاں فرسودہ روایات اور ادارے مستحکم ہوں وہاں اگر ترقی یافتہ سیاسی و معاشی نظاموں کو رائج کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسے معاشرے میں یہ نظام بگڑ کر نہ صرف خود پس ماندہ ہو جاتے ہیں بلکہ معاشرے کو اور بھی زیادہ پس ماندہ بنا دیتے ہیں۔ یہی صورت حال پاکستان میں جمہوریت کی ہے' کیونکہ یہاں پر جمہوری نظام کو محض ایک سیاسی نظام کے طور پر رائج کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ معاشرے کے سماجی و ثقافتی اور معاشی ڈھانچوں کو بدلنے اور ذہنی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا جارہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے جاگیردارانہ نظام میں کہ جہاں جاگیردارانہ ثقافت کی جڑیں انتہائی گہری ہیں وہاں جمہوری آزادی' حقوق' مساوات اور فرد کی عزت و احترام کی بجائے قوت و طاقت' جبر اور تشدد پر اتھارٹی کو مضبوط اور عوام کو مسلسل کمزور کر رہی ہے۔

یہاں میں خصوصیت سے ان اہم جاگیردارانہ روایات کی نشان دہی کروں گا کہ جو جمہوری نظام میں زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہو گئی ہیں۔ اور جو عوام کو حکمران طبقوں کا دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً" جاگیردارانہ کلچر کی ایک اہم خصوصیت اس کا نظام سرپرستی ہوتا ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیردار یا اتھارٹی کے پاس تمام ذرائع ہوتے ہیں اور اس لئے ان کی رعیت سرپرستی کے لئے ان کی محتاج ہوتی ہے سرپرستی کے عوض زمیندار اور جاگیردار اپنی رعیت سے وفاداری اور اطاعت چاہتا ہے جس سے روگردانی کو نمک حرامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس لئے جمہوری نظام میں جب انتخابات کے موقع پر جاگیردار امیدوار ہوتا ہے تو اس کی رعیت کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے مقابلے میں الیکشن لڑے' مقابلہ کا یہ حق بھی کسی زمیندار کو ہی ہوتا ہے اور یہی لوگ اپنے اثر و رسوخ اور خاندانی عظمت کی بنیاد پر لوگوں سے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں جاگیرداروں کی حیثیت راہنماؤں کی ہے اور ان کی یہ جماعتیں بھی راہنماؤں اور

کارکنوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں اور یوں یہاں بھی جاگیر دار اور ہاری اور کسان کا رشتہ قائم رہتا ہے۔

انتخابات میں کامیابی کے بعد ارکان اسمبلی اور وزراء کی سرپرستی کا دائرہ بڑھ جاتا ہے اور ہر شخص اپنے معمول سے کاموں کے لئے ان کا دست نگر ہوجاتا ہے۔ مثلاً" اگر کسی کو اسکول و کالج میں داخلہ لینا ہو' ہسپتال میں جگہ حاصل کرنا ہو' یا دوائیں لینا ہو' ملازمت حاصل کرنا ہو' یا تبادلے اور ترقی کا خواہش مند ہو تو ان سب باتوں کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سرپرست ہوتا ہے یا نہیں۔ اس وجہ سے قانونی و اصولی طریقوں کو اپنانے کی بجائے لوگ ارکان اسمبلی اور وزراء کے دفتروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

چونکہ ارکان اسمبلی اور وزراء کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جتنی وہ سرپرستی کریں گے اسی قدر لوگوں میں ان کا اثر و رسوخ بڑھے گا۔ اسی لئے ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کے اختیارات مسلسل بڑھتے رہیں اور ان کی طاقت میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ارکان اسمبلی کی مراعات میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ مثلاً" یہ کہ اب وہ ہر مہینے ۳ ٹیلی فون اپنی سفارش پر لگوا سکتے ہیں انہیں اپنے علاقوں میں ترقیاتی کاموں کے لئے علیحدہ سے فنڈز ملتے ہیں۔ اس طرح سے ان ملازمتوں میں ان کا کوٹہ مقرر ہے۔

سرپرستی کے اس نظام کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں حکومت اور اس کے اداروں کا احترام ختم ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ ارکان اسمبلی کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ انہیں صاف نظر آتا ہے کہ ان کے ذاتی کاموں سے لے کر علاقے کی ترقی کا انحصار ان کی ذات پر ہے۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اپنا حق نہیں مانگتے ہیں بلکہ اس کی جگہ درخواست کرتے ہیں۔ مثلاً" تعلیم' صحت اور ملازمت ہر شہری کا حق ہے' مگر سرپرستی کے نظام میں شہریوں کے حقوق ختم ہوجاتے ہیں اور اس کی بجائے وہ عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ ان پر مہربانی کی جائے جس کے لئے وہ اور ان کا خاندان ہمیشہ احسان مند رہے گا اب اگر کوئی اس سرپرستی کے نظام سے باہر ہے تو اس کے لئے معاشرے میں زندہ رہنا مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت و لیاقت' ذہانت اور ایمانداری کی بنیاد پر کچھ بھی حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ معاشرے میں ان اوصاف اور خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے' بلکہ ان کی جگہ خوشامد' سفارش اور رشوت لے لیتی ہے۔

سرپرستی' اثر و رسوخ اور اختیارات کے استعمال سے اہل اقتدار اور عوام میں فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے وی ۔ آئی ۔ پی اور وی ۔ وی ۔ آئی ۔ پی کے ذریعے اہم

لوگوں کو عوام سے جدا کیا جاتا ہے اور ہماری روز مرہ کی زندگی میں اس فرق کو محسوس کرایا جاتا ہے اور یہ وہ بنیادیں ہیں جو مساوات ' اخوت اور آزادی کی قدروں کو جو جمہوریت کی اہم بنیادیں ہیں ختم کرتی ہیں اور عوام کو ذہنی طور پر کمتر اور ادنیٰ بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔

چنانچہ جاگیر دارانہ جمہوریت میں قانون کی بالادستی کا تصور ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس کی جگہ قانون کی مخالفت یا قانون کی خلاف ورزی ہمارے حکمران طبقوں کا روزمرہ کا معمول بنا جاتا ہے۔ ٹریفک لائنس کی خلاف ورزی سے لے کر قتل و اغواء کے جرائم تک سے ان کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اس جاگیر دارانہ جمہوریت کے دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے خلاف جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں کا اغواء' ان کی عزت لوٹنا انہیں جسمانی تشدد کا شکار بنانا' جاگیر دارانہ کلچر میں عام ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اس زمانے میں مل رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب جاگیر دار کے ہاتھ میں سیاسی طاقت آتی ہے' تو حکومتی ادارے اس کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے وہ نہ صرف جرائم کی سرپرستی کرتا ہے بلکہ ان حکومتی اداروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

یہی جاگیردار جب اسمبلیوں میں ہوتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر اس عمل کی مخالفت کی جائے کہ جس سے معاشرے میں ترقی اور تبدیلی ممکن ہو سکتی ہو۔ یہ جمہوری اداروں اور روایات کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ایسے قوانین بناتے ہیں کہ جن کے ذریعے ان کا تسلط اور مضبوط ہو اور معاشرہ مزید پس ماندہ ہوتا چلا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہماری اسمبلیوں میں آج تک وہ قوانین پاس نہیں ہوئے کہ جن کے ذریعے عوام کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور ملک کو جدیدیت کی طرف لے جایا جائے۔ اس کی بجائے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر' شریعت و حدود کے قوانین کو نافذ کرکے معاشرے کو مزید ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا ہے۔

اس کے علاوہ جاگیر دارانہ کلچر میں قوت برداشت کا فقدان ہوتا ہے۔ جو کہ ایک اہم جمہوری روایت ہے اس لئے جو بھی طاقت میں ہوتا ہے وہ حکومت کو اپنے ذاتی اقتدار کے لئے استعمال کرکے اپنے مخالفوں کو قید بند کی اذیتیں دے کر خاموش کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ انتقام کا جذبہ قوت برداشت پر قابو پالیتا ہے۔ اور اس کے ذریعے ہر مخالف کو دشمن گردانتے ہوئے اسے جبر و تشدد کے ذریعے ختم کرنا چاہتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت اور جمہوری ادارے جاگیرداروں کے ہاتھوں میں

ایسے موثر ہتھیار بن جاتے ہیں کہ جن کو استعمال کرکے وہ اپنی طاقت و اثر و رسوخ کو اور بڑھاتے ہیں اور فرسودہ روایات کو قانونی شکل دے کر انہیں نافذ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے ماحول میں ترقی پسند' روشن خیال اور جدید خیالات رکھنے والوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔

جاگیر دارانہ جمہوریت میں عوام اور منتخب امیدواروں میں جو فرق اور دوری ہوجاتی ہے اس کی وجہ سے اگر کبھی آمریت یا مارشل لاء کے خلاف تحریک چلائی جاتی ہے تو اس میں کامیابی کے امکانات اس لئے کم ہوجاتے ہیں کہ حکومت کے بدلنے کے ساتھ ہی یہ جاگیردار نمائندے اپنی وفاداریاں بدل لیتے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت کم ہیں جو اپنی مراعات و آسائشوں کو خطرے میں ڈالنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ جاگیر دار خاندانوں کی وفاداریاں بدلنے کی وجہ سے ہمارے سیاسی نظام میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہوا۔ کسی سیاسی پارٹی کو اپنی علیحدہ شناخت نہیں بن سکی اور سیاسی راہنماؤں کا کمٹ منٹ لوگوں کی بجائے اقتدار سے رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رشوت' جبر' طاقت' لالچ کی بنیادوں پر ایک اقلیتی پارٹی اکثریتی پارٹی بن جاتی ہے اور حکومت کرتی ہے۔

جاگیردارانہ جمہوریت میں کسی احتساب کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ احتساب وہاں ہوتا ہے جہاں ووٹ دینے والوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ جہاں ووٹروں اور امیدواروں میں برابر کے تعلقات ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں حکمران اور رعیت کے ساتھ رشتے ہوں' وہاں سربراہوں سے سوال پوچھنے کی جرات کس کو ہوسکتی ہے۔

اس لئے ہماری جاگیردارانہ جمہوریت میں خاندانوں کا اثر و رسوخ ہے اور چند خاندان جمہوریت پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ انہیں کے ذاتی مفادات کے تحت ملک کی پالیسیاں بنتی و بگڑتی ہیں۔ اس لئے جب بھی زرعی انکم ٹیکس کا سوال آتا ہے تو اہل اقتدار اور حزب اختلاف سب اس کی مخالفت میں ایک ہوجاتے ہیں۔

اس لئے اگر ہم یہ خیال کریں کہ جمہوریت ہماری تمام بیماریوں' خرابیوں اور مسائل کا حل ہے تو یہ ہماری غلط فہمی ہے کیونکہ جمہوریت محض ایک سیاسی نظام نہیں کہ جس کے ادارے معاشرے کے تمام مسائل کو حل کردیں۔ اس کا تعلق معاشرے کے ذہن سے بھی ہے اور یہ ذہن اسی وقت بدلے گا جب ملک میں معاشی و سماجی حالات بدلیں گے کیونکہ اب تک۔ جن ملکوں میں جمہوریت ایک کامیاب سیاسی نظام کے طور پر قائم ہوئی ہے وہاں پر سب سے پہلے جاگیرداری کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ملک میں تعلیم پھیلی اور صنعتی

ترقی ہوئی اور اس کے نتیجے میں جمہوری اقدار کو استحکام ملا۔

لہٰذا جمہوریت کی بقاء اور اس کی زندگی اس میں ہے کہ لوگوں میں شعور اور تعلیم ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب جاگیردارانہ ثقافت ختم ہو۔ اگر معاشی و سماجی تبدیلیوں کے بغیر جمہوریت کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ نظام جاگیرداروں اور اس کی ثقافت کو مضبوط بنا کر ملک کو اور پس ماندہ کرے گی۔

☆ ☆ ☆